وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی مکمل اور مستند و مقبول عام سوانح حیات

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد اوّل

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

نام کتاب ——— سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

مصنف ——— علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی

تاریخ طباعت ——— صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

تعداد ——— ایک ہزار

پریس ——— آر۔ زیڈ۔ پیکجز، لاہور

فہرست مضامین سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم (حصہ اول)

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا شہنشاہِ کونین کے دربار میں،
اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے،
ز چشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

"شبلی"
شوال ۱۳۳۰ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دیباچہ طبع چہارم سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اوّل

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت بخشی وہ مصنف اور جامع دونوں کے لئے بڑی نعمت ہے، جس پر اللہ تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات کے بعد جب سیرت کا مسودہ مصنف کی وصیت کے مطابق اس ہیچمدان کے ہاتھ آیا تو اس عقیدت کی بنا پر جو ایک شاگرد کو اپنے استاد سے ہونی چاہیئے، استاد کے مسودہ پر انگلی رکھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا، اگر کبھی بضرورت ایسی گستاخی کرنی پڑتی تھی تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا، مسودہ کا مبیضہ مصنف کے سامنے ہو چکا تھا، اس لئے اس مبیضہ کا مقابلہ مسودہ سے اور نہ مسودہ کا مقابلہ اصل ماخذوں سے میں نے کیا، بلکہ مصنف کی امانت جوں کی توں ناظرین کے سپرد کر دی، بجز اس کے کہ بعض مقامات پر مصنف کے اشاروں کے مطابق بعض چیزوں کا اضافہ ہلالین میں کر دیا جس کی تصریح دیباچہ میں موجود ہے۔

اس کے بعد اس نسخہ کی نقل در نقل چھپتی رہی، اور مقابلہ اور تصحیح ماخذ کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن اس اثنا میں کبھی کبھی مراجعت کے وقت بعض مقاموں پر تصحیح اور اضافہ کی نئی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور اس کے مطابق ایک نسخہ پر یہ تصحیحات اور اضافے وقتاً فوقتاً کرتا رہا۔

اس دفعہ جب نئے نسخہ کے چھاپنے کی ضرورت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کتاب کے مسودہ کو اصل ماخذوں سے ملا کر دیکھا جائے اور مقابلہ اور مطابقت کی جائے، یہ بڑا مشکل کام تھا، بیسیوں کتابوں کو پھر سے دیکھنا، اور ہزاروں صفحوں کو الٹنا، متعدد مختلف روایتوں کو پرکھنا اور ضرورت کے مقام پر حاشیے لکھنا، خود ایک مستقل تصنیف کے برابر محنت تھی، مجھے یہ لکھنے میں بڑی خوشی ہے کہ لائق عزیز مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی اس کام میں میرے دست و بازو ثابت ہوئے، واقعات کی تلاش اور جانچ، روایتوں کی چھان بین، اصل عبارتوں سے مسودہ کی تطبیق اور حدیث اور سیرت کی کتابوں کی طرف از سر نو مراجعت میں اُن سے بڑی مدد ملی۔

کچھ مقام ایسے بھی تھے جہاں اس ہیچمدان جامع کو مصنف کے نظریہ سے اختلاف تھا، اس دفعہ وہاں حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کر دیا، کہیں کسی واقعہ کے اجمال کی تفصیل یا دفعِ شبہ کی ضرورت تھی، وہاں اس ضرورت کو پورا کیا گیا، بعض مسامحات پر تنبیہ مناسب تھی وہ کی گئی، کہیں فروتر ماخذ کا حوالہ تھا اور اثنائے مطالعہ میں اس سے بالاتر ماخذ ملا تو اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ دو چار ... میں عدد کی غلطی جو اردو ہندسوں میں اکثر ہو جاتی ہے اصل مبیضہ میں بھی موجود تھی، مراجعت کے وقت اُن کی غلطی معلوم ہوئی، اور اب ان کی تصحیح کر دی گئی، مثلاً حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کی قیمت سوا روپے چھپ گئی تھی حالانکہ وہ سوا سو ہے، اسی طرح غزوہ احزاب میں کفار کے لشکر کی تعداد ۲۴ ہزار درج ہوئی تھی، حالانکہ وہ بعض روایت میں ۱۴ ہزار لیکن صحیح روایات میں دس ہزار ہے۔

مولانا کی زندگی میں اس کی تصنیف کے وقت ان کو بعض کتابیں قلمی ملی تھیں، جیسے روض الانف جس سے پورا استفادہ دِقت طلب تھا، اب وہ چھپ گئی ہے، بعض کتابوں کی اُن کو تلاش ہی رہی مگر ان کو مل نہ سکیں، جیسے کتاب البدایہ والنہایہ ابن کثیر، مصنف سے اکثر حسرت کے ساتھ سُنا کہ افسوس تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی، وہ مل جاتی تو ساری مشکلیں حل ہو جاتیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب وہ چھپ کر عام ہو گئی، مستدرک حاکم اس وقت تک ناپید تھی، اب طبع ہو کر گھر گھر پھیل گئی، غرض ان کتابوں کے ہاتھ آجانے سے بہت سے نئے معلومات بڑھ گئے، چنانچہ اس نسخہ کی تصحیح و اضافہ میں ان سے کام لیا گیا۔

اس نسخہ کی تیاری میں جن خاص باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) پوری کتاب کے واقعات کو از سر نو حدیث و سیر کی کتابوں سے ملا کر دیکھا گیا ہے اور اس میں جہاں نقص نظر آیا دور کیا گیا ہے۔

(۲) تصحیح بیان، دفعِ شبہ، رفعِ ابہام اور تشریح کے لئے بہت سے توضیحی حواشی بڑھائے گئے ہیں۔

(۳) مصنف کا کوئی بیان اگر نقد اور تنبیہ کے قابل معلوم ہوا تو اس پر نقد اور تنبیہ کی گئی ہے۔

(۴) کہیں کہیں حوالے چھوٹ گئے تھے، اس نسخہ میں ان کو بڑھا دیا گیا ہے، کہیں صرف کتابوں کے نام تھے، اس دفعہ ان کے صفحے یا باب بھی لکھ دیئے گئے۔

(۵) جہاں صرف صفحوں کے حوالے تھے، ابواب اور فصول کے حوالے بھی دے دیئے گئے تاکہ جس کے پاس ماخذ کی کتاب کا جو ایڈیشن ہو اس میں نکال کر دیکھ لیا جا سکے۔

(۶) طبع اوّل کے بعد سے سیرت یا حدیث کی جو نئی کتابیں چھپی تھیں اُن سے استفادہ کر کے اگر کوئی نئی بات ان میں ملی ہے تو اس کا اضافہ کیا گیا۔

(۷) اگر کوئی حوالہ پہلے کسی نیچے درجے کا تھا اور بعد کو اُس سے اعلیٰ درجہ کا حوالہ ملا تو اس کو بڑھایا گیا۔

(۸) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کے ساتھ صلعم کے اختصار کے بجائے پورا صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کا اہتمام کیا گیا تاکہ اس تساہل سے درود پڑھنے کی برکت سے ناظرین کو محرومی نہ ہو۔

غزوہ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلہ میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچمدان کے خامۂ خطا رقم سے حضرت کعب بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید نکل گئی تھی جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا، جس پر مجھے شرمندگی ہے، اور اب میں اپنی اس غلطی و نادانی کو مان

کر اس عبارت کو قلم زد کر کے صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی برأت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواست گار ہوں۔

بندہ ہمان بہ کہ ز تقصیر خویش
عذر بہ درگاہِ خدا آورد

جن لوگوں کے پاس اس سے پہلے کے نسخے ہوں وہ اپنے نسخہ[1] سے ان سطروں کو کاٹ دیں تو بڑی مہربانی ہو۔ اب یہ موجودہ نسخہ طبع اوّل سے بہت سی باتوں میں بہتر ہوگیا ہے، اس موجودہ نسخہ میں انسانی استطاعت کے مطابق پوری طرح تصیح کی بھی کوشش کی گئی ہے، تاہم انسان، انسان ہے، خطا و نسیان اس کا خمیر ہے، کسی ناظرِ کتاب کو اب بھی کوئی غلطی معلوم ہو تو وہ ضرور مطلع فرما کر ممنون کرم کریں۔

آخر میں پاک پروردگار کی بارگاہِ عالی میں دعا ہے کہ وہ میری خطا و نسیان سے درگزر فرما کر اس خدمت کو قبول کا شرف بخشے اور مسلمانوں کو اس سے بیش از بیش مستفید فرما کر اس گنہگار کے لئے بخشائش کا ذریعہ بنائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہیچمدان
سید سلیمان ندوی
یکم جمادی الثانیہ ۱۳۶۴ھ

---

[1] یہ عبارت سیرۃ النبی جلد اول طبع اول کے صفحہ ۲۵۵ کی سطر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ اور طبع مابعد کے صفحہ ۳۲۳ کی سطر ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ میں ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

سیرت نبویؐ جلد اول طبع اوّل کو شائع ہوئے آج چار برس ہوئے، اس اثنا میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ ہم خاکسارانِ دار المصنفین کے لئے فخر و نازش کا سرمایہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ عام قدردانوں نے اس کو جان و دل سے خریدا، اور اُمرا، اور والیانِ ممالک نے اس کی خدمت کو سعادتِ دارین سمجھا بلکہ خواص اور علماء کے طبقہ نے بھی اس کی قدرشناسی کی۔

ہندوستان میں اہلِ علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے اپنے فن کی میزانِ نقد میں سیرت کے مضامین و تحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیاتِ قرآنی کو پڑھا، محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا، علمائے انساب نے اسماء کی تنقیح کی، منجموں اور حساب دانوں نے اس کے زائچوں اور تاریخوں پر نظرِ ثانی کی، اہلِ تاریخ و سیر نے واقعات کی جانچ پڑتال کی، اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص و محبت سے انھوں نے اپنے نتائجِ افکار سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے اُن سے فائدہ اٹھایا۔

طبعِ اوّل میں جیسا کہ خاتمہ میں ہم نے اقرار کیا تھا، چھاپہ کے اغلاط اور سہو کے چند مسامحات رہ گئے تھے، اس طبع میں جہاں تک امکانِ انسانی ہے تصحیح کی انتہائی کوشش کی گئی ہے اور یقین ہے کہ انشاءاللہ یہ اغلاط اور مسامحات سے پاک ہوگا، جو لوگ سیرت پر نقد کرنا چاہتے ہوں اُن کو یہی نسخہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

طبع اول بڑی تقطیع پر شائع ہوئی تھی، لوگوں کا اصرار تھا کہ طبع ثانی کتابی تقطیع پر شائع ہو، تاکہ وہ بہ آسانی ہر وقت استعمال میں آسکے، یہ اُن کی تعمیل ہے، انشاءاللہ ہر جلد کے طبع اول کی بڑی تقطیع کے بعد طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر شائع ہوتی رہے گی۔

سید سلیمان ندوی
۲۸ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ طبعِ اوّل

سیرت نبویؐ جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے، آج سات سال کے بعد اس کی پہلی جلد شائقین کے ہاتھ میں جاتی ہے، میں اپنا دل اس وقت مسرت آمیز اطمینان سے لبریز پاتا ہوں کہ استاد مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ میں جو فرض میرے سپرد کیا تھا، الحمد للہ کہ اس کے ایک حصہ سے آج سبکدوش ہوتا ہوں ع

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

لیکن اس مسرت اور اطمینان کے ساتھ یہ حسرت ناک منظر بھی سامنے ہے کہ مصنف اپنی چار سال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کر سکا، اور حسن عقیدت کے جو پھول سینکڑوں چمن کدوں سے چن کر ان کے ہاتھ آئے تھے، ان کو آستانۂ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا۔

مصنف مرحوم کو سیرت نبویؐ کے لکھنے کا خیال "الفاروق" کے بعد ہی پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ ۱۳۲۳ھ میں اس کا ایک مختصر سا حصہ یعنی غزوۂ اُحد تک وہ لکھ بھی چکے تھے کہ بعض مشکلات کی بنا پر رک گئے لیکن دل کا تقاضائے شوق برابر جاری رہا، بالآخر انھوں نے ۱۳۳۰ھ میں اس بار امانت کے اٹھانے کا آخری فیصلہ کر لیا، چنانچہ پچاس ہزار روپے کے سرمایہ کے لئے انھوں نے قوم میں مرافعہ پیش کیا، سیکڑوں مسلمان اس خدمت کے لئے آگے بڑھے، اُن میں فقرائے اُمت بھی تھے اور امرائے ملت بھی، لیکن یہ سعادت اخروی ازل ہی سے خادمۃ الملۃ النبویۃ مخدومۃ الامۃ المحمدیۃ نواب سلطان جہان بیگم تاج الہند فرمانروائے بھوپال متع اللہ المسلمین بطول بقائہا و دوام ملکہا کے لئے مقدر تھی، اس لئے وہ سب کے آگے بڑھیں اور سوانح نگار نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایۂ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کر لیا، فرمانروا خواتینِ اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دیئے ہیں آئندہ مورخ غالباً اس کارنامہ کو ان میں سب سے بڑا قرار دے گا، کہ اس کا تعلق اُس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو اسلام کی تاریخ میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد شاید دوبارہ اس خدمت گزاری کے لئے مسلمانوں میں قرعہ اندازی ہوتی لیکن فرمان روائے بھوپال نے مصنف کے جانشینوں کے لئے بھی سلسلہ فیض کو برابر جاری رکھا مصنف مرحوم کے منشا کے مطابق اس موقع پر منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال کا نام لینا بھی ضروری ہے، جن کی مردم جنبانی سے نسیم سعادت کے یہ جھونکے اس باغِ قدس تک دوبارہ آئے۔

مصنف مرحوم نے جو مسودہ چھوڑا تھا اس میں اس حصہ تک مبیضہ صاف تھا، البتہ تین چار مقامات پر اضافہ کی علامت بنی تھی اور مطالب کا اشارہ تھا، ان کو بڑھا دیا گیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ کی تکمیل کے بعد ان کو خیال آیا کہ قدیم مورخین کی طرح سنہ وار واقعات کی ترتیب رکھ کر ہر سنہ کے آخر میں جزئی حالات، واقعاتِ متفرقہ کے عنوان سے لکھ دیئے جائیں، چنانچہ مبیضہ پر ۴ھ تک اپنے قلم سے وہ لکھ سکے، یہ امانت جب میرے سپرد ہوئی تو میں نے بقیہ سنین کے آخر میں اسی قسم کے جزئیات متفرقہ کا اضافہ کر دیا، حواشی یا حوالے کہیں کہیں چھوٹ گئے تھے، وہ ڈھونڈ کر لکھے، لیکن اس کی کامل احتیاط کی گئی کہ جامع کا کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف مصنف کی عبارت میں نہ ملنے پائے، چنانچہ ان تمام جزئی اضافوں کو قوسین کے اندر جگہ دی گئی ہے، اس بنا پر لفظ "صلعم" یا جملہائے معترضہ کے علاوہ جو چند فقرے اور عبارتیں قوسین میں ہیں وہ اضافہ ہیں۔

یہ پہلے خیال تھا کہ جلد اول کو وفات تک وسعت دی جائے، لیکن جب کتابت شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضخامت ۸۰۰ صفحہ کو پہنچ جائے گی، اور اس سے جلد کی نفاست کو صدمہ پہنچے گا، سامانِ طبع کی گرانی سے جو تعویق پیدا ہو رہی تھی، اس نے مجبور کیا کہ اس کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا جائے، چنانچہ پہلی جلد سلسلۂ جنگ وغزوات پر ختم کر دی گئی، اور دوسری جلد اسلام کی امن کی زندگی، تنظیم وتنسیق، اشاعتِ اسلام، وفات اور اخلاق کی الگ کر دی گئی، خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی طبع واشاعت کی توفیق عطا فرمائے حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔

مصنف مرحوم کتاب کا سرنامہ لکھنے نہ پائے تھے، اُن کے مسودات میں اتفاقاً یہ تحریر قلمزدہ مل گئی اس کو غنیمت سمجھ کر تبرکاً داخل کتاب کیا جاتا ہے۔

جامع
سید سلیمان ندوی
دار المصنفین اعظم گڑھ
۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے، یعنی پہلے ہر قسم کے فضائلِ اخلاق، زہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے، اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فنِ اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھ کر تمام ملک میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو اُن کی تعلیم دلائی جائے، ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسنِ اخلاق کی تعمیل کرائی جائے، اور رذائل سے روکے جائیں۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں، اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا، لیکن سب سے زیادہ بلیغ، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر و زور سے کام کیا جائے بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامرِ سلطانی بن جائے، دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوسِ قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اور اسباب صرف ایوانِ تمدن کے نقش و نگار ہیں۔

لیکن اس وقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے، اُس نے اس قسم کے نفوسِ قدسیہ جو پیش کئے ہیں وہ فضائلِ اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً جنابِ مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکتبِ درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لئے جو فضائلِ اخلاق درکار ہیں مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراقِ تعلیم میں عفوِ عام کے صفحے خالی ہیں، اس بنا پر ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی، اور اس لئے عالمِ انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامع کامل[1] کا محتاج رہا جو صاحبِ شمشیر و نگیں بھی ہو

[1] یہاں پر کتاب کی اس عبارتِ بالا کے مخاطب اہلِ کتاب ہیں جن کے موجودہ صحیفوں میں ان انبیاء کے جو احوال مذکور ہیں، وہ اسی صورت میں ہیں، اس لئے مصنف نے ان کے بیان کردہ تمام احوال کو مان کر ایک باکمال اور ہمہ کمال ہستی کی ضرورت پر

اور گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سجدہ گزار بھی، مفلسِ قانع بھی ہو اور غنیِ دریا دل بھی، یہ برزخِ کامل، یہ ہستیِ جامع، یہ صحیفۂ یزدانی، عالمِ کون کی آخری معراج ہے

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔

عالمِ فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں، اس لئے یہ ہستیِ جامع دنیا میں اگر ہمیشہ نہیں رہ سکتی، اس لئے ضرور ہے کہ اُس کی زبان کا ایک ایک حرف، اُس کی حرکات و سکنات کی ایک ایک ادا، اُس کے حلیۂ وجود کے ایک ایک خط و خال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحلِ زندگی میں جہاں ضرورت پیش آئے رہنمائی کے کام آئے، لیکن

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ان کے سامنے حجت قائم کی ہے۔

لیکن چونکہ از روئے اسلام ایک طرف تمام انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے۔

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ (بقرہ: ۴۰) — ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالاتِ نبوت سے متصف مانا جائے، دوسری طرف ارشاد ہے:۔

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْھُمْ مَّنْ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعْضَھُمْ دَرَجٰتٍ وَّاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ (بقرہ ۳۳) — یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے اُن میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا اور ہم نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبریل) سے فرمائی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی ہے ان دونوں صداقتوں کے درمیان تطبیق کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام تمام کمالاتِ نبوت و فضائلِ اخلاق سے یکساں سرفراز تھے مگر زمانہ اور ماحول کے ضروریات اور مصالحِ الٰہی کی بنا پر ان تمام کمالات کا عملی ظہور تمام انبیاء میں یکساں نہیں ہوا بلکہ بعض کے بعض کمالات اور دوسروں کے دوسرے کمالات زیادہ نمایاں ہوتے، یعنی جس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہ پوری شدت سے ظاہر ہوا اور دوسرے کمال کا جس کی اس وقت ضرورت پیش نہیں آئی، بہ مصلحت بہ کمال ظہور نہیں ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر کمال کے ظہور کے لئے مناسب موقع و محل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کسی عارض کی وجہ سے کسی کمال کا ظہور نہ ہو تو اس سے نفسِ کمال کے وجود کی نفی نہیں ہوتی ہے اس لئے اگر بوجہ عدم ضرورت حال ان انبیائے کرام کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت میں نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات و فضائل سے متصف نہ تھے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام داعیانِ مذہب جامعیتِ کبریٰ کے وصف سے خالی تھے، اُن کے کارنامۂ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام لی گئیں، جناب مسیحؑ کی ۳۳ سالہ زندگی میں سے صرف ۳ برس کے حالات معلوم ہیں، فارس کے مصلحانِ دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، ہندوستان کے پیغمبر، افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہے، اس کا ذریعہ صرف موجودہ تورات ہے جو حضرت موسیٰؑ کے ۳۰۰ برس بعد عالمِ وجود میں آئی، یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ اُن کے کارنامے اور اصولِ تعلیم ابدی نہ تھے، اس لئے نقل وروایت کے آئینہ میں جس قدر اُن کا ناتمام عکس اُترا اس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا، قدرت خود ضرورت کی اندازہ داں ہے اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کر دیتی ہے۔

تمام اربابِ مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اُسی قدر عزیز ہے جس قدر دوسرے کو ہے اس لئے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں کون ہستی تھی جس میں جامعیتِ کبریٰ کا وصف نمایاں تھا؟ تو ہر طرف سے مختلف صدائیں آئیں گی، لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل دیا جائے کہ دنیا میں وہ کون شخص گزرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی اس طرح قلم بند ہوا کہ ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لئے بھی نہ ہو سکا اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال وافعال، وضع وقطع شکل وشباہت، رفتار وگفتار، مذاقِ طبیعت، اندازِ گفتگو، طرزِ زندگی، طریقِ معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہو سکتی ہے (محمد عربی فدیتہ بابی وامی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) غزوہ بدر کے قیدیوں کے باب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینے کا اور حضرت عمرؓ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شدت ورحمت میں لوگوں کے قلوب مختلف بنائے ہیں، اے ابوبکر! تمہاری مثال ابراہیمؑ وعیسیٰؑ کی اور اے عمر! تمہاری مثال نوحؑ وموسیٰؑ کی ہے یعنی ایک فریق سے رحم وکرم کا اور دوسرے سے شدت کا اظہار ہوا (دیکھئے مستدرک حاکم غزوۂ بدر)

اس حدیث میں اسی نقطۂ اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے مختلف احوالِ مبارکہ میں رونما رہا ہے لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ آخری اور عمومی تھی، اس لئے بہ ضرورت احوال آپ کے تمام کمالات نبوت آپ کی زندگی میں عملاً پوری طرح جلوہ گر ہوتے، اور آپ کی نبوت کے آفتاب عالمتاب کی ہر کرن دنیا کے لئے مشعل ہدایت بنی اور ظلمت کدہ عالم کا ہر گوشہ آپ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پُر نور ہوا، صلی اللہ علیہ وسلم، اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایسا پہلو نعوذ باللہ پیدا نہ ہونے پائے جس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی توہین یا کسر شان پیدا ہو کر اس سے ایمان کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے (معارف محرم وصفر ۱۳۵۶ھ) میں مضمون "خلیل کی بشریت" میں۔

یہ جو کچھ کہا گیا، مقصدِ تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم وفنون کی صف میں سیرت (بیاگرفی) کا ایک خاص درجہ ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالاتِ زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیلِ راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرۂ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، ستاتا ہے، اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی وعمل، جدّ وجہد، ہمت وغیرت کی جو عجیب وغریب نیرنگیاں سکندرِ اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں، بعینہٖ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بنا پر اگر سیرت یا سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو شخص کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں وہ کس وسعت اور استقصاء وتفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں تاکہ مراحل زندگی کی تمام راہیں اور ان کے پیچ وخم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آجائیں، لیکن اگر خوش قسمتی سے فرد کامل اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

وجوہِ مذکورۂ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام عالم کو اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے، جس کا نامِ مبارک محمد رسول اللہ ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ وَسَلِّمْ صَلٰوةً كَثِيْرًا كَثِيْرًا، یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ ہے کہ مجموعۂ ضروریاتِ دینی ودنیوی ہے۔

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرض اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرت نبوی کی خدمت انجام دیتا، لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکا، تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔

اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضینِ حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرارِ نبوت بھی جزوِ مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حاملِ وحی اور پیغمبر الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟

یورپ کے مورخین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے، تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں

اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبر کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگر مجمعِ انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا، اس بات سے اُس کے منصبِ نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اُس کے دامنِ اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنھوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا، اور میں نے سیرت نبویؐ پر ایک بسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا، یہ کام بظاہر آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، اُن کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہو سکتی۔

آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ خاص سیرت پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی

---

[1] اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے قابل ہے جو آجکل کی قلت علم اور ناآشنائی فن نے پیدا کر دی ہے بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت فنِ حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے یعنی احادیث میں سے وہ واقعات الگ لکھ دیئے گئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات سے متعلق ہیں، تو یہ سیرت بن گئی اور چونکہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں، مثلاً صحیح بخاری، مسلم، تو یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ "سیرت میں کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی" اس بحث کے ذہن نشین کرنے کے لئے امور ذیل پیشِ نظر رکھنے چاہئیں۔

(۱) پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے، محدثین اور ارباب رجال کی اصطلاح قدیم یہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے تھے چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں اور سیرت بھی، حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب المغازی میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں، فقہ کی بھی یہی اصطلاح ہے، فقہ میں جو باب کتاب الجہاد والسیر باندھتے ہیں اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔

کئی صدی تک یہی طریقہ رہا، چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہوئیں، مثلاً سیرت ابن ہشام سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ، ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں، البتہ زمانۂ مابعد میں مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فنِ حدیث سے ایک الگ چیز ہے یہاں تک کہ بعض موقعوں پر اربابِ سیر اور محدثین دو متقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں، بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام اربابِ سیر ایک طرف ہوتے ہیں، اور امام بخاری و مسلم ایک طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے کہ تمام اربابِ سیر کے خلاف ہے لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام اربابِ سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابلِ ترجیح ہے، ہم اس موقع پر دو ایک واقعہ مثال کے طور پر لکھتے ہیں۔

غزوات میں ایک غزوہ ذو قرد کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت اربابِ سیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوعؓ سے جو روایت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن قبل

جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا، حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاذ تھے، سیرت نبویؐ میں لکھتے ہیں:-

ولیعلم الطالبُ ان السِّیَرا تجمع ما صح وما قد انکرا

یعنی طالبِ فن کو جاننا چاہیئے کہ سیرت میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں صحیح بھی اور قابلِ انکار بھی۔

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلّم الثبوت تصنیفات میں بھی بہت سی ضعیف روایتیں شامل ہو گئیں، اس بنا پر ضرور تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث ورجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں، اور پھر نہایت تحقیق اور تنقید سے ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کا واقعہ ہے، اس حدیث کی شرح میں علامہ قرطبی نے لکھا ہے۔

لا یختلف اھل السیر ان غزوۃ ذی قرد کانت قبل الحدیبیۃ فیکون ما وقع فی حدیث سلمۃ من وھم بعض الرواۃ۔

اہل سیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوہ ذی قرد حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا، تو سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے، اگر وہ کسی راوی کا وہم ہوگا،

حافظ ابن حجر فتح الباری (ذکر غزوہ ذی قرد) میں قرطبی کے اس قول پر بحث کر کے لکھتے ہیں۔

فعلی ھذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوۃ ذی قرد اصح مما ذکرہ اھل السیر

تو اس بنا پر صحیح (مسلم) میں غزوہ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے جو مصنفین سیرت نے بیان کی ہے

دمیاطی ایک مشہور محدث ہیں انھوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے جو آج بھی موجود ہے اس میں انھوں نے اکثر موقعوں پر اربابِ سیر کی روایت کو ترجیح دی تھی لیکن جب زیادہ تتبع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ احادیث صحیحہ کو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے چنانچہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے اس لئے نہ کر سکے۔

حافظ ابن حجر خود دمیاطی کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ودل ھذا علی انہ کان یعتقد الرجوع عن کثیر مما وافق فیہ اھل السیر وخالف الاحادیث الصحیحۃ وان ذٰلک کان بہ قبل تضلعہ منھا ولخروج نسخ کتابہ وانتشارہ لم یتمکن من تغییرہ۔

(زرقانی بر مواہب جلد ۳ ص۱۱)

اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ (یعنی دمیاطی) قصد کر چکے تھے کہ جن موقعوں پر انھوں نے اربابِ سیر سے اتفاق کر کے احادیث صحیحہ کی مخالفت کی ہے ان سے رجوع کریں گے اور یہ کہ یہ امر ان سے مہارت فن کے قبل صادر ہوا لیکن چونکہ کتاب کے نسخے شائع ہو چکے تھے، اس لئے وہ اپنی کتاب کی اصلاح نہ کر سکے۔

(۲) ایک غزوہ ذات الرقاع کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت اکثر اربابِ سیر کا اتفاق ہے کہ جنگ خیبر کے قبل واقع ہوا تھا، لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ خیبر کے بعد واقع ہوا، اس پر علامہ دمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں۔

واما شیخہ الدمیاطی فادعی غلط الحدیث

باقی ان کے شیخ دمیاطی تو انھوں نے حدیث کی نسبت

مستند تصنیف تیار کی جاتے، لیکن سینکڑوں کتابوں کا استقصار کے ساتھ دیکھنا، اور اُن سے معلومات کا اقتباس کرنا ایک شخص کا کام نہ تھا، اس کے ساتھ ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ یورپ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے واقفیت حاصل کی جائے، میں بدقسمتی سے یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا، اس لئے ایک مکمل تصنیف کی ضرورت تھی جس میں قابل عربی دان اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں، خدا نے جب یہ سامان پیدا کر دیئے تو اب مجھ کو کیا عذر ہو سکتا تھا، اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی تھی۔

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصار کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے اور نہ آئندہ توقع کی جا سکتی ہے، اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہو سکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کئے گئے، اور اس زمانہ میں کئے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا۔ طبقات ابن سعد، کتاب الصحابہ لابن السکن، کتاب لعبد اللہ بن علی بن جارود، کتاب العقیلی فی الصحابۃ، کتاب ابن ابی حاتم الرازی، کتاب الازرق، کتاب الدولابی، کتاب البغوی، طبقات ابن ماکولا، اسد الغابۃ، استیعاب، اصابہ فی احوال الصحابہ، صرف انہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

الصحیح و ان جمیع اھل السیر علی خلافہ (فتح الباری جز ہفتم صفحہ ۲۲۲) — غلطی کا دعویٰ کیا ہے اور یہ کہ تمام اہل سیر بالاتفاق اس کے خلاف ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے اس کا رد بھی کیا ہے۔

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور بعینہٖ فن حدیث نہیں ہے اور اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی، جو فن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور حدیث ہی سے ماخذ ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہٖ قرآن یا حدیث ہے یا ان دونوں کے ہم پلہ ہے۔

(۳) مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں اس سے ارباب سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے، اس بنا پر سیرت و مغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔

(۴) جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا، آج بیسیوں کتابیں قدما سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی حلبی، مواہب لدنیہ، کسی میں یہ التزام نہیں۔

تفصیل مذکورہ بالا سے ظاہر ہوگا کہ ہماری اس عبارت کا کہ سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی، اس کا کیا مطلب ہے اور کہاں تک صحیح ہے۔

[1] ان کتابوں کا ذکر استیعاب کے دیباچہ میں ہے۔

بزرگوں کے حالات میں ہیں، کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقاء میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درج تحریر ہو سکے ہیں؟

سیرت نبوی کے متعلق قدماء نے جو ذخیرہ مہیا کیا، اس کی مختصر تاریخ اور کیفیت ہم اس غرض سے اس موقع پر درج کر دیتے ہیں کہ ایک کامل اور مستند کتاب کے مرتب کرنے کے لئے اس ذخیرہ سے کیونکر کام لیا جا سکتا ہے اور کہاں تک تحقیق اور تنقید کی ضرورت ہے۔

فن سیرت کی ابتداء اور تحریری سرمایہ

عام طور پر یہ خیال ہے کہ چونکہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اور اسلام میں تدوین و تالیف کا آغاز خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ سے (تقریباً ۱۴۳ھ میں) ہوا، اس لئے اس زمانہ تک سیرت اور روایات کا جو کچھ ذخیرہ تھا، زبانی تھا، تحریری نہ تھا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج (گو کم سہی) مدت سے چلا آتا ہے، بہت قدیم زمانہ میں حمیری اور نباتی خط تھا جس کے کتبے آج نہایت کثرت سے یورپ کی بدولت مہیا ہو گئے ہیں، اسلام سے کچھ پہلے وہ خط ایجاد ہوا، جو عربی خط کہلاتا ہے، اور جس نے بہت کی صورتیں بدل کر آج یہ صورت اختیار کر لی ہے۔

اس خط کی تاریخ اور اس کی ابتداء کے متعلق جو قدیم روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں، اکثر افسانہ ہیں، مثلاً ابن الندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ اول اول جن لوگوں نے عربی خط ایجاد کیا، ان کے نام یہ تھے۔ ابوجاد، ہواز، حُطّی، کلمون، سعفص، قریشات (یہی نام ہیں جن کو ہم آج ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت کہتے ہیں)

اسی طرح کعب کا یہ قول کہ تمام خطوط حضرت آدمؑ نے ایجاد کئے تھے، ابن الندیم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی خط لکھا، وہ تین شخص قبیلۂ بولان (قبیلۂ طے کی ایک شاخ) کے تھے، جو انبار میں آباد تھے، ان کے نام مرامر بن مرۃ، اسلم بن سدرہ، عامر بن جدرہ تھے۔

ان تمام روایتوں میں جو قرین قیاس ہے، وہ روایت ہے جو ابن الندیم نے عمرو بن شبہ کی کتاب مکہ سے نقل کی ہے، یعنی سب سے پہلے عربی خط ایک شخص نے ایجاد کیا جو بنو مخلد ابن نضر بن کنانہ کے خاندان سے تھا، اور غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب قریش نے عروج حاصل کر لیا تھا، اور تجارت کے ذریعہ سے بیرونی ممالک میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز دیکھی تھی، جو عبدالمطلب ابن ہاشم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اس کے یہ الفاظ تھے:

حق عبد المطلب بن هاشم من اهل مكة علی فلان ابن فلان الحميری من اهل وزل — یہ عبدالمطلب بن ہاشم (جو مکہ کا باشندہ ہے) کا قرضہ فلاں شخص پر ہے جو صنعاء کا رہنے والا ہے یہ چاندی کے ہزار

---

[1] یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور اخلاق و عادات کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں جو سیرت میں کافی مدد دے سکتے ہیں تاہم تنہا ان سے ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں ہو سکتی، اس کے علاوہ ان میں تاریخی ترتیب نہیں ہے، یہاں ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے حدیث کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

حسنعا الیه الف درهم فضة کیلا بالحدیدة ومتی دعاه بها اجابه شهد الله والملکان[1]۔	درہم ہیں جب طلب کیا جائے گا وہ ادا کرے گا، خدا اور دو فرشتے اس کے گواہ ہیں۔

اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبد المطلب نے کسی حمیری شخص کو ہزار درہم قرض دیئے تھے، خاتمہ میں دو فرشتوں کی گواہی لکھی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فرشتوں کا اور شاید کراماً کاتبین کا اعتقاد موجود تھا۔

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس دستاویز کا خط ایسا تھا جیسا عورتوں کا خط ہوتا ہے۔

علامہ بلاذری نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جب بعثت ہوئی تو قریش میں سترہ شخص لکھنا پڑھنا جانتے تھے یعنی حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، طلحہؓ، زیدؓ، ابو حذیفہؓ ابو سفیانؓ، شفاؓ بنت عبد اللہ وغیرہ[2]۔

بدر کی لڑائی جو ۲ھ میں ہوئی، اس میں قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے، ان سے فدیہ لیا گیا، لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا کر سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ ہر شخص دس دس بچوں کو اپنے ذمہ لے کر اُن کو لکھنا سکھا دے، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جو کاتب وحی ہیں، اسی طرح لکھنا سیکھا تھا[3]۔

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ عرب اور خصوصاً مکہ و مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج ہو چکا تھا، البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں روایتیں اور حدیثیں بھی قلمبند ہوئی تھیں یا نہیں، اور اس بنا پر سیرت کا کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود تھا یا نہیں، بعض حدیثوں میں جن میں سے بعض صحیح مسلم میں مذکور ہیں، تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے قلم بند کرنے سے منع فرمایا تھا، مسلم کے یہ الفاظ ہیں۔

لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔	مجھ سے جو سنو اس کو قلم بند نہ کرو (بجز قرآن کے) اور کسی نے قلمبند کیا ہو تو اس کو مٹا ڈالنا چاہیئے۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کا ارشاد ہے کیونکہ متعدد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں بعض صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے آپؐ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے، صحیح بخاری (باب العلم) میں حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے کہ صحابہؓ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں، البتہ عبد اللہ بن عمرؓ مستثنے ہیں، کیونکہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے، اور میں لکھتا نہ تھا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے

---

[1] ابن ندیم ص ۷، طبع مصر۔ [2] فتوح البلدان ذکر خط ص ۴۷۱ مطبوعہ یورپ [3] طبقات ابن سعد غزوہ بدر ص ۱۴۔

تھے لکھ لیا کرتے تھے، قریش نے اُن کو منع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی غیظ کی حالت میں ہوتے ہیں، کبھی خوشی میں، اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو، عبد اللہ بن عمرؓ نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا، آپؐ نے دہانِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے[1]۔ خطیب بغدادی نے اپنے رسالہ تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبد اللہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں قلمبند کر لیا کرتے تھے، صادقہ تھا[2]۔

ایک دفعہ آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لا چکے ہیں، اُن کے نام قلم بند کئے جائیں، چنانچہ پندرہ سو صحابہ کے نام دفتر میں درج کئے گئے[3]۔

خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ جب لوگ کثرت سے حضرت انسؓ کے پاس حدیثوں کے سننے کے لئے جمع ہو جاتے تھے، تو وہ ایک جُنگ نکال لاتے تھے کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھ لی تھیں۔

متعدد قبائل کو آپ نے جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھیجے وہ تحریری تھے اور کتبِ احادیث میں بعینہا منقول ہیں، اسی طرح سلاطین کو دعوتِ اسلام کے جو پیغام بھیجے گئے وہ بھی تحریری تھے۔

صحیح بخاری (باب کتابة العلم) میں ہے کہ فتح مکہ کے سال جب ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کر دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقہ پر سوار ہو کر خطبہ دیا، یمن کے ایک شخص نے آ کر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھ کو تحریر کرا دیا جائے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس شخص کے لئے وہ خطبہ قلمبند کرا دیا جائے۔

غرض اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک حسب ذیل تحریری سرمایہ مہیا ہو گیا تھا۔

(۱) جو حدیثیں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ وغیرہ نے قلمبند کیں۔

(۲) تحریری احکام اور معاہدات (حدیبیہ وغیرہ) اور فرامین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل کے نام بھیجے۔

(۳) خطوط جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین اور امراء کے نام ارسال فرمائے۔

(۴) پندرہ سو صحابہؓ کے نام۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس تحریری ذخیرہ کو اس قدر ترقی ہوتی گئی کہ (بنو العباس سے پہلے) ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں[4]۔

مغازی عرب میں علوم و فنون نہ تھے، صرف خاندانی معرکے اور لڑائیوں کے واقعات محفوظ رکھتے تھے، اس

---

[1] ابو داؤد جلد ۲ ص ۷۷، [2] جامع بیان العلم للقاضی ابن عبد البر مطبوعہ مصر ص ۷۲، میں صادقہ کا ذکر ہے [3] صحیح بخاری باب الجہاد [4] بخاری جلد ۱ ص ۲۱ و ۲۲ صحیفہ علی و کتابة الرجل من الیمن [5] سنن ابن ماجہ ص ۱۳۰ و جلد ۱ ص ۱۵۵، ۱۵۶ [6] بخاری جلد ۱ ص ۵ وایضاً ص ۱۵ [7] بخاری جلد ۱ ص ۱۵ [8] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، تذکرہ امام بخاری۔

لحاظ سے قیاس یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات اور افعال و اقوال میں سب سے پہلے مغازی کی روایتیں پھیلتیں اور سب سے پہلے اسی فن کی بنیاد پڑتی، لیکن روایات کے تمام انواع میں مغازی کا درجہ سب سے متاخر رہا، خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ نے زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن اقوال و افعال پر توجہ کی جن کو شریعت سے تعلق تھا، اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہوتے تھے۔

امام بخاری نے غزوۂ اُحد کے ذکر میں سائب بنؓ یزید سے یہ روایت نقل کی ہے۔

صحبت عبد الرحمن بن عوف و طلحة بن عبید اللہ و المقداد و سعدًا فما سمعت احدًا منھم یحدث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا انی سمعت طلحة یحدث عن یوم احد

میں عبد الرحمنؓ بن عوف اور طلحہؓ بن عبید اللہ اور مقداد اور سعد کی صحبت میں رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حدیث بیان کرتے نہیں سنا بجز اس کے کہ طلحہؓ غزوۂ اُحد کا واقعہ بیان کرتے تھے۔

حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ اور طلحہؓ و مقدادؓ و سعدؓ و قاص اکابر صحابہؓ میں ہیں، اور اُن سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں، اس لئے اس عبارت کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ غزوات کے واقعات نہیں بیان کرتے تھے بجز اُس کے کہ طلحہؓ جنگِ اُحد کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ علماء میں جن لوگوں نے مغازی کو اپنا فن بنا لیا تھا وہ عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے خواص میں اُس قدر مستند نہیں خیال کئے جاتے تھے، اس فن کے اساطین اور ارکان ابن اسحاق اور واقدیؔ ہیں، واقدی کو تو محدثین علانیہ کذاب کہتے ہیں، ابن اسحاق کو ایک گروہ ثقہ کہتا ہے لیکن اُسی درجہ کا دوسرا گروہ اُن کو بے اعتبار سمجھتا ہے، تفصیل آگے آئے گی۔ امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔

ثلثة کتب لیس لھا اصول المغازی والملاحم والتفسیر۔

تین قسم کی کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں مغازی اور ملاحم اور تفسیر۔

خطیب بغدادی نے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ امام ابن حنبل کی مراد اُن خاص کتابوں سے ہوگی جو بے اصل ہیں، پھر لکھا ہے۔

امّا کتب التفسیر فمن اشھرھا کتابا الکلبی و مقاتل بن سلیمان وقد قال احمد فی تفسیر الکلبی من اولہ الی آخرہ کذب۔

باقی تفسیر کی کتابیں تو ان میں سے کلبی اور مقاتل کی کتابیں بہت مشہور ہیں، امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ کلبی کی تفسیر اول سے اخیر تک جھوٹ ہے۔

پھر لکھتے ہیں:۔

واما المغازی فمن اشھرھا کتاب محمد بن اسحاق وکان یاخذ من اھل الکتاب وقد قال الشافعی کتب الواقدی کذب۔

باقی مغازی تو اس فن کی مشہور کتاب محمد ابن اسحاق کی کتاب ہے اور وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے روایت کرتے تھے اور امام شافعی نے کہا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹ ہیں۔

باوجود ان باتوں کے یہ ناممکن تھا کہ یہ حصہ نظر انداز کر دیا جاتا، اس لئے اکابر صحابہؓ اور محدثین نہایت

احتیاط کے ساتھ جو واقعات جہاں تک خوب محفوظ ہوتے تھے روایت کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کی ابتداء سلطنت کی وجہ سے ہوئی

صحابہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے، لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا، لیکن بنو امیہ نے حکماً علماء سے تصنیفیں لکھوائیں، قاضی ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔

کنا نکرہ کتاب العلم حتی اکرھنا علیہ ھؤلآء الامراء۔

ہم لوگ علم کا قلم بند کرنا پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ امراء نے ہم کو مجبور کیا۔

سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر قدماء کی تاریخ مرتب کرائی جس کا نام اخبار الماضیین ہے[1]

امیر معاویہؓ کے بعد عبد الملک بن مروان نے جو ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، ہر فن میں علماء سے تصنیفیں لکھوائیں، سعید بن جبیر جو اعلم العلماء تھے، اُن کو حکم بھیجا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں، چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھ کر بھیجی جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی، عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے اُن ہی کی تفسیر ہے عطاء کو خزانہ شاہی سے یہ نسخہ ہاتھ آگیا تھا[2]

حضرت عمر بن عبد العزیز کا زمانہ آیا تو انھوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی، تمام ممالک میں حکم بھیجا کہ احادیث نبوی مدون اور قلم بند کی جائیں، سعد بن ابراہیم جو بہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے، اُن سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلم بند کرائے اور تمام ممالک مقبوضہ میں بھیجے، علامہ ابن عبد البر جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں۔

عن سعد بن ابراھیم قال امرنا عمر بن عبد العزیز بجمع السنن فکتبناھا دفترًا دفترًا فبعث الی کل ارض لہ علیھا سلطان دفترًا[3]

سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیز نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا، ہم نے دفتر کے دفتر لکھے، عمر نے جہاں جہاں ان کی حکومت تھی ایک ایک دفتر بھیج دیا۔

ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری جو اس زمانہ کے بہت بڑے محدث اور امام زہری کے استاد اور مدینہ کے قاضی تھے، ان کو بھی خاص طور پر احادیث کے جمع کرنے کا حکم بھیجا ہے[4]

حدیث میں حضرت عائشہؓ کی مرویات کی ایک خاص حیثیت ہے، یعنی اُن سے اکثر وہ حدیثیں مروی ہیں جو عقائد یا فقہ کے مہمات مسائل ہیں، اس لئے عمر بن عبد العزیز نے ان کی روایتوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا عمرۃ بن عبد الرحمن ایک خاتون تھیں، اُن کو حضرت عائشہؓ نے خاص اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا، وہ بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں، تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مرویات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا، عمر بن

---

[1] فہرست ابن الندیم ص ۱۴۴ [2] میزان الاعتدال ترجمہ عطاء بن دینار [3] مطبوعہ مصر ص ۳۶ [4] طبقات ابن سعد جز ثانی قسم ثانی ص ۱۳۴۔

عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد کو خط لکھا کہ عمرۃ کے مسائل اور روایات قلم بند کر کے بھیج دیں۔

مغازی پر خاص توجہ

اب تک مغازی و سیر کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی اور حکم دیا کہ غزوات نبوی کا خاص حلقہ درس قائم کیا جائے۔ عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری المتوفی ۱۲۱ھ اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے، ان کو حکم دیا کہ جامع مسجد دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں۔

اسی زمانہ میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی، اور جیسا کہ امام سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے، یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی، امام زہری اس زمانہ کے اعلم العلماء تھے، فقہ اور حدیث میں اُن کا کوئی ہمسر نہ تھا، امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں، انھوں نے حدیث و روایات کے حاصل کرنے میں یہ محنتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر جاتے، جوان بڈھے، عورت، مرد، جو مل جاتا، یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں سے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور حالات پوچھتے اور قلم بند کرتے، وہ نسباً قریشی تھے، ۵۰ھ میں پیدا ہوئے، بہت سے صحابہؓ کو دیکھا تھا، ۸۰ھ میں عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے، اس نے بہت قدر و منزلت کی، کتاب المغازی غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ہدایت کے موافق لکھی، یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ امام موصوف سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مقربین خاص میں داخل تھے، ہشام بن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم اُن کے سپرد کی تھی، ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

امام زہری کی وجہ سے مغازی و سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا، ان کے حلقہ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے، جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے، اُن میں سے یعقوب بن ابراہیم، محمد ابن صالح تمار، عبدالرحمن بن عبدالعزیز فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے، چنانچہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں اُن لوگوں کا امتیازی وصف صاحب المغازی لکھا جاتا ہے۔

زہری کے تلامذہ میں سے دو شخصوں نے اس فن میں نہایت شہرت حاصل کی اور یہی دو شخص ہیں جن پر اس فن کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق۔ موسیٰ بن عقبہ خاندان زبیر کے غلام تھے، عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا تھا، فن حدیث میں امام مالک اُن کے شاگرد ہیں، امام مالک اُن کے نہایت مداح تھے اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ فن مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو، اُن کے مغازی کے جو خصوصیات ہیں، یہ ہیں۔

(۱) مصنفین اب تک روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے، انھوں نے زیادہ تر اس کا التزام کیا۔

(۲) عام مصنفین کا یہ مذاق تھا کہ کثرت سے واقعات نقل کئے جائیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں آ جاتی تھیں، موسیٰ نے احتیاط کی اور صرف وہی روایتیں لیں جو اُن کے نزدیک صحیح

لے تہذیب التہذیب ترجمہ ابوبکر بن محمد و عمرۃ بنت عبدالرحمن و طبقات ابن سعد جز دوم حصہ دوم ص ۱۳۴ لے تہذیب التہذیب ترجمہ عاصم بن عمر بن قتادہ لے تہذیب التہذیب ترجمہ امام زہری (محمد بن مسلم)

ثابت ہوئیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب بہ نسبت اور کتب مغازی کے مختصر ہے۔

(۳) چونکہ روایت حدیث کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی، اس لئے اکثر لوگ بچپن اور آغاز شباب ہی سے حلقہ درس میں شامل ہو جاتے تھے، اور حدیثیں سن کر لوگوں سے روایت کرتے تھے، لیکن چونکہ اس عمر تک واقعات کا صحیح طور سے سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا، اس لئے اکثر روایتوں میں تغیر اور اختلاط ہو جاتا تھا، موسیٰ نے بخلاف اور لوگوں کے کبر سن میں اس فن کو سیکھا تھا، ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

موسیٰ کی کتاب آج موجود نہیں، لیکن ایک مدت تک شائع و ذائع رہی، اور سیرت کی تمام قدیم کتابوں میں کثرت سے اس کے حوالے آتے ہیں۔

محمد بن اسحاق نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ امام فن مغازی کے نام سے مشہور ہیں، شہرت عام میں اگرچہ واقدی اُن سے کم نہیں، لیکن واقدی کی لغو بیانی مسلّمہ عام ہے، اور اس لئے انکی شہرت بدنامی کی شہرت ہے، محمد بن اسحاق تابعی ہیں، ایک صحابی (حضرت انسؓ) کو دیکھا تھا، علم حدیث میں کمال تھا، امام زہری کے دروازہ پر دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آئے، لیکن محمد بن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں، ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے، امام مالکؒ ان کے سخت مخالف ہیں، لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں، امام بخاری نے صحیح بخاری میں اُن کی روایت نہیں لی لیکن جزء القراۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاریخ میں تو اکثر واقعات انہی سے لیتے ہیں۔

فن مغازی کو انھوں نے اس قدر ترقی دی اور اس قدر دلچسپ بنا دیا کہ خلفائے عباسیہ جو زیادہ تر اس قسم کا مذاق رکھتے تھے، ان میں مغازی کا مذاق پیدا ہو گیا، چنانچہ ابن عدی نے اس احسان کا خاص طرح پر ذکر کیا ہے، ابن عدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس فن میں کوئی تصنیف اُن کی تصنیف کے رتبہ کو نہیں پہنچی۔

ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ اُن یہودیوں سے دریافت کر کے داخل کتاب کرتے تھے، جو مسلمان ہو گئے تھے، اور چونکہ یہ واقعات انھوں نے یہودیوں سے سُنے ہوں گے اس لئے اُن پر پورا اعتماد نہیں ہو سکتا، علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے اور اُن کو ثقہ سمجھتے تھے، ۱۵۱ھ میں وفات پائی۔

محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کا ترجمہ شیخ سعدی کے زمانہ میں ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی میں ہوا اس کا قلمی نسخہ الٰہ آباد میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔

محمد بن اسحاق کی کتاب کثرت سے پھیلی اور بڑے بڑے مشہور محدثوں نے اس کے نسخے مرتب کئے، اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیادہ منقح اور اضافہ کر کے مرتب کیا، جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے، چونکہ

لے تہذیب التہذیب۔

اصل کتاب آج کم ملتی ہے، اس لئے آج اُس کی جو یادگار موجود ہے، وہ یہی ابنِ ہشام کی کتاب ہے۔

ابنِ ہشام کا نام عبدالملک ہے، وہ نہایت ثقہ اور نامور محدث اور مؤرخ تھے، حمیر کے قبیلہ سے تھے اور غالباً اسی تعلق سے سلاطین حمیر کی تاریخ لکھی جو آج بھی موجود ہے، انھوں نے سیرت میں یہ اضافہ کیا کہ سیرت میں جو مشکل الفاظ آتے ہیں اُن کی تفسیر بھی لکھی ۲۱۳ یا ۲۱۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت ابنِ اسحاق کی مقبولیت کی بنا پر لوگوں نے اُس کو نظم کیا، چنانچہ ابونصر فتح بن موسیٰ خضراوی المتوفی ۶۶۳ھ و عبدالعزیز بن احمد المعروف بہ سعد دیری المتوفی فی حدود ۶۰۷ھ و ابواسحاق انصاری تلمسانی و فتح الدین محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن الشہید المتوفی ۷۹۳ھ نے منظوم کیا۔ اخیر کتاب میں قریباً دس ہزار شعر ہیں اور اس کا نام فتح الغریب فی سیرت الحبیب ہے۔

واقدی خود تو قابلِ ذکر نہیں، لیکن اُن کے تلامذۂ خاص میں سے ابنِ سعد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔

ابنِ سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو اُن کے استاد (واقدی) قابلِ اعتبار نہیں لیکن وہ خود قابلِ سند ہیں، خطیب بغدادی نے اُن کی نسبت یہ الفاظ لکھے ہیں۔

کان من اھل العلم والفضل والفھم والعدالۃ صنف کتاباً کبیراً فی طبقات الصحابۃ والتابعین الیٰ وقتہ فاجاد فیہ و احسن۔[1]

یہ موالی بنی ہاشم سے تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے، لیکن بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی، بلاذری جو مشہور مورخ ہیں انہی کے شاگرد ہیں، ۲۳۰ھ میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

اُن کی کتاب کا نام طبقات ہے، ۱۲ جلدوں میں ہے، دو جلدیں خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ہیں، اور یہ حصہ دراصل سیرت نبوی ہے، باقی جلدیں صحابہؓ (و تابعین) کے حالات میں ہیں، اور چونکہ صحابہؓ کے حالات میں ہر جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا ہے، اس لئے ان حصوں میں بھی سیرت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

یہ کتاب تقریباً ناپید ہو چکی تھی، یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پورا نسخہ موجود نہ تھا، شہنشاہِ جرمن کو اس کی طبع و اشاعت کا خیال ہوا، چنانچہ لاکھ روپے جیب خاص سے دیئے اور پروفیسر ساخو کو اس کام پر مامور کیا کہ ہر جگہ سے اس کے اجزاء فراہم کر کے لائیں، پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ، مصر اور یورپ جا کر جا بجا سے تمام جلدیں بہم پہنچائیں، یورپ کے بارہ پروفیسروں نے الگ الگ جلدوں کی تصحیح اپنے ذمہ لی، چنانچہ نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ یہ نسخہ لیڈن (ہالینڈ) میں چھپ کر شائع ہوا۔

اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، لیکن چونکہ تمام روایتیں بہ سند مذکور ہیں، اس لئے

[1] تہذیب التہذیب ترجمہ محمد بن سعد۔

واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کر لی جا سکتی ہیں۔

اس زمانہ میں سیرت پر اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، چنانچہ کشف الظنون وغیرہ میں اُن کے نام مذکور ہیں، لیکن چونکہ نام کے سوا اُن کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں، نہ اُن کا آج وجود ہے، اس لئے ہم اُن کے نام نظر انداز کرتے ہیں۔

سیرت کے سلسلہ میں الگ تاریخی تصنیفات ہیں، اُن میں سے جو محدثانہ طریقہ پر لکھی گئیں، یعنی جن میں روایتیں بہ سند مذکور ہیں، ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور واقعات کا جو حصہ ہے، وہ بھی دراصل سیرت نبویؐ ہے، اُن میں سب سے مقدم اور قابلِ استناد امام بخاری کی دونوں تاریخیں ہیں، لیکن دونوں نہایت مختصر ہیں، تاریخ صغیر چھپ گئی ہے۔ اس میں سیرت نبویؐ کا حصہ کتاب کا دسواں حصہ بھی نہیں، یعنی صرف ۱۵ صفحے ہیں، اور اُن میں بھی کوئی ترتیب نہیں، کبیر البتہ بڑی ہے، میں نے اُس کا نسخہ جامع اباصوفیہ میں دیکھا تھا، لیکن سوانحِ نبویؐ اس میں بہت کم ہیں اور جستہ جستہ واقعات بلا ترتیب مذکور ہیں۔

تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے، امام طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین اُن کے فضل و کمال، وثوق اور وسعتِ علم کے معترف ہیں، ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے، محدث ابنِ خزیمہ کا قول ہے کہ دنیا میں، میں کسی کو اُن سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا، ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

بعض محدثین (سلیمانی) نے اُن کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے" لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے۔

هذا رجم بالظن الکاذب بل ابن جریر من کبار ائمۃ الاسلام المعتمدین۔

یہ جھوٹی بدگمانی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابنِ جریر اسلام کے معتمد اماموں سے ایک بڑے امام ہیں۔

علامہ ذہبی نے اس موقع پر لکھا ہے کہ ان میں فی الجملہ تشیع تھا، لیکن مضر نہیں۔ تمام مستند اور مفصل تاریخیں مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون، ابوالفدا وغیرہ ان ہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں، یہ کتاب بھی ناپید تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی۔

جو لوگ خاص فنِ سیرت کے ارکان اور معتمد ہیں، اُن کا اور اُن کی تصنیفات کا ایک مختصر نقشہ ہم اس مقام پر درج کرتے ہیں[1]۔

[1] ان مصنفین کی تصنیفات اکثر ناپید ہیں (یہ فہرست تہذیب التہذیب وغیرہ سے مرتب کی گئی ہے) ان کے نام لکھنے سے یہ غرض ہے کہ آج جو تصنیفیں ملتی ہیں ان میں اکثر ان کے حوالے آتے ہیں،

نام مصنف	سنہ وفات	حالات
عروہ بن زبیر	سنہ ٩٤ھ	حضرت زبیرؓ کے بیٹے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے، حضرت عائشہؓ کے آغوشِ تربیت میں پلے تھے، سیرت میں مغازی میں کثرت سے اُن کی روایتیں ہیں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے متعلق لکھا ہے کان عالماً بالسیرۃ، صاحب کشف الظنون نے مغازی کے بیان میں لکھا ہے کہ بعضوں کی رائے ہے کہ فنِ مغازی کی سب سے پہلی کتاب ان ہی نے تدوین کی۔
شعبی	سنہ ١٠٩ھ	مشہور محدث ہیں، اکثر فنون میں کمال رکھتے تھے، خلافتِ دمشق کی طرف سے سفیر بن کر قسطنطنیہ گئے تھے، فنِ مغازی و سیر میں ان کو اس درجہ واقفیت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ گو میں ان غزوات میں بذاتِ خود شریک تھا مگر یہ مجھ سے زیادہ ان حالات کو جانتے ہیں۔"
وہب بن منبہ	سنہ ١١٤ھ	یمن کے عجمی خاندان سے تھے، حضرت ابوہریرہؓ سے کچھ حدیثیں سُنی تھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کتبِ عہدِ قدیم کی بشارات اور پیشین گوئیاں کثرت سے انھی سے مروی ہیں۔
عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری	سنہ ١٢١ھ	مشہور تابعی ہیں، حضرت انسؓ اور اپنے باپ اور اپنی دادی رمیثہ سے روایت کرتے ہیں، مغازی اور سیر میں نہایت وسیع المعلومات تھے، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے مسجد دمشق میں بیٹھ کر اس فن کی تعلیم دیتے تھے۔
محمد بن مسلم بن شہاب زہری	سنہ ١٢٤ھ	اِن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔
یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس ابن شریق الثقفی	سنہ ١٢٨ھ	نہایت ثقہ تھے، عمال اور گورنر انتظام ملکی میں اُن سے مدد لیتے تھے، فقہائے مدینہ میں ان کا شمار تھا، سیرتِ نبویؐ کے عالم تھے، ان کا دادا اخنس بن شریق وہی شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔
موسیٰ بن عقبۃ الاسدی	سنہ ١٤١ھ	اُن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔
ہشام بن عروہ ابن زبیر	سنہ ١٤٦ھ	زیادہ تر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، زہری کے بھی شاگرد ہیں، علمائے مدینہ میں ان کا شمار ہے، بغداد میں جو روایتیں انھوں نے لیں، محدثین کا بیان ہے کہ ان میں تساہل سے کام لیا ہے، سیرت کے ذخیرۂ روایات میں ان کا بہت بڑا حصہ شامل ہے جن کو وہ اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ فنِ سیرت میں اُنکے متعدد نامور تلامذہ ہیں۔
محمد بن اسحٰق بن یسار المطلبی	سنہ ١٥٠ھ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

نام مصنف	سنہ وفات	حالات
معمر بن راشد الازدی	سنہ ١٥٢ھ	امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک کے بعد اُن کا دوسرا درجہ ہے، اساطینِ علمِ حدیث میں تھے، مغازی میں ایک کتاب اُن کی تصنیف ہے، جس کا نام ابن ندیم نے کتاب المغازی لکھا ہے۔
عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز الاوسی	سنہ ١٦٢ھ	زہری کے شاگرد تھے، مسلم نے اُن سے ایک روایت کی ہے، محدثین کے نزدیک ضعیف الروایت ہیں، فنِ سیرت کے عالم تھے، ابن سعد نے اُن کے متعلق لکھا ہے، کان عالماً بالسیرۃ۔
محمد بن صالح بن دینار التمار	سنہ ١٦٨ھ	زہری کے شاگرد اور واقدی کے استاد ہیں، ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ سیرت و مغازی کے عالم تھے، اکثر محدثین نے اُن کی توثیق کی ہے، ابوالزناد جو بڑے پایہ کے محدث ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح مغازی سیکھنا ہو تو محمد بن صالح سے سیکھو۔
ابومعشر نجیح المدنی	سنہ ١٧٠ھ	ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے، ثوری اور واقدی نے اُن سے روایت کی ہے گو محدثین نے روایتِ حدیث میں تضعیف کی ہے لیکن سیرت و مغازی میں اُن کی جلالتِ شان کا اعتراف کیا ہے، امام ابن حنبل کہتے ہیں کہ وہ اس فن میں صاحبِ نظر ہیں، ابن ندیم نے اُن کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے کتبِ سیرت میں اُن کا نام کثرت سے آتا ہے۔
عبداللہ بن جعفر ابن عبدالرحمٰن المخزومی	سنہ ١٧٠ھ	مشہور صحابی مسورؓ بن مخرمہ کے پڑپوتے تھے، فنِ حدیث میں خاص پایہ رکھتے تھے، سیرتِ نبویؐ کے اکابر علما میں تھے، ابنِ سعد نے ان کی شان میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ "من رجال اھل المدینۃ علماً بالمغازی"۔
عبدالملک بن محمد بن ابی بکر ابن عمرو بن حزم الانصاری		فنِ حدیث و سیر میں اُن کا خاندان ہمیشہ نامور رہا، اُن کے دادا وہ شخص ہیں جنھوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے سب سے پہلے فنِ حدیث کی تدوین کی، اُن کے رشتہ کی دادی عمرۃؒ حضرت عائشہؓ کی تربیت یافتہ تھیں یہ خود سیر و مغازی کے عالم تھے، اپنے باپ اور چچا سے تعلیم پائی تھی، خلیفہ ہارون الرشید نے اُن کو قاضی مقرر کیا تھا، لوگ اُن سے مغازی سیکھتے تھے۔ اس فن میں ان کی ایک تصنیف کتاب المغازی بھی ہے۔
علی بن مجاہد الرازی الکندی	بعد سنہ ١٨٠ھ	ابومعشر نجیح کے تلامذہ میں تھے، امام ابن حنبل نے ان سے روایت کی ہے مغازی کے جامع اور مصنف ہیں، لیکن اربابِ نقد کے نزدیک اُن کی تصنیف اعتبار کے قابل نہیں۔
زیاد بن عبداللہ ابن الطفیل البکائی	سنہ ١٨٣ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ابن ہشام کے استاد تھے، ان دونوں بزرگواروں کے واسطۂ العقد یہی ہیں، سیرت کے عشق میں گھر بار بیچ کر استاد کے ساتھ نکل

نام	سنہ وفات	کیفیت
		کھڑے ہوتے تھے اور مدت تک سفر و حضر میں ان کے شریک رہے محدثین کی بارگاہ میں گو ان کا اعزاز کم ہے لیکن کتاب السیرت کے سب سے معتبر راوی یہی سمجھے جاتے ہیں۔
سلمہ بن الفضل الابرش الانصاری	۱۹۱ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ان کی سیرت کے راوی ہیں، رے کے قاضی تھے اہلِ نقد کے نزدیک قابلِ احتجاج نہیں لیکن ابنِ معین جو اسمائے رجال کے بڑے ماہر ہیں، مغازی میں ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان کی سیرت کو بہترین سیر تہائے نبوی کہتے ہیں، طبری میں ان کے واسطہ سے اکثر روایتیں مروی ہیں
ابو محمد یحییٰ بن سعید ابن ابان الاموی	۱۹۴ھ	ہشام بن عروہ اور ابن جریج سے تلمذ تھا، ابن سعد نے لکھا ہے کہ گو قلیل الروایت ہیں، لیکن ثقہ ہیں، صاحب کشف الظنون نے مصنفین مغازی میں ان کا نام بھی لیا ہے۔
ولید بن مسلم القرشی	۱۹۵ھ	شام کے مشہور محدث اور نہایت قوی الحافظہ تھے، شام میں ان کے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا، تاریخ و مغازی میں وکیع سے ان کا درجہ بڑا سمجھا جاتا تھا، ان کی تصنیفات کی تعداد ستر ہے، جن میں ایک کتاب المغازی ہے، کتاب الفہرست میں اس کا ذکر موجود ہے۔
یونس بن بکیر	۱۹۹ھ	ہشام بن عروہ اور ابن اسحاق کے شاگرد ہیں، فن روایت و حدیث میں ان کا متوسط درجہ ہے، اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، علامہ ذہبی نے تذکرہ میں ان کا نام بہ لقب صاحب المغازی لیا ہے انھوں نے مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھا ہے (زرقانی مواہب جلد ۲ ص ۱۰)
محمد بن عمر الواقدی الاسلمی	۲۰۷ھ	سیرت نبوی کے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں، کتاب السیرۃ اور کتاب التاریخ والمغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے، کتب سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ ان ہی کی تصنیف ہیں، ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں۔
یعقوب بن ابراہیم الزہری	۲۰۸ھ	حضرت عبد الرحمنؓ بن عوف کی اولاد میں تھے، زہری اور ان کے تلامذہ کے شاگرد ہیں، مغازی میں ان کا یہ رتبہ تھا کہ ابن معین جیسا ناقد رجال ان سے اس فن کی تحصیل کرتا تھا۔
عبد الرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری	۲۱۱ھ	ثقات محدثین میں ان کا شمار ہے مزاج میں کسی قدر تشیع تھا، ابن معین کہتے ہیں کہ اگر عبد الرزاق مرتد بھی ہو جائیں تب بھی ہم ان سے روایت حدیث ترک

نام	سنہ وفات	کیفیت
		نہیں کر سکتے، آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی، اس لئے اس زمانہ کی حدیثیں ناقابلِ سند ہیں، فن مغازی میں ان کی ایک تالیف ہے۔
عبد الملک بن ہشام الحمیری	۲۱۸ یا ۲۱۳ھ	ان کا ذکر گزر چکا ہے۔
علی بن محمد المدائنی	۲۲۵ھ	ابو معشر نجیح اور سلمۃ بن الفضل وغیرہ کے شاگرد تھے، تاریخ و انساب عرب میں نہایت وسیع المعلومات تھے، محدثین میں ان کا شمار نہیں، لیکن مورخین کے امام ہیں، اغانی کے دفتر بے پایاں کا مخزن یہی ہیں، تاریخ و انساب میں ان کی کثرت سے تصنیفات ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ان کی کتاب نہایت مبسوط ہے اور ابن الندیم کے بیان کے مطابق ہر قسم کے متعدد اور متنوع عنوان قائم کئے ہیں۔
عمر بن شبۃ البصری	۲۶۲ھ	حدیث، تاریخ، ادب، لغت، شاعری اور نحو کے امام ہیں، مکہ مبارکہ، مدینہ طیبہ اور بصرہ کی تاریخیں لکھی ہیں، علم سیر میں نہایت بلند پایہ تھے، حدیث میں ابن ماجہ اور تاریخ میں بلاذری اور ابو نعیم ان کے شاگرد تھے۔
محمد بن عیسیٰ ترمذی	۲۷۹ھ	مشہور محدث ہیں جن کی کتاب صحاح ستہ میں تیسرا درجہ رکھتی ہے، سیرت نبوی میں ان کا خاص رسالہ ہے، جس کا موضوع گزشتہ تصانیف سے الگ ہے، اس رسالہ کا نام کتاب الشمائل ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی حالات و عادات و اخلاق کا ذکر ہے، اس بات کا التزام کیا ہے کہ تمام روایتیں معتبر اور صحیح ہوں، اس رسالہ پر متعدد علماء نے شروح و حواشی لکھے۔
ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم	۲۸۵ھ	محدثین کبار میں شمار ہے، مسند صحابہؓ ان کی تالیف ہے جس کے آخر میں کتاب المغازی شامل ہے۔
ابوبکر احمد بن ابی خیثمہ البغدادی	۲۹۹ھ	حدیث میں ابن حنبل اور ابن معین کے شاگرد اور تاریخ و سیر کے جلیل القدر عالم تھے، تاریخ کبیر ان کی تصنیف ہے جس میں سیرت نبوی کا حصہ بھی شامل ہے
محمد بن عائذ دمشقی		ان کی مغازی معتبر خیال کی جاتی ہے، حافظ ابن حجر وغیرہ اکثر اس کے حوالے دیتے ہیں۔

یہ قدماء کی تصنیفات تھیں، ما بعد کی تصنیفات کا ہم ایک مختصر نقشہ ذیل میں درج کرتے ہیں، یہ تصنیفات قدیم تصنیفات اور احادیث کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، اس نقشہ میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے جو قدماء کی تصنیفات کے متعلق شرح کے طور پر لکھی گئی ہیں، ان کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ فی نفسہ مستقل تصنیفات تھیں اور ان میں جس قدر ذخیرۂ معلومات ہے خود اصل کتابوں میں نہیں۔

روض الأنف :- سیرت ابن اسحاق کی شرح ہے، مصنف کا نام عبدالرحمٰن سہیلی ہے، جنھوں نے ۵۸۱ھ میں وفات پائی، یہ اکابر محدثین میں سے ہیں اور تمام مصنفینِ مابعد سیرت نبوی کی تحقیقات اور معلومات کے متعلق اُن کے خوشہ چیں ہیں، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب ۱۲۰ کتابوں کی مدد سے لکھی، اس کا قلمی نسخہ ہمارے استعمال میں ہے۔

سیرت دمیاطی :- حافظ عبدالمومن دمیاطی المتوفی ۷۰۵ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں، اس کتاب کا نام المختصر فی سیرت سید البشر ہے، قریباً سو صفحوں میں ہے، پٹنہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

سیرتِ خلاطی :- علاء الدین علی بن محمد خلاطی حنفی کی تصنیف ہے، ۷۰۸ھ میں وفات پائی۔

سیرتِ گازرونی :- شیخ ظہیر الدین علی بن محمد گازرونی المتوفی ۶۹۴ھ کی تصنیف ہے۔

سیرت ابن ابی طے :- مصنف کا نام یحییٰ بن حمیدۃ المتوفی ۶۳۰ھ ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔

سیرت مغلطائی :- مشہور کتاب ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے، علامہ عینی نے اس کے ایک حصہ کی شرح لکھی ہے، جس کا نام کشف اللثام ہے۔

شرفُ المصطفیٰ :- حافظ ابو سعید عبدالملک نیشاپوری کی تصنیف ہے، آٹھ جلدوں میں ہے، حافظ ابنِ حجر اصابہ میں اکثر اس کا حوالہ دیتے ہیں لیکن جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں، اُن میں بعض نہایت مہمل اور لغو روایتیں ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ مصنف نے رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی ہے۔

شرفِ المصطفیٰ :- للحافظ ابن الجوزی۔

الکتفاء فی مغازی المصطفیٰ والخلفاء الثلاثۃ، حافظ ابو الربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی المتوفی ۶۳۴ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اُس کے حوالے آتے ہیں۔

سیرت ابن عبدُالبر :- ابن عبدالبر مشہور محدث اور امام ہیں، اس کتاب کے حوالے اکثر آتے ہیں۔

عُیونُ الاثر :- ابن سیدالناس کی تصنیف ہے، ابن سیدالناس اندلس کے مشہور عالم ہیں، ۷۳۴ھ میں وفات پائی، یہ کتاب نہایت متین اور جامع ہے، معتبر کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے اور جس سے جو کچھ نقل کیا ہے سند بھی نقل کی ہے، اس کا قلمی نسخہ (جلد دوم) کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے اور ہمارے پیشِ نظر ہے۔

نور النبراس، فی سیرت ابن سیدالناس عیون الاثر کی شرح ہے، مصنف کا نام ابراہیم ابن محمد ہے، یہ کتاب نہایت محققانہ لکھی گئی ہے، اور بے شمار معلومات کا گنجینہ ہے، دو ضخیم جلدوں میں ہے اور ندوہ کے کتب خانہ میں اس کا نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے۔

سیرتِ منظوم :- حافظ زین الدین عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے نظم میں لکھی ہے، لیکن دیباچہ

---

[1] بمبئی کے کتب خانہ جامع مسجد میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے [2] ان تمام کتابوں کا ذکر کشف الظنون میں سیرت کے عنوان سے ہے۔

میں خود لکھ دیا ہے کہ اس میں رطب و یابس سب کچھ ہے۔

مواہب لُدنیہ :- مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے، اس کے مصنف قسطلانی ہیں جو بخاری کے مشہور شارح ہیں، حافظ ابن حجر کے ہم مرتبہ تھے، یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے، لیکن ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں۔

زرقانی علی المواہب :- یہ مواہب لدنیہ کی شرح ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی، آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے۔

سیرت حلبی :- مشہور اور متداول ہے۔

صحت ماخذ سیرتِ نبوی کے واقعات جو قلم بند کئے گئے، وہ تقریباً نبوت کے سو برس کے بعد قلم بند ہوئے اس لئے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی، بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں۔

اس قسم کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے، یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلم بند کئے جاتے ہیں، تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں، جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریکِ واقعہ تھا، اور اگر خود نہ تھا تو شریکِ واقعہ تک تمام راویوں کا نام بترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بین؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا، سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، اُن کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے، ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے، اُن تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر[1] کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر اسپرنگر جرمن کے مشہور عربی دان فاضل ہیں مدت تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں کام کیا، اصابہ کا نسخہ ان ہی کی تصحیح سے کلکتہ میں چھپا، اسی کتاب کے دیباچہ میں صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہ کی، بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔

اس سلسلہ میں سیکڑوں تصنیفات تیار ہوئیں، جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے۔

سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح و تعدیل میں یحیی بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی، وہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ "میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا" ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا، اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں، جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

نام مصنف	کیفیت
رجال عقیلی	خاص ضعیف الروایۃ لوگوں کے حال میں ہے۔
رجال احمد بن عبد العجلی المتوفی ۲۶۱ھ	اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے۔
رجال امام عبدالرحمن بن حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ	بہت ضخیم کتاب ہے۔
رجال امام دار قطنی	مشہور محدث ہیں، یہ کتاب خاص ضعیف الروایۃ اشخاص کے حال میں ہے۔
کامل ابن عدی	اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔

یہ کتابیں قریباً آج ناپید ہیں، لیکن بعد کی تصنیفات جو انہی سے ماخوذ ہیں، آج بھی موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جامع اور مستند کتاب تہذیب الکمال ہے جو علامہ مزی (ابو یوسف بن الزکی) کی تصنیف ہے جنھوں نے ۷۴۲ھ میں وفات پائی، علاء الدین مغلطائی المتوفی ۷۶۲ھ نے تیرہ جلدوں میں اس کا تکملہ لکھا، علامہ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے اس کا اختصار کیا، اور بہت سے محدثین نے اس کے خلاصے اور ذیل لکھے اور بالآخر حافظ ابن حجر نے ان تمام تصنیفات سے ایک نہایت ضخیم کتاب "تہذیب التہذیب" لکھی، جو بارہ جلدوں میں ہے اور آج کل حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف نے کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ اس کی تصنیف میں آٹھ برس صرف ہوتے ہیں، اس سلسلہ کی ایک اور سب سے زیادہ متداول اور مستند کتاب "میزان الاعتدال" ہے جو علامہ ذہبی کی تصنیف ہے، حافظ ابن حجر نے اس کتاب پر اضافہ کیا، جس کا نام لسان المیزان ہے۔

اسماء الرجال کی کتابوں میں سے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب، تاریخ کبیر بخاری، تاریخ صغیر بخاری، ثقات ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، مشتبہ النسبہ ذہبی، انساب سمعانی تہذیب الاسماء ہماری نظر سے گزری ہیں۔

اس اصول تحقیق کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کر دی تھی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا (حجرات-۱)

مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کر لو۔

حدیث ذیل بھی اسی کو موید ہے۔

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔

آدمی کے جھوٹے ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ جو کچھ سنے روایت کر دے۔

تحقیق واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں؟

درایت کی ابتداء

یہ اصول بھی درحقیقت قرآن مجید ہی نے قائم کر دیا تھا، حضرت عائشہؓ پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہؓ تک مغالطہ میں آ گئے، چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت حسانؓ بھی قاذفین میں شریک تھے، اور اسی بنا پر حد قذف جاری کی گئی، قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ (نور-۲)

جن لوگوں نے تہمت لگائی وہ تمہارے گروہ میں سے ہیں۔

تفسیر جلالین میں منکم کی تفسیر حسب ذیل کی ہے۔

جماعة من المومنين۔

یعنی یہ تہمت لگانے والے مسلمانوں کا ایک گروہ ہے۔

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہؓ کی برأت اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئیں، ان میں سے ایک یہ ہے

وَلَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ (نور-۲)

اور جب تم نے سنا تو یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات بولنا مناسب نہیں، سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے۔

عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کئے جاتے، پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایۃ ہیں یا نہیں؟ پھر ان کی شہادت لی جاتی، لیکن خدا نے اس آیت میں فرمایا کہ سننے کے ساتھ تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بہتان ہے۔

اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلاف قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے، قطعاً سمجھ لینا چاہئے کہ غلط ہے۔

اس طرز تحقیق یعنی درایت کی ابتداء خود صحابہؓ کے عہد میں ہو چکی تھی۔

فقہاء میں بعض اس بات کے قائل ہیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے جب اس مسئلہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا تو (حضرت) عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ اگر یہ صحیح ہو تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا جو آگ پر گرم کیا گیا ہو،[1] حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ابوہریرہؓ کو ضعیف الروایۃ نہیں سمجھتے تھے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف تھی، اس لئے انھوں نے تسلیم نہیں کی اور یہ خیال کیا کہ سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہو گی۔

جب حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے، جن میں سے بعض یہ ہیں۔

---

[1] صحیح ترمذی باب الوضوء۔

قال ابن الجوزی وکل حدیث رأیته یخالف العقول او یناقض الاصول فاعلم انه موضوع فلا یتکلف اعتباره ای لا تعتبر روایة ولا تنظر فی جرحهم او یکون مما یدفع الحس والمشاهدة او مباینا للنص الکتاب والسنة المتواترة او الاجماع القطعی حیث لا یقبل شیئ من ذلک التاویل او یتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر وبالوعد العظیم علی الفعل الیسیر وھذا الاخیر کثیر موجود فی حدیث القصاص والطرقیة ومن رکة المعنی لا تاکلوا القرعة حتی تذبحوھا ولذا جعل بعضھم ذلک دلیلا علی کذب الراوی وکل ھذا من القرائن فی المروی وقد تکون فی الراوی کقصة غیاث مع المھدی... او انفراده عمن لم یدرکه بما لم یوجد عند غیرھما او انفراده بشیئ مع کونه مما یلزم المکلفین علمه وقطع العذر فیه کما قرره الخطیب فی اول الکفایة او بامر جسیم یتوفر الدواعی علی نقله کحصر عدو الحاج عن البیت۔[1]

ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصول مسلم کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ موضوع ہے اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر، اسی طرح سے وہ حدیث قابل اعتبار نہیں جو محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو یا نص کتاب اور سنت متواترہ اور اجماع قطعی کے خلاف ہو اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو یا وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہو اس قسم کی حدیثیں واعظوں اور سوقیوں کے ہاں بہت پائی جاتی ہیں، یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے مثلاً یہ حدیث کہ کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ اس لئے بعض محدثین نے لغویت کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق ہیں اور کبھی یہ قرائن راوی کے متعلق ہوتے ہیں، مثلاً غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ... یا جب کہ راوی کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو اور کسی نے نہ بیان کی ہو اور خود راوی جس سے روایت کرتا ہے اس سے ملا تک نہ ہو یا وہ حدیث جس کو ایک ہی راوی بیان کرتا ہے حالانکہ بات ایسی ہے کہ اس سے اوروں کو بھی مطلع ہونا ضرور تھا جیسا کہ خطیب بغدادی نے کتاب الکفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے یا وہ روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا ذکر ہے اگر وہ واقع ہوا ہوتا تو سینکڑوں آدمی اس کو بیان کرتے مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے حاجیوں کو کعبہ کے حج سے روک دیا۔

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں۔

(۱) جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

(۲) جو روایت اصول مسلّمہ کے خلاف ہو۔

(۳) محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

---

[1] فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۱۴، افسوس یہ ہے کہ یہ کتاب نہایت غلط چھپی ہے اس لئے بعض عبارتیں ہم نے اسی نسخہ کے موافق نقل کی ہیں، یہ اصول خود ابن جوزی کے قائم کردہ نہیں ہیں، بلکہ ابن جوزی نے محدثین کے اصول کو نقل کر دیا ہے۔

(۴) قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو، اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔

(۵) جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

(۶) معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

(۷) وہ روایت رکیک المعنی ہو، مثلاً کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ۔

(۸) جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی، اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

(۹) جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو، با ایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

(۱۰) جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہو۔

ملا علی قاری نے جو موضوعات کے خاتمہ میں حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں، ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

(۱) جس حدیث میں فضول باتیں ہوں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہیں نکل سکتیں، مثلاً یہ کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرتا ہے جس کے ستر زبانیں ہوتی ہیں، ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں۔

(۲) وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو، مثلاً یہ حدیث کہ "بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے"۔

(۳) وہ حدیث جو صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

(۴) جو حدیث واقع کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے۔

(۵) وہ حدیث جو انبیاء علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو مثلاً یہ حدیث کہ "تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آب رواں، خوبصورت چہرہ کا دیکھنا"۔

(۶) وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیشین گوئی بقید تاریخ مذکور ہوتی ہے مثلاً یہ کہ "فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا"۔

(۷) وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے مشابہ ہیں، مثلاً یہ کہ "ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے۔ یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے"۔

(۸) وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں مثلاً "عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا"۔

(۹) وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو، مثلاً "دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے"۔ کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کے آنے میں اس قدر دیر ہے، حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

(۱۰) وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔
(۱۱) جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔
(۱۲) وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں۔ حالانکہ یہ حدیثیں تفسیر بیضاوی اور کشاف وغیرہ میں منقول ہیں۔

ان اصول سے محدثین نے اکثر جگہ کام لیا اور اُن کی بناء پر بہت سی روایتیں رد کر دیں، مثلاً ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کر دیا تھا اور معافی کی دستاویز لکھوا دی تھی: ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ روایت مختلف وجوہ سے باطل ہے۔

(۱) اس معاہدہ پر سعد بن معاذؓ کی گواہی بیان کی جاتی ہے حالانکہ وہ غزوۂ خندق میں وفات پا چکے تھے۔
(۲) دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے حالانکہ وہ فتح مکہ میں اسلام لائے۔
(۳) اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا، جزیہ کا حکم قرآن مجید میں جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے۔
(۴) دستاویز میں تحریر ہے کہ یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔
(۵) خیبر والوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی، اُن سے جزیہ کیوں معاف کیا جاتا۔
(۶) عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا، حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی، تو خیبر والے کیونکر معاف ہو سکتے تھے۔
(۷) اگر جزیہ ان کو معاف کر دیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسلام کے ہوا خواہ اور دوست اور واجب الرعایۃ ہیں، حالانکہ چند روز کے بعد خارج البلد کر دیئے گئے۔

تبصرہ

سیرت کی یہ ایک اجمالی اور سادہ تاریخ تھی، اب ہم اس پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱- سیرت پر اگرچہ آج بھی سینکڑوں تصنیفیں موجود ہیں، لیکن سب کا سلسلہ جا کر صرف تین چار کتابوں پر منتہی ہوتا ہے، سیرت ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد طبری، ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں، وہ ان سے متاخر ہیں اور ان میں جو واقعات مذکور ہیں، زیادہ تر انہی کتابوں سے لئے گئے ہیں (کتب حدیث کا جو ٹکڑا ہے اس سے اس مقام پر بحث نہیں)، اس بناء پر ہم کو مذکورہ بالا کتابوں پر زیادہ تفصیل اور تدقیق سے نظر ڈالنی چاہیئے۔

ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے، محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے، اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑے سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلم بند نہیں کر سکتا۔

واقدی کے سوا باقی اور تینوں مصنفین اعتبار کے قابل ہیں، ابن اسحاق کی نسبت اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے جرح کی ہے، تاہم اُن کا یہ رتبہ ہے کہ امام بخاری اپنے رسالہ "جزء القراۃ" میں ان کی سند سے روایتیں نقل کرتے ہیں اور اُن کو صحیح سمجھتے ہیں، ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ خود شریک واقعہ نہیں، اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور، اور راویوں کے ذریعہ سے بیان کرتے ہیں، لیکن اُن کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں، اس کے علاوہ ابن اسحاق کی اصل کتاب (ہندوستان میں) موجود نہیں، ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا، وہی آج موجود ہے لیکن ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو زیاد بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص ہیں، تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر ہیں۔ ابن مدینی (امام بخاری کے استاد)، کہتے ہیں کہ "وہ ضعیف ہے اور میں نے اس کو ترک کر دیا" ابوحاتم کہتے ہیں "وہ استناد کے قابل نہیں" نسائی کہتے ہیں، "وہ ضعیف ہے"۔

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اس لئے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے۔ باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ۔

طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمۃ ابرش، ابن سلمۃ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں۔

اس بناء پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ کتب حدیث کا ہم پلہ نہیں، البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے، وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔

سیرت کی کتابوں کی کم پائیگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کر دی گئی یعنی وہ روایتیں تنقید کی زیادہ محتاج ہیں جن سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، باقی جو روایتیں سیرت اور فضائل وغیرہ سے متعلق ہیں، ان میں تشدد اور احتیاط کی چنداں حاجت نہیں، حافظ زین الدین عراقی جو بہت بڑے پایہ کے محدث ہیں، سیرت منظوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ما صح وما قد انکرا	طالب کو جاننا چاہیئے کہ سیرت میں سبھی طرح کی روایتیں ہوتی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔

یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شائع ہو گئیں اور بڑے بڑے علماء نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کا درج کرنا جائز رکھا، علامہ ابن تیمیہ کتاب التوسل میں لکھتے ہیں۔

قد رواہ من صنف فی عمل یوم ولیلۃ کابن السنی وابی نعیم وفی مثل ھذہ الکتب احادیث کثیرۃ موضوعۃ لا یجوز الاعتماد علیھا فی الشریعۃ باتفاق العلماء۔	اس حدیث کو ان لوگوں نے روایت کیا ہے جنھوں نے رات دن کے اعمال میں کتابیں تصنیف کی ہیں مثلاً ابن السنی اور ابونعیم اور اس قسم کی کتابوں میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں، جن پر اعتماد کرنا ناجائز ہے اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو انھوں نے کہا، اے خدا میں تجھ کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دے" خدا نے کہا، تم نے محمد کو کیونکر جانا؟ حضرت آدمؑ نے کہا "میں نے سر اٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، اس سے میں نے قیاس کیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے وہ دنیا اور تجھ کو محبوب ترین خلق ہوگا" خدا نے کہا "آدم! تم نے سچ کہا، اور محمد نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا بھی نہ کرتا"، حاکم نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، علامہ ابن تیمیہؒ حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

واما تصحيح الحاكم لمثل هذا الحديث و امثاله فهذا مما انكره عليه ائمة العلم بالحديث وقالوا ان الحاكم يصحح احاديث وهي موضوعة مكذوبة عند اهل المعرفة بالحديث ... وكذالك احاديث كثيرة في مستدركه يصححها وهي عند ائمة أهل العلم بالحديث موضوعة

حاکم کا اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنا ائمہ حدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حاکم بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں، اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بہت سی حدیثیں ہیں جن کو حاکم نے صحیح کہا ہے حالانکہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہیں۔

علامہ موصوف ایک موقع پر ابو الشیخ اصفہانی کی کتاب کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں (ص ۱۰۵ و ۱۰۶)

وفيها احاديث كثيرة قوية صحيحة وحسنة واحاديث كثيرة ضعيفة موضوعة واهية وكذالك ما يرويه خيثمة بن سليمان في فضائل الصحابة وما يرويه ابو نعيم الاصبهاني فضائل الخلفاء في كتاب مفرد في اول حلية الاولياء .. وما يرويه ابوبكر الخطيب وابو الفضل بن ناصر وابو موسى المديني وابو القاسم بن عساكر والحافظ عبد الغني وامثالهم ممن له معرفة بالحديث۔

اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں، جو قوی ہیں، اور حسن ہیں اور بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل ہیں اور اسی طرح وہ حدیثیں جو خیثمہ بن سلیمان صحابہؓ کے فضائل میں روایت کرتے ہیں اور وہ حدیثیں جو ابو نعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب میں خلفاء کے فضائل میں روایت کی ہیں اور حلیۃ الاولیاء کے اول میں اور اسی طرح وہ روایتیں جو ابوبکر خطیب اور ابو الفضل اور ابو موسیٰ مدینی اور ابن عساکر اور حافظ عبد الغنی وغیرہ اور ان کے پایہ کے لوگ روایت کرتے ہیں۔

غور کرو، ابو نعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبد الغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے باوجود اس کے یہ لوگ خلفاء اور صحابہؓ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال و حرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے اور ان

لے کتاب التوسل مطبوعہ المنار ص ۱۰۰، نیز تذکرۃ [illegible]

کے سوا اور روایتوں میں سلسلۂ سند نقل کر دینا کافی ہے، تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔

موضوعات مُلا علی قاری میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ قیامت کے دن خدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا، امام ابن جریر طبری نے سُنا تو بہت برہم ہوئے، اور اپنے دروازہ پر یہ فقرہ لکھ کر لگا دیا کہ "خدا کا کوئی ہم نشین نہیں"، اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے اور امام موصوف کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں۔

اس موقع پر ایک خاص نکتہ لحاظ کے قابل ہے، یہ مسلّم ہے کہ حدیث اور روایت میں امام بخاری اور مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں پیدا ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی اس کے لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے، باوجود اس کے فضائل و مناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابو نعیم، بزاز، طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، بخاری اور مسلم میں ان کا پتہ نہیں لگتا، بلکہ اس قسم کی حدیثیں جو نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق و تنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے، مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں، مثلاً یہ روایت کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالم وجود میں آئے تو ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑے، آتش فارس بجھ گئی، بحیرۂ طبریہ خشک ہو گیا، بیہقی، ابو نعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر نے روایت کی ہے، لیکن صحیح بخاری اور مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں (طبرانی، بیہقی، ابو نعیم وغیرہ) سے ماخوذ ہیں اس لئے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہوگئیں اور اسی بنا پر محدثین کو کہنا پڑا کہ سِیَر میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں محدثین نے جو اصول قرار دیے ہیں، سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظر انداز کر دیے، محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں مذکور ہیں اکثر منقطع ہیں، صحابہؓ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت روایت کے قابل ہو، سب سے معمر حضرت ابوبکرؓ ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دو برس کم تھے، اسی بناء پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں، ان میں سے اکثر متصل نہیں، اور اسی بناء پر بہت دور از کار روایتیں پھیل گئیں، مثلاً ابو نعیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی زبانی روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو بہت سے پرند آکر مکان میں بھر گئے، جن کی زمرد کی منقار اور یاقوت کے پر تھے، پھر ایک سفید بادل آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لے گیا، اور ندا آئی کہ اس بچہ کو مشرق و مغرب اور تمام دریاؤں کی سیر کراؤ کہ سب لوگ پہچان لیں۔ مغازی کا بڑا حصہ امام زہری سے منقول ہے، لیکن اُن کی اکثر روایتیں جو سیرت ابن ہشام اور طبقات

لے موضوعات ملا علی قاری ص ۴۲ مطبوعہ دہلی۔ لے مواہب لدنیہ میں یہ روایت نقل کی ہے اس میں پہلے سلسلہ مبالغہ آمیز باتیں ہیں میں نے معمولی ٹکڑا نقل کر دیا ہے۔

ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہیں، منقطع ہیں

۲۔ نہایت تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جن بڑے بڑے نامور مصنفین مثلاً امام طبری وغیرہ نے سیرت پر جو کچھ لکھا اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا۔

بعض واقعات نہایت اہم ہیں، اُن کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسے مفید معلومات موجود ہیں، جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے، لیکن سیرت اور تاریخ میں ان معلومات کا ذکر نہیں، مثلاً یہ امر کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو لڑائی کی سلسلہ جنبانی کس کی طرف سے شروع ہوئی؟ ایک بحث طلب واقعہ ہے، تمام ارباب سیر اور مورخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا کی لیکن سنن ابی داؤد میں صاف، اور صریح حدیث موجود ہے کہ جنگ بدر سے پہلے کفار مکہ نے عبداللہ بن اُبی کو یہ خط لکھا کہ تم نے محمد کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے، اُن کو نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمد دونوں کا استیصال کر دیں گے۔[1] سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں۔

مصنفین سیرت میں سے بعض لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا اور جب احادیث کی زیادہ چھان بین کی تو ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں صحیح حدیثوں کے خلاف درج ہو گئی ہیں، لیکن چونکہ اُن کی تصنیف پھیل چکی تھی، اس لئے اُس کی اصلاح نہ ہو سکی، حافظ ابن حجر ایک موقع پر دمیاطی کا ایک قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ودل هذا على انه كان يعتقد الرجوع عن كثير مما وافق فيه اهل السير وخالف الاحاديث الصحيحة وان ذلك كان منه قبل تضلعه منها ولخروج نسخ كتابه وانتشاره لم يتمكن من تغييره۔

یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اکثر واقعات جن میں دمیاطی نے اہل سیر کی موافقت اور صحیح حدیثوں کی مخالفت کی تھی، اپنی رائے سے رجوع کیا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے پھیل گئے تھے، اس لئے اس کی اصلاح نہ کر سکے۔[2]

۳۔ سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھیں، اُن سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں، انہی کے نام سے کیں، اُن کے مستند ہونے کی بناء پر لوگوں نے ان تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا، اور چونکہ اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آسکتی تھیں، اس لئے لوگ راویوں کا پتہ نہ لگا سکے، اور رفتہ رفتہ یہ روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہو گئیں، اس تدلیس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مثلاً جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں، لیکن ان ہی روایتوں کو جب ابن سعد کے نام سے نقل کر دیا جاتا ہے تو لوگ ان کو معتبر سمجھتے ہیں، حالانکہ ابن سعد کی اصل کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں۔

۴۔ روایت کے متعلق جو اصول منضبط ہوئے صحابہؓ کے متعلق اُن سے بعض بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا، مثلاً اصول روایت کی رو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں، کوئی راوی نہایت ضابط، نہایت معنی فہم

[1] غزوہ بدر کے موقع پر ہم اس حدیث کے اصلی الفاظ نقل کریں گے [2] زرقانی جلد ۳ ص ۱۱۔

نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے، کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں، کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں، یہ فرق مراتب جس طرح فطرۃً عام راویوں میں پایا جاتا ہے، صحابہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر جو تنقیدیں کیں، اور جن کا ذکر اوپر گزر چکا اسی بنا پر کیں۔

اختلاف مراتب کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکۃ الآرا مسائل کی بنیاد قائم ہے مثلاً دو روایتوں میں تعارض پیش آجاتے، تو اس بحث کے فیصلہ میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک روایت کے راویوں کا دوسری روایت کے راویوں سے عالی رتبہ ہونا ثابت کر دیا جائے (گو دونوں راوی ثقہ ہیں)، اور یہ اُس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا، لیکن صحابہؓ میں آکر یہ اصول بیکار ہو جاتا ہے، فرض کرو ایک روایت صرف حضرت عمرؓ ہی سے مروی ہے اور دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے، جس نے عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تھا، تو اب دونوں روایتوں کا رتبہ برابر ہو جاتا ہے، علامہ مازری مشہور محدث ہیں، علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں اکثر اُن سے استناد کرتے ہیں، انھوں نے اس تعمیم کی مخالفت کی تھی، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ کے دیباچہ (ص ۱۰ و ۱۱) میں اُن کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لسنا نعني بقولنا الصحابة عدول كل من راه صلى الله عليه وسلم يوماً ما او زاره لماماً او اجتمع به لغرض وانصرف عن كثب وانما نعني به الذين لازموه وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذي انزل معه اولئك هم المفلحون۔

یہ مقولہ کہ صحابہ سب عادل ہیں ہم اس سے ہر ایسے شخص کو مراد نہیں لیتے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتفاقاً دیکھ لیا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی غرض کے لئے ملا، اور پھر فوراً واپس چلا گیا، بلکہ ہم ان لوگوں کو مراد لیتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بالتزام رہے اور آپ کی اعانت و مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، یہی لوگ کامیاب ہیں۔

لیکن محدثین نے مازری کے اس قول سے عام مخالفت کی، علامہ مازری نے بے شبہ یہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو مطلقاً مقربین صحابہؓ سے مخصوص کر دیا، اس بنا پر محدثین کی مخالفت اُن سے بے جا نہیں، لیکن اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ کی روایتیں ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں، خصوصاً اُن روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔

۵۔ ارباب سیر اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے، نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل ہے، یورپین مورخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلہ معلومات پیدا کرتا ہے، اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے، وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتا ہے، تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں، بخلاف اس کے اسلامی مورخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرف داری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے، اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب پر، معتقدات پر،

اور تاریخ پر کیا پڑے گا، اس کا قبلۂ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

لیکن اس میں حد سے زیادہ تفریط ہو گئی، اس بات سے بچنے کے لئے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں، وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا اور ہر واقعہ کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے مثلاً اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں، لیکن اس کے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے، جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور اُن کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں، اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں گئیں، وہ پہلے سے آمادۂ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

۶- یہ لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے، مثلاً ایک راوی جو ثقہ ہے ایک ایسا معمولی واقعہ بیان کرتا ہے جو عموماً پیش آتا ہے اور پیش آسکتا ہے تو بے تکلف یہ روایت تسلیم کر لی جائے گی، لیکن فرض کرو، وہی راوی ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو غیر معمولی ہے، تجربۂ عام کے خلاف ہے، گرد و پیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا، تو واقعہ چونکہ زیادہ محتاجِ ثبوت ہے، اس لئے اب راوی کا معمولی درجۂ وثوق کافی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کو معمولی درجہ سے زیادہ عادل زیادہ محتاط، زیادہ نکتہ دان ہونا چاہیئے۔

مثلاً ایک بحث یہ ہے کہ روایت کرنے کے لئے کسی عمر کی قید ہے یا نہیں؟ اکثر محدثین کا مذہب ہے کہ ۵ برس کا لڑکا حدیث کی روایت کر سکتا ہے یا مثلاً اگر کسی صحابی نے ۵ برس کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کی روایت کی تو قابلِ اعتبار ہو گی، محدثین کا اس پر استدلال ہے کہ محمودؓ بن الربیع ایک صحابی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات فرمانے کے وقت وہ پانچ برس کے بچے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اظہار محبت کے طور پر اُن کے منہ پر کلی کا پانی ڈال دیا تھا، اس واقعہ کو انھوں نے جوان ہو کر لوگوں سے بیان کیا، اور سب نے یہ روایت قبول کی، اس سے ثابت ہوا کہ ۵ برس کی عمر کی روایت قبول ہو سکتی ہے[1]۔

اس کے برخلاف بعض محدثین کی رائے ہے کہ کم سن کی روایت قابلِ حجت نہیں، فتح المغیث میں ہے:

ولکن قد منع قوم القبول ھنا ای فی مسئلۃ الصبی خاصۃ فلم یقبلوا من تحمل قبل البلوغ لان الصبی مظنۃ عدم الضبط

لیکن ایک جماعت یہاں قبولِ روایت سے منع کرتی ہے خصوصاً بچوں کی روایت کے مسئلہ میں، بلوغ سے پہلے جو روایت کسی بچہ نے سنی ہو، اس کو وہ قبول نہیں

[1] یہ پوری بحث فتح المغیث ص ۱۶۶ تا ۱۶۸ میں ہے۔

وھو وجہ للشافعیۃ .... وکذا کان ابن المبارک یتوقف فی تحدیث الصبی۔

(کتاب مذکور ص ۱۶۴)

کرتی، شوافع کی بھی رائے ہے، اسی طرح عبداللہ ابن مبارک بھی بچہ کی حدیث روایت کرنے میں توقف کرتے ہیں۔

لیکن اثبات و نفی، دونوں پہلو بحث طلب ہیں، بے شبہ ۵ برس کا بچہ اگر یہ واقعہ بیان کرے کہ میں نے فلاں شخص کو دیکھا تھا، اس کے سر پر بال تھے یا وہ بوڑھا تھا یا اُس نے مجھ کو گودیوں میں کھلایا تھا تو اس روایت میں شبہ کرنے کی وجہ نہیں، لیکن فرض کرو وہی بچہ یہ بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص نے فقہ کا یہ دقیق مسئلہ بتایا تھا، تو شبہ ہو گا کہ بچہ نے صحیح طور سے مسئلہ کو سمجھا بھی تھا یا نہیں؟

فقہا نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے، فتح المغیث میں شرح مہذب سے نقل کیا ہے۔

قبول اخبار الصبی الممیز فیما طریقہ المشاھدۃ بخلاف ما طریقہ النقل کالافتاء و روایۃ الاخبار و نحوہ (نسخہ مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۲۲)

باتمیز لڑکے کی روایت ان واقعات کے متعلق جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں مقبول ہے لیکن جو باتیں نقلیات میں داخل ہیں مثلاً فتوٰی یا حدیث کی روایت ان میں ان کی روایت مقبول نہیں۔

لیکن عام طور سے یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا، فتح المغیث میں ہے۔

ثم الضبط نوعان ظاھر و باطن فالظاھر ضبط معناہ من حیث اللغۃ، والباطن ضبط معناہ من حیث تعلق الحکم الشرعی بہ و ھو الفقہ و مطلق الضبط الذی ھو شرط فی الراوی ھو الضبط ظاھرا عند الاکثر لانہ یجوز نقل الخبر بالمعنی فیلحقہ تھمۃ تبدیل المعنی بروایتہ قبل الحفظ او قبل العلم حین سمع و لھذا المعنی قلت الروایۃ عن اکثر الصحابۃ لتعذر ھذا المعنی قال وھذا الشرط و ان کان علی ما بینا فان اصحاب الحدیث قل ما یعتبرونہ فی حق الطفل دون المغفل فانہ متی صح عندھم سماع الطفل او حضورہ اجازوا روایتہ (ص ۱۲۱)

پھر ضبط[1] کی دو قسمیں ہیں، ظاہری اور باطنی، ظاہری کے یہ معنی ہیں کہ لفظ کے لغوی معنی کا لحاظ رکھا جائے، باطنی کے یہ معنی کہ شرعی حکم جس بنا پر متعلق ہے، اس کا لحاظ رکھا جائے اس کو فقہ کہتے ہیں، لیکن مطلقاً جو ضبط راوی کے لئے مشروط ہے اکثروں کے نزدیک وہ صرف ظاہری ضبط ہے، کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے، اسی بنا پر سنتے وقت قلتِ حفظ یا قلت علم کے سبب سے روایت کے ادا کرنے میں راوی پر مفہوم کے بدل دینے کا شبہ ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر صحابہؓ نے بہت کم حدیثیں روایت کیں کیونکہ مفہوم کا بعینہٖ روایت میں قائم رکھنا مشکل ہے لیکن محدثین بچہ کے حق میں کم بے عقل کے حق میں نہیں اس کا اعتبار کرتے بلکہ بچہ اُن کے نزدیک جب سننے اور مجلس میں شریک ہونے کے قابل ہو گیا تو اس کی روایت کو جائز سمجھتے ہیں۔

[1] ضبط کا لفظ محدثین کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں کسی روایت کے الفاظ اور مطلب کو اچھی طرح سمجھنا اور ادا کرنا۔

ایک یہ بحث ہے کہ جو صحابہؓ فقیہ نہ تھے، اُن کی روایت اگر قیاس شرعی کے خلاف ہو تو واجب العمل ہوگی یا نہیں؟ اس کے متعلق بحر العلوم، امام فخر الاسلام کا مذہب نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ووجه قول الامام فخر الاسلام ان النقل بالمعنى شائع وقلما يوجد النقل باللفظ فان حادثة واحدة قد رويت بعبارات مختلفة ثم ان تلك العبارات ليست مترادفة بل قد روى ذلك المعنى بعبارات مجازية فاذا كان الراوي غير فقيه احتمل الخطاء في فهم المعنى المراد الشرعي.... ولا يلزم منه نسبة الكذب متعمدًا الى الصحابي معاذ الله عن ذلك

(شرح مسلم مطبوعہ لکھنؤ ص ۴۳۲)

امام فخر الاسلام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی عام طور پر شائع ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ روایت باللفظ کی جائے کیونکہ ایک ہی واقعہ مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے اور یہ الفاظ باہم مرادف بھی نہیں بلکہ اکثر مجازی عبارتوں میں مطالب ادا کئے گئے ہیں، اس بنا پر جب راوی فقیہ نہ ہوگا تو احتمال ہوگا کہ اس نے مطلب مقصود شرعی کے سمجھنے میں غلطی کی ہو، اس سے معاذ اللہ یہ لازم نہیں آتا کہ صحابی کی طرف جھوٹ کی نسبت کی جائے۔

محدثین اس اصول سے کہ "واقعہ جس درجہ کا اہم ہو، شہادت بھی اُسی درجہ کی اہم ہونی چاہیئے" بے خبر نہ تھے، امام بیہقی کتاب المدخل میں ابن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں۔

اذا روينا عن النبي (صلى الله عليه وسلم) في الحلال والحرام والاحكام شددنا في الاسانيد وانتقدنا في الرجال واذا روينا في الفضائل والثواب والعقاب سهلنا في الاسانيد وتسامحنا في الرجال (فتح المغيث ص ۱۲۰)

جب ہم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے حلال و حرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں، اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں لیکن جب فضائل اور ثواب وعقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انگاری کرتے اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے:۔

ابن اسحاق رجل نكتب عنه هذه الاحاديث يعني المغازي ونحوها واذا جاء الحلال والحرام اردنا قوما هكذا وقبض اصابع يديه الاربع

(فتح المغیث ص ۱۲۰)

ابن اسحاق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ مغازی وغیرہ کی حدیثیں اُن سے روایت کی جاسکتی ہیں لیکن جب حلال و حرام کے مسائل آئیں تو ہم کو ایسے لوگ درکار ہیں، یہ کہہ کر انھوں نے چار انگلیاں بند کر کے دبالیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ محدثین واقعہ کی اہمیت کی بناء پر راوی کے درجہ کا لحاظ رکھتے تھے، اسی بنا پر ابن اسحاق کی نسبت امام ابن حنبل نے یہ تفریق کی کہ حلال و حرام میں اُن کی شہادت معتبر نہیں لیکن مغازی میں ان کا اعتبار ہے۔ یہ وہی اصول ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو، اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیئے، اور یہ کہ واقعہ کے بدلنے سے شہادت کی اہمیت بدل جاتی ہے لیکن واقعہ کی اہمیت احکام فقہیہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ نوعیتِ واقعہ کی اہمیت کا خیال فقہائے حنفیہ نے ملحوظ رکھا، اسی بناء پر ان کا مذہب ہے کہ جو

روایت قیاس کے خلاف ہو اس کی نسبت یہ دیکھنا چاہیئے کہ راوی فقیہ اور مجتہد بھی ہے یا نہیں، منار میں ہے۔

والراوي ان اعرف بالفقه والتقدم في الاجتهاد كالخلفاء الراشدين والعبادلة كان حديثه حجة يترك به القياس خلافا لمالك وان عرف بالعدالة والضبط دون الفقه كانس وابي هريرة ان وافق حديثه القياس عمل به وان خالفه لم يترك الا بالضرورة۔

راوی اگر تفقہ و اجتہاد میں مشہور ہے جیسے کہ خلفائے راشدینؓ یا عبادلہؓ تھے، تو اس کی حدیث حجت ہوگی اور اس کے مقابلہ میں قیاس چھوڑ دیا جائے گا (بخلاف امام مالک کے) اور اگر راوی ثقہ اور عادل ہے لیکن فقیہ نہیں جیسے کہ حضرت انسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ ہیں، تو اگر وہ روایت قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل ہوگا ورنہ قیاس کو بغیر ضرورت ترک نہ کیا جائے گا (نور الانوار ص ۱۷۶، ۱۷۷)

حضرت ابوہریرہؓ کی مثال اگرچہ قابل بحث ہے، کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک حضرت ابوہریرہؓ فقیہ اور مجتہد تھے، لیکن یہ جزوی بحث ہے، گفتگو اصل مسئلہ میں ہے۔

۷۔ سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابل بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے اس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے، تفحص اور استقراء سے بعض جگہ یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے وہ اس کا قیاس ہے، واقعہ نہیں، اس کی بہت سی مثالیں سیرت میں موجود ہیں، یہاں ہم صرف ایک دو واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ازواج مطہراتؓ سے ناراض ہو کر تنہا نشین ہو گئے تھے تو یہ مشہور ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کو طلاق دے دی، حضرت عمرؓ نے یہ خبر سُنی تو مسجد نبوی میں آئے، یہاں لوگ کہہ رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کو طلاق دے دی، حضرت عمرؓ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا کہ نہیں میں نے طلاق نہیں دی۔[1]

یہ حدیث بخاری میں کئی جگہ بہ اختلافِ الفاظ مذکور ہے، کتاب النکاح میں جو روایت ہے اس کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وان الاخبار التي تشاع ولو كثر ناقلوها ان لم يكن مرجعها الى امر حسي من مشاهدة او سماع لا تستلزم الصدق فان جزم الانصاري في روايته بوقوع التطليق وكذا جزم الناس الذي رآهم عمرُ عند المنبر بذالك محمول على انه شاع بينهم ذلك من شخص بناه على التوهم الذي توهمه من

جو خبریں شائع ہو جاتی ہیں گو اُن کے راوی کثرت سے ہوں، لیکن اگر اُن خبروں کی بنیاد امر حسی یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا سچا ہونا ضرور نہیں، چنانچہ انصاری نے اور اُن صحابہؓ نے جن کو حضرت عمرؓ نے منبر کے پاس دیکھا تھا، طلاق کا جو یقین کر لیا وہ یوں ہوا ہوگا کہ کسی شخص نے آنحضرتؐ کو دیکھا کہ آپ نے ازواجِ مطہراتؓ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت

[1] صحیح مسلم باب الایلاء۔

اعتزال النبی لنساءہ فظن لکونہ لم تجر عادتہ بذالک انہ طلقھن فاشاع انہ طلقھن فشاع ذالک فتحدث الناس بہ واخلق بھذا الذی ابتداء باشاعۃ ذالک ان یکون من المنافقین کما تقدم۔

ہمتی، اس لئے اس نے یہ قیاس کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دے دی، اس نے یہ خبر پھیلا دی، اور ایک دوسرے سے اس کو بیان کرنے لگے اور قیاس یہ ہے کہ اول جس شخص نے یہ خبر پھیلائی وہ منافق ہوگا۔

(فتح الباری شرح بخاری طبع اول مصر جلد ۹ ص ۲۵۰)

غور کرو، مسجد نبویؐ میں تمام صحابہؓ جمع ہیں، اور سب بیان کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دے دی، صحابہؓ عموماً ثقہ اور عادل ہیں، اور اُن کی تعداد کثیر اس واقعہ کو بیان کر رہی ہے، باوجود اس کے جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعہ نہیں بلکہ قیاس تھا، حافظ ابن حجر نے بڑی جرأت کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ راوی اوّل منافقین میں سے ہوگا، حضرت عائشہ صدیقہؓ کی نسبت بہت سے ایسے واقعات روایتوں میں مذکور ہیں جن میں سے ایک واقعۂ افک ہے، اُن کی نسبت بھی وہی قیاس ہونا چاہیئے، جو حافظ ابن حجر نے یہاں ظاہر کیا، یعنی یہ کہ منافقین نے اُن کی طرف منسوب کر دیئے ہوں گے، پھر تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔

۸۔ فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں، ان میں سب سے بڑا قومی اثر حکومت کا ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ اُن کا قلم تلوار سے نہیں دبا۔ حدیثوں کی تدوین بنوامیہ کے زمانہ میں ہوئی، جنھوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آلِ فاطمہ کی توہین کی، اور جمعہ میں سرِ منبر حضرت علیؓ پر لعن کہلوایا، سینکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہؓ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں، عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں لیکن نتیجہ کیا ہوا، عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کر دی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں، آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے اور بنوامیہ اور عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے، اُسی مقام پر نظر آتے ہیں، جہاں اُن کو ہونا چاہیئے تھا۔

ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ "امیر المومنین اگر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت موجود ہوتا تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے"۔ وہیں سرِ دربار ایک شخص نے اٹھ کر کہا تو جھوٹ کہتا ہے امیر المومنین کا باپ (حضرت عباسؓ جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ ہیں) وہاں موجود تھا، اُس کو کس نے پوچھا، مامون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔

تاہم یہ عالمگیر مؤثر بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے مغازی میں اس کے نشانات پائے جاتے ہیں، تاریخ نگاری کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ فتوحات اور رزمیہ کارناموں کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے، ملکی نظم و نسق اور تمدن و معاشرت کے واقعات یا تو بالکل قلم انداز کر جاتے تھے یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ اُن پر نگاہ نہیں پڑتی تھی، اسلام میں جب تالیف و تصنیف کی ابتدا ہوئی تو یہی نمونے پیشِ نظر

تھے اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ سیرت کا نام مغازی رکھا گیا، جس طرح سلاطین کی تاریخیں جنگ نامہ و شاہنامہ کے نام سے لکھی جاتی ہیں، چنانچہ سیرت کی ابتدائی تصنیف مثلاً سیرتِ موسیٰ بن عقبہ اور سیرت ابن اسحاق مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں، ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ سلاطین کی تاریخ کی طرح سنین کو عنوان بناتے ہیں اور اسی ترتیب سے حالات لکھتے ہیں، یہ حالات تمام تر جنگی معرکے ہوتے ہیں، اور غزوات ہی کے عنوان سے داستانیں شروع کی جاتی ہیں۔

یہ طریقہ اگرچہ سلطنت و حکومت کی تاریخ کے لئے بھی صحیح نہ تھا، لیکن نبوت کی سوانح نگاری کے لئے تو ناموزوں ہے، پیغمبر کو ناگزیر طور پر جنگی واقعات پیش آتے ہیں، اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح یا سپہ سالار کے رنگ میں نظر آتا ہے، لیکن یہ پیغمبر کی اصلی صورت نہیں ہے، پیغمبر کی زندگی کا ایک ایک خط و خال تقدس نزاہت، حلم و کرم، ہمدردی عام اور ایثار ہوتا ہے بلکہ عین اس وقت جب کہ اس پر سکندر اعظم کا دھوکا ہوتا ہے، ژرف بین نگاہ فوراً پہچان لیتی ہے کہ سکندر نہیں بلکہ فرشتۂ یزدانی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغازی کا انداز حدیث کی کتابوں میں سیرت کی تصنیفات سے بالکل الگ ہے۔

تمام اربابِ سِیَر لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بنونضیر کا محاصرہ کیا تو حکم دیا کہ اُن کے نخلستان کاٹ ڈالے جائیں (قرآن مجید میں بھی اس کا اجمالی ذکر ہے) اربابِ سِیَر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے اس حکم کی نسبت یہ اعتراض کیا کہ "یہ انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے" لیکن مورخین یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب نہیں دیتے اور یونہی گزر جاتے ہیں۔

۹۔ نہایت مہتم بالشان بحث یہ ہے کہ کوئی روایت اگر عقل یا مسلّمات یا دیگر قرائن صحیحہ کے خلاف ہو تو آیا صرف اس بنا پر واجب التسلیم ہوگی یا نہیں کہ رواۃ ثقہ ہیں، اور سلسلۂ سند متصل ہے؟ علامہ ابن جوزی نے اگرچہ لکھا ہے (جیسا کہ اوپر گزر چکا) کہ جو حدیث عقل کے خلاف ہو، اس کے رواۃ کی جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں، لیکن اس سے اصل بحث کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ عقل کا لفظ ایک غیر مشخص لفظ ہے، حامیانِ روایت لکھتے ہیں کہ اگر اس لفظ کو وسعت دے دی گئی تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا، انکار کر دے گا، کہ یہ میرے نزدیک عقل کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بحث کا قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے، عام خیال یہ ہے کہ جس روایت کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوں اور سلسلۂ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو، وہ بات خلافِ عقل ہونے کے انکار کے قابل نہیں ذیل کی مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

(۱) تلک الغرانیق العلیٰ کی حدیث کو جس میں بیان ہے کہ شیطان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے وہ الفاظ نکلوا دیئے، جن میں بتوں کی تعریف ہے، بعض محدثین نے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار کہا تھا اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ بیان کی تھی۔

لو وقع لارتد کثیر ممن اسلم ولم

اگر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسلام سے پھر جاتے

ینقل ذالک۔ — حالانکہ ایسا ہونا مذکور نہیں۔

حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

وجمیع ذالک لا یتمشّیٰ علی القواعد فان الطرق اذا کثرت وتباینت مخارجھا دلّ ذالک علی ان لھا اصلاً۔

یہ تمام اعتراضات اصول کے موافق چل نہیں سکتے اس لئے کہ روایت کے طریقے جب متعدد ہوتے ہیں اور ان کے ماخذ مختلف ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ روایت کی کچھ اصل ہے۔

(۲) صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تین دفعہ جھوٹ بولے تھے، امام رازی نے اس حدیث سے اس بناء پر انکار کیا ہے کہ اس سے حضرت ابراہیمؑ کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، اس لئے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ ہم حدیث کے کسی راوی کا جھوٹا ہونا مان لیں، علامہ قسطلانی امام رازی کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

فلیس بشئٍ اذ الحدیث صحیح ثابت ولیس فیہ نسبة محض الکذب الی الخلیل وکیف السبیل الی تخطیة الراوی مع قولہ انی سقیمٌ و بل فعلہ کبیرھم ھذا وعن سارة اختی اذ ظاھر ھذہ الثلاثة بلا ریب غیر مرادٍ۔

امام رازی کا قول بالکل ہیچ ہے اس لئے کہ حدیث ثابت ہے اور اس میں محض کذب کی نسبت حضرت خلیلؑ کی طرف نہیں ہے اور راوی کا تخطیہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ جب کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول موجود ہے انی سقیم اور بل فعلہ کبیرھم ھذا اور سارة اختی کیونکہ ان تینوں جملوں میں ظاہر لفظ قطعاً مراد نہیں۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، ہم نے اختصار کے لحاظ سے صرف مثالیں نقل کیں۔

ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہے جو دلائل عقلی اور قرائن حالی کی بناء پر بعض حدیث کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے، اور یہ طریقہ خود صحابۂ کرامؓ کے عہد میں شروع ہو گیا تھا اور محدثین کے اخیر دور تک قائم رہا، چونکہ یہ رائے عام خیال کے خلاف ہے اس لئے ہم اس کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں

(۱) حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس چیز کو آگ چھوئے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ اس کی بناء پر تو لازم آتا ہے کہ ہم گرم پانی (کے استعمال) سے بھی وضو کریں، حضرت ابوہریرہؓ نے کہا، بھتیجے جب تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سنو تو کہاوتیں نہ کہا کرو۔[3]

(۲) صحیح مسلم کے مقدمہ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ کے سامنے حضرت علیؓ کے قضایا (یعنی مقدمات کے فیصلے) پیش کئے گئے، حضرت ابن عباسؓ اس کی نقل لیتے جاتے تھے اور بعض بعض فیصلے چھوڑتے جاتے تھے، اور فرماتے تھے کہ:۔

---

[1] فتح الباری جلد ۸ ص ۲۲۳ مطبوعہ مصر [2] قسطلانی جلد ۵ ص ۳۸۹ [3] ابن ماجہ و ترمذی حدیث الوضوء مما مست النار

واللہ ما قضی بھذا علیٌ الا ان یکون ضلّ۔

خدا کی قسم علی نے یہ فیصلہ کیا ہے تو گمراہ ہو کر کیا ہے لیکن چونکہ وہ گمراہ نہ تھے اس لئے یہ فیصلہ بھی نہ کیا ہوگا۔

اسی روایت کے بعد صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس لوگ ایک کتاب لائے جس میں حضرت علیؓ کے فیصلے قلم بند تھے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے ایک گز کے بقدر چھوڑ کر باقی کتاب مٹا دی۔[1] اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے صرف ان فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کیا کہ وہ صحیح نہیں ہو سکتے، اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رواۃ اور سند کا پتہ لگائیں۔

(۱) صحیح بخاری (باب الصلوٰۃ النوافل جماعة) میں ہے کہ محمود بن ربیعؓ نے ایک جلسہ میں یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص خالصاً خدا کے لئے لا الٰہ الا اللہ کہے گا، خدا اس پر آگ حرام کر دے گا۔ اس جلسہ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی موجود تھے، جن کے مکان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات مہینہ تک قیام فرمایا تھا، حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے یہ حدیث سن کر کہا۔

واللہ ما اظن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قال ما قلت قط۔

خدا کی قسم میں کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ جو تم کہتے ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوگا۔

محمد بن الربیعؓ صحابی تھے، اور حضرت ابو ایوبؓ کو ان کے ثقہ ہونے میں کلام نہ تھا، تاہم چونکہ یہ حدیث ان کے نزدیک قرآن کے خلاف تھی حضرت ابو ایوبؓ اس پر یقین نہ لا سکے اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہ فرمایا ہوگا۔ اگرچہ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن الربیعؓ نے مدینہ آ کر اس حدیث کی تصدیق اپنے راوی (عقبان) سے کر لی لیکن اس سے اصل مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا، حضرت ابو ایوبؓ کو جن اسباب کی بناء پر محمود بن الربیعؓ کی روایت میں شبہ پیدا ہوا، عقبان پر بھی وہی شبہ پیدا ہو سکتا تھا، حضرت ابو ایوبؓ خدانخواستہ محمودؓ کو غلط گو نہیں سمجھتے تھے کہ انہوں نے روایت کے مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہوگی، یہ احتمال بعینہٖ راوی اول کی نسبت بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے بعض صحابہؓ سے کہا تھا کہ تم لوگ سچے لوگوں سے روایت کرتے ہو لیکن سامعہ غلطی کر جاتا ہے۔[2]

(۳) حضرت عمار بن یاسرؓ نے حضرت عمرؓ کے سامنے تیمم کی روایت بیان کی تو حضرت عمرؓ کو یقین نہیں آیا بلکہ جیسا کہ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے یہ الفاظ کہے اتق اللہ یا عمار یعنی اے عمار! خدا سے ڈرو، چنانچہ اسی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے حضرت ابو موسیٰؓ نے اس روایت سے استدلال کیا تو حضرت عبداللہؓ نے کہا ہاں، لیکن عمرؓ کو عمار کی روایت سے تسکین نہیں ہوئی۔[3]

(۴) حضرت عائشہؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے تو انھوں نے اس بناء پر انکار کیا کہ یہ قرآن مجید کی اس آیت کے خلاف ہے۔

---

[1] نووی شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب طومار کی شکل میں لکھی تھی (جس طرح اگلے زمانہ میں خطوط کو طومار میں جوڑ کر جمع کرتے تھے اور لپیٹ کر رکھتے تھے) [2] صحیح مسلم کتاب الجنائز ص [3] صحیح بخاری باب التیمم۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (بنی اسرائیل) — اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

(۵) اسی طرح جب اُن کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتگانِ بدر کی نسبت فرمایا کہ میں جو کہتا ہوں یہ سُنتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ابن عمرؓ نے غلطی کی[۱]، اس روایت کے راوی اگرچہ عبداللہ بن عمرؓ تھے جو مشہور صحابی ہیں، لیکن حضرت عائشہؓ نے اس بناء پر روایت کی صحت سے انکار کیا کہ اُن کے نزدیک وہ روایت قرآن مجید کے خلاف تھی۔

اکثر محدثین نے ان مباحث میں ثابت کیا ہے کہ روایت صحیح ہے، اور حضرت عائشہ کا اجتہاد جس کی بناء پر انھوں نے روایت سے انکار کیا صحیح نہیں، ہم کو اس سے بحث نہیں، اس موقع پر صرف یہ بحث ہے کہ اکابر صحابہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے اس بناء پر تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ دلائل عقلی یا نقلی کے خلاف ہے۔

(۶) ایک مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو جب طلاق دے دی جائے تو عدت کے زمانہ تک شوہر پر اُس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام واجب ہے یا نہیں، فاطمہؓ بنت قیس ایک صحابیہ تھیں، جن کو اُن کے شوہر نے طلاق دے دی تھی، ان کا بیان ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں، تو آپ نے اُن کو نفقہ اور مکان نہیں دلوایا، انھوں نے یہ حدیث حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم خدا کی کتاب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ایک عورت کے بیان پر چھوڑ نہیں سکتے، جس کی نسبت ہم کو معلوم نہیں کہ اُس نے یاد رکھا یا بھول گئی، امام شعبی نے ایک مجلس میں فاطمہؓ کی یہ روایت بیان کی تو اسود بن یزید نے ان کو کنکریاں ماریں کہ تم ایسی حدیث بیان کرتے ہو، پھر حضرت عمرؓ کا مذکورہ بالا واقعہ نقل کیا[۲]

صحابہؓ کے بعد بھی محدثین میں ایک ایسا گروہ موجود رہا جو عقلی یا نقلی وجوہ کی بناء پر بعض روایات کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا تھا، گو اُن کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوتے تھے۔

(۱) ایک ضعیف حدیث ہے کہ جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن رہا اور وفات پائی وہ شہید ہوا حافظ ابن القیم زاد المعاد میں اس حدیث کو دلائلِ عقلی سے باطل ثابت کر کے لکھتے ہیں۔

فلو کان اسنادُ ھذا الحدیث کالشمس کان غلطا ووھما[۳]

اگر اس حدیث کی سند آفتاب کی طرح بھی ہوتی تب بھی وہ غلط اور وہم ہوتی

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب الفئی میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے، حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ:۔

قض بینی وبین ھذا الکاذب الاٰثم الغادر الخائن[۴]

میرے اور اس جھوٹے مجرم دھوکہ باز خائن کے درمیان فیصلہ کیجئے

۱؎ صحیح مسلم کتاب الجنائز میں یہ روایتیں متعدد طریقوں سے مذکور ہیں ۲؎ صحیح مسلم کتاب الجنائز ۳؎ زاد المعاد (جزء ثانی) مطبوعہ کانپور ص ۹۶ ۴؎ نووی شرح صحیح مسلم ذکر حدیث مذکور

چونکہ حضرت علیؓ کی شان میں یہ الفاظ کسی مسلمان کی زبان سے نہیں نکل سکتے، اس لئے بعض محدثین نے اپنے نسخوں سے یہ الفاظ نکال دیئے، علامہ مازری اس حدیث کی نسبت لکھتے ہیں:۔

اذا انسدت طرق تاویلھا نسبنا الکذب الی رواتھا[۱]۔

جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔

(۳) بخاری میں روایت ہے کہ خدا نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو اُن کا قد ساٹھ گز کا تھا، حافظ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

ویشکل علیٰ ھذا ما یوجد الاٰن من آثار الامم السالفۃ کدیار ثمود فان مساکنھم تدل علی ان قاماتھم لم تکن مفرطۃ الطول علیٰ حسب ما یقتضیہ الترتیب السابق..... ولم یظھر الاٰن ما یزیل ھذا الاشکال[۲]۔

اور اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں مثلاً قومِ ثمود کے مکانات ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے قد اس قدر بڑے نہ تھے جیسا کہ ترتیب سابق سے ثابت ہوتا ہے..... اور اس وقت تک مجھ کو اس اشکال کا جواب نہیں معلوم ہوا۔

(۴) صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا سے کہیں گے کہ اے خدا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت میں مجھ کو رسوا نہ کرے گا، اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وقد استشکل الاسماعیلی ھذا الحدیث من اصلہ وطعن فی صحتہ[۳]۔

اور اسماعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد کیا ہے اور اس کی صحت پر طعن کیا ہے۔

اسماعیلی کے اعتراض کا حافظ ابن حجر نے جواب دیا ہے لیکن اسماعیلی کا درجہ فنِ حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے، اس لئے گو اسماعیلی کا اعتراض غلط ہے لیکن قابلِ لحاظ ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث استدلال کے خلاف ہے۔

(۵) عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا، اس پر بندروں نے جمع ہو کر اس کو سنگسار کیا، حافظ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں، اس بناء پر اس حدیث کی صحت میں تامل کیا کہ جانور مکلف نہیں، اس لئے اُن کے فعل پر نہ زنا کا اطلاق ہو سکتا ہے، نہ اس بناء پر اُن کو سزا دی جا سکتی، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وقد استنکر ابن عبد البر قصۃ عمرو بن میمون ھذہ وقال فیھا اضافۃ الزنا الی غیر مکلف واقامۃ الحد علی البھائم[۴]۔

ابن عبدالبر نے میمون کے اس قصہ سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں غیر مکلف کی طرف زنا کی نسبت ہے اور جانوروں پر حد قائم کرنا بیان کیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے اگر سند صحیح ہے تو

۱؎ نووی شرح مسلم کتاب الجہاد و باب الفئی ۲؎ فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۶ ص ۲۶۱ الخلق ۳؎ فتح الباری مطبوعہ مصر ص ۲۸۳ جلد ۸ ۴؎ فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۷ ص ۱۲۲

غالباً یہ بند رجن رہے ہوں گے۔

(۶) صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن ابی کے طرف داروں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں جھگڑا ہو گیا، اس پر یہ آیت اتری۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (حجرات)	اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو اُن میں صلح کرا دو۔

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک عبداللہ بن ابی اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی اسلام نہیں لایا تھا، اس بناء پر ابن بطال نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ آیت قرآنی اس واقعہ کے متعلق نہیں ہو سکتی اس لئے کہ آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مومن ہوں، اور یہاں عبداللہ بن اُبی کا گروہ علانیہ کافر تھا۔

حافظ ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے کہ تغلیباً ایسا کہا گیا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے محدثین سلسلہ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اُس کے موافق ہیں یا نہیں۔

(۷) ایک بڑا امر طلب روایت بالمعنی کا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ نے جو الفاظ فرمائے تھے بعینہٖ وہی ادا کرنے چاہئیں، یا اُن کا مطلب ادا کر دینا کافی ہے، محدثین اس باب میں مختلف الرائے ہیں، اور اکثروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر راوی اپنے الفاظ میں اس طرح مطلب ادا کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں فرق نہیں پیدا ہوتا تو الفاظ کی پابندی ضرور نہیں، لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ اصل مطلب ادا ہوا یا بدل گیا، ایک اجتہادی بات ہے، اسی بناء پر بعض محدثین مثلاً عبدالملک بن عمرؒ، ابوزرعہ، سالم بن جعد و قتادہ، امام مالک، ایک ایک لفظ کی پابندی کرتے تھے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ سینکڑوں راویوں میں صرف دو چار اشخاص ایسی پابندی کر سکتے تھے، اور وہ بھی اس زمانہ میں کہ تحریر کا رواج ہو چکا تھا، عام حالت یہی تھی کہ راوی حدیث کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے، جامع ترمذی کتاب العلل میں سفیان ثوری کا قول نقل ہے۔

ان قلت لکم انی احدثکم کما سمعت فلا تصدقونی، انما هو المعنیٰ۔	اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں جو سنتا ہوں بعینہٖ وہی ادا کر دیتا ہوں تو تم میری بات نہ مانو، میں صرف مطلب ادا کرتا ہوں۔

ترمذی نے اسی مضمون کے اور اقوال واثلہ بن الاسقع، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، حسن بصری، امام شعبی وغیرہ سے نقل کئے ہیں۔

جو صحابہؓ بہت محتاط تھے، حدیث کی روایت کے وقت اُن کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔

سنن ابن ماجہ کے دیباچہ میں عمرو بن میمون کا قول نقل کیا ہے کہ میں عبداللہؓ بن مسعود کی خدمت میں ہمیشہ جمعرات کی رات کو حاضر ہوتا، میں نے کبھی اُن کو یہ کہتے نہیں سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔ ایک

۱؎ صحیح بخاری کتاب العلم روایت جھگڑنے کی تفصیل ہے ہم نے محض خلاصہ کر دیا ہے ۲؎ صحیح ترمذی کتاب العلل میں ان لوگوں کے متعلق یہ تصریح مذکور ہے

دن اُن کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا تو دفعۃً سر جھکا لیا، پھر میری نظر اُن پر پڑی تو دیکھا کہ کھڑے ہیں قمیص کی گھنڈیاں کھلی ہیں، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں، گلے کی رگیں پھول گئی ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں کہا یا یوں، یا اس سے کچھ زیادہ یا اس سے کچھ کم یا اس کے مشابہ۔

امام مالک کا یہ حال تھا کہ جب حدیث روایت کرتے تھے تو خوف زدہ ہو جاتے اور کہتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا یا یوں فرمایا تھا، امام شعبی کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں سال بھر حاضر رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا۔ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے سعدؓ بن مالک کے ساتھ مکہ مبارکہ سے مدینہ طیبہ تک سفر کیا، لیکن اس تمام راہ میں انھوں نے ایک حدیث بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نہیں کی (حالانکہ وہ صحابی تھے) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنے والد سے پوچھا کہ میں نے آپ کو اور صحابہؓ کی طرح حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا، انھوں نے کہا، میں جب سے اسلام لایا، میں نے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں چھوڑا، لیکن میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ جو شخص میری نسبت کوئی جھوٹی روایت بیان کرے تو چاہیئے کہ اپنا گھر آگ میں بنائے۔

ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر ارشاد فرمایا تھا۔

ایاکم وکثرة الحدیث عنی۔	خبردار! مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ روایت کرو۔

اس موقع پر یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے قبول کرنے میں جو تامل کیا جاتا ہے اس کو راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے تعلق نہیں، مستند اور ثقہ راویوں کی دروغ گوئی کا خیال نہیں ہو سکتا، لیکن ثقہ راوی سے بھی مطلب روایت کے سمجھنے یا ادا کرنے میں غلطی کا ہو جانا ممکن ہے، اور ثقات کی روایت سے جب کسی موقع پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بناء پر انکار کیا جاتا ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت بیان کی گئی۔

ان المیت لیعذب ببکاء الحی۔	مُردوں پر نوحہ کیا جائے تو اُن پر عذاب کیا جاتا ہے۔

تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔

انکم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخطئ۔	تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں لیکن کان غلطی کر جاتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق فرمایا۔

اما انه لم یکذب ولکنه نسی او اخطأ۔	ہاں وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی۔

(۱۱) ایک اور بحث روایت آحاد کی ہے، روایت آحاد وہ ہے جس کے سلسلہ اسناد میں کہیں صرف ایک راوی پر مدار روایت ہو یعنی کوئی دوسرا راوی اس کا موید نہ ہو، اس قسم کی روایت کے تسلیم و انکار اور یقینی و

۱؎ یہ تمام اقوال صحیح ابن ماجہ دیباچہ کتاب میں مذکور ہیں دیکھو ص ۴ و ۵ مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ ۲؎ ابن ماجہ ص ۵ ۳؎ صحیح مسلم کتاب الجنائز ۴؎ مسلم کتاب الجنائز

ظنی ہونے کے متعلق اہل فن کا اختلاف ہے، معتزلہ روایاتِ احاد کے تسلیم سے قطعاً منکر ہیں، لیکن یہ درحقیقت انکار بداہت ہے، ہم روزمرہ واقعاتِ زندگی میں اس قسم کی روایات پر اکثر بلا حجت واصرار فوراً یقین کر لیتے ہیں، ہم میں سے ایک شخص اگر کہتا ہے کہ "زید تم کو بلاتا ہے" اور ہم فوراً اٹھ کر چلے جاتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ یہ خبر احاد ہے، اور ہم اسے تسلیم نہیں کرتے، معتزلہ کے مقابل میں اکثر محدثین اس کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں لیکن یہ درحقیقت تفریط ہے، خود صحابہؓ کا طرز عمل اس کے مخالف ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کی خدمت میں گئے اور تین دفعہ اجازت طلبی کی، چونکہ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے، کچھ جواب نہ ملا، وہ واپس چلے گئے، حضرت عمرؓ نے کام سے فارغ ہو کر اُن کو بلوا بھیجا، اور واپسی کا سبب پوچھا، انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ تین دفعہ اجازت طلبی کے بعد جواب نہ ملے تو واپس جاؤ، حضرت عمرؓ نے کہا اس روایت پر گواہ لاؤ ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اس پر شہادت پیش کی تو حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا، حضرت عمرؓ خدانخواستہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو غلط گو نہیں جانتے تھے، لیکن چونکہ حضرت عمرؓ بارگاہ نبوت میں برسوں رہے تھے اور انھوں نے یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سُنی تھی، حالانکہ حدیث ایسے امر کے متعلق تھی جو عموماً پیش آتا ہے، اس لئے حضرت عمرؓ نے واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے صرف ایک شخص کی شہادت کافی نہیں سمجھی۔

حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ایک عورت نے جو میت کی دادی ہوتی تھی میراث کا دعویٰ کیا، حضرت ابوبکرؓ نے کہا، قرآن میں دادی کی میراث مذکور نہیں، اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کوئی روایت مجھ کو معلوم ہے، مغیرہ بن شعبہ نے شہادت دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دادی کو چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے ان کی تنہا شہادت ایسے واقعہ کے متعلق کافی نہیں سمجھی، اور جب ایک اور صحابی محمد بن مسلمہ نے شہادت دی، تب حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو میراث دلائی۔

اسی طرح جنین کی دیت کے متعلق حضرت عمرؓ نے مغیرہؓ کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی، اس قسم کی اور بیسیوں مثالیں ہیں۔

اسی بنا پر روایت احاد کے متعلق فقہائے احناف کا اصول ایک حد تک صحیح ہے کہ یہ ظنی الثبوت ہیں، اُن سے قطعیت نہیں ثابت ہوتی ہے، اصل یہ ہے کہ روایاتِ احاد کی صحت اور عدم صحت یا ظن و قطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کے بعد خود اصل روایت کی اہمیت اور عدم اہمیت پر مبنی ہے، ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ "زید نے تم کو بلایا ہے" تو راوی کی ثقاہت واعتبار کے مسلّم ہونے کے بعد ہم کو کبھی اس واقعہ کی تسلیم سے انکار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہی شخص یہ کہتا ہے کہ "تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے" تو ہم اس واقعہ کی تسلیم میں پس وپیش کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اگر کوئی تنہا راوی یہ بیان کرتا ہے کہ "آپ ایک بار سفید کرتہ پہن کر باہر تشریف لائے" تو ہم کو اس کی تسلیم میں عذر نہیں، لیکن وہی راوی اگر یہ کہتا ہے کہ "ایک بار آپ برہنہ تن باہر نکل آئے"

(اس قسم کی ایک روایت ہے)، تو قطعاً ہم تنہا شہادت اُس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں سمجھیں گے۔

نتائج مباحث مذکورہ | گزشتہ صفحات میں ہم نے روایت وحدیث کے متعلق صحابہ کبارؓ کا جو طرز عمل پیش کیا ہے اور علمائے فنِ حدیث کے جن قواعد واصول کی تفصیل کی ہے، ذیل میں بترتیب نتائج کے طور پر ہم ان کا اعادہ کرتے ہیں

(۱) سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں، پھر عام احادیث میں کرنی چاہیئے، اگر نہ ملے تو روایاتِ سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

(۲) کتبِ سیرت محتاج تنقیح ہیں، اور ان کے روایات واسناد کی تنقید لازم ہے۔

(۳) سیرت کی روایتیں باعتبار پایۂ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں، اس لئے بصورت اختلاف احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

(۴) بصورتِ اختلاف روایاتِ احادیث، رواۃِ اربابِ فقہ وہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

(۵) سیرت کے واقعات[1] سلسلۂ علت ومعلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

(۶) نوعیتِ واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیئے۔

(۷) روایات میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے وفہم کا کس قدر جزو شامل ہے۔

(۸) اسبابِ خارجی کا کس قدر اثر ہے۔

(۹) جو روایات عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصول مسلّم اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی۔

(۱۰) اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق وجمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیئے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

(۱۱) روایاتِ احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائنِ حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیئے۔

ان اصول کے تقرر وتفصیل کے بعد نظر آسکتا ہے کہ اسلامی فن روایت عقل و درایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے، علمائے حدیث نے تصحیح روایت کے لئے کتنی محنت، کتنی جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی اور کتنی دقت رسی کی ہے، کیا اس اہتمام واعتناء کا دنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ وروایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلام میں سے کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے لئے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد واصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے؟

☆

---

[1] زیادت از ص ۰۰ تا ۹۰ "س"

یورپین تصنیفات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارک پر جو یورپین تصنیفات ہیں، ان پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی، جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائے گا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف ہلدی برٹ سے لے کر جو ۱۱۳۹ء میں موجود تھا، آج تک کیا سرمایہ مہیا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ اُن کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں؟ اُن کے وسائلِ معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوءِ ظن کا کہاں تک اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف ایک اجمالی گفتگو کرتے ہیں، کیونکہ اس حصہ میں بھی ہم کو جا بجا ان تصنیفات سے کام لینا یا ان سے تعرض کرنا پڑتا ہے۔

یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا، جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز، مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا، ایک یورپین مصنف لکھتا ہے۔

"عیسائیت اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی اور نہ سمجھ سکی، وہ صرف تھراتی اور حکم بجالاتی تھی، لیکن جب قلبِ فرانس میں عرب پہلے پہل روکے گئے تو اُن قوموں نے جو اُن کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں، منہ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلہ جب کہ اس کا بھگانے والا کتا دور نکل جاتا ہے"[1]

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا، اس کو فرانس کا مشہور مصنف ہنری دی کاستری جس کی تصنیف کا عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے، یوں بیان کرتا ہے۔

"وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرونِ وسطیٰ میں رائج تھے، ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے؟ یہ تمام داستانیں اور نظمیں، مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عداوت سے بھری ہوتی ہیں، جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں، ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں، ہر مسیحی شاعر، مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا، اور حسبِ ترتیب درجات اُن کے تین خدا تسلیم کئے جاتے تھے، ماہوم یا ماہون یا ناقومیڈ (یعنی محامد)، اور اپلین اور تیسرا ترگامان، ان کا خیال تھا کہ محمدؐ نے اپنے مذہب کی بنیاد دعوائے الوہیت پر قائم کی، اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمدؐ (وہ محمدؐ جو بت شکن اور دشمنِ اصنام تھا) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا۔

---

[1] محمد اینڈ محمدنزم از باسورتھ اسمتھ صاحب ایم اے ص ۶۳ BOSWORTH SMITH IS MOHAMMAD E MOHAMEDANISM

اسپین میں جب عیسائی مسلمانوں پر غالب ہوئے اور اُن کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا، تو مسلمان لوٹ کر آئے اور اپنے بتوں کو انھوں نے توڑ ڈالا، اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے "اپلین مسلمانوں کا دیوتا وہاں ایک غار میں تھا، اُس پر وہ پل پڑے اور اس کو نہایت سخت سُست کہا اور اس کو گالیاں دیں، اور اُس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی، اور اس کو پاؤں سے روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اُس کے ٹکڑے کر ڈالے۔ اور ماہوم کو جو اُن کا دوسرا دیوتا تھا، ایک گڑھے میں ڈال دیا، اس کو سور اور کتوں نے نوچ ڈالا، اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی، اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں سے معافی مانگی، اور از سرِ نو تلف شدہ بتوں کو بنایا، اسی بناء پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا، تو اُس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دے دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں وہ مسجدوں میں گھس گئے اور لوہے کے ہتھوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا"۔

ایک دوسرا شاعر ریچ خدا سے دعا کرتا ہے کہ "وہ ماہوم کے بُت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے"۔ اس کے بعد وہ امراء کو جنگ صلیبی کے لئے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے، "اٹھو اور ماہومیڈ اور ترماگان کے بتوں کو اوندھا کر دو، اور اُن کو آگ میں ڈال دو، اور اُن کو اپنے خداوند کی نذر کر دو۔"

اس قسم کے خیالات ایک مدت تک قائم رہے (کسی اور حصہ میں ہم اس کو مفصل لکھیں گے۔[1]

سترھویں اور اٹھارھویں صدی سترھویں صدی کے سنین وسطی یورپ کے عصرِ جدید کا مطلع ہے، یورپ کی جدوجہد، سعی و کوشش اور حریت و آزادی کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، ہمارے مقصد کی جو چیز اس دور میں پیدا ہوئی، وہ مستشرقینِ یورپ کا وجود ہے، جن کی کوشش سے نادر الوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں، عربی زبان کے مدارس، علمی و سیاسی اغراض سے جا بجا ملک میں قائم ہوئے، اور اس طرح وہ زمانہ قریب آتا گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سُن سکا۔

اس دور کی خصوصیتِ اوّل یہ ہے کہ سُنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام و سیرتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو موقع بموقع معلوماتِ سابقہ کے مصالح کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔

اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجہ سے نجات پائی اور اس کے مذہبی اور سیاسی امور الگ الگ ہو گئے، اس بناء پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ ہو گئیں، عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق و غیر متعصب گروہ اسلام کے متعلق ان دونوں جماعتوں نے جو کوششیں کیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

---

[1] کتاب ہنری دی کاستری بزبان عربی مطبوعہ مصر از صفحہ ۸ تا ۱۰۔

اس عہد میں عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ ہو گیا تھا اس سلسلہ میں سب سے پہلے اربی نیوس (ARP) مارگولیوس ایڈورڈ پوکاک (POCOCKE) اور ہاٹنجر (HATTINJER) ذکر کے قابل ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے ابتداءً جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا، وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں جو قرونِ ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے یعنی سعید بن بطریق اوٹیکوس المتوفی سنہ ۹۳۹ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا، اور ابن العمید المکین المتوفی سنہ ۱۲۷۳ء جو سلاطینِ مصر کا ایک درباری تھا، اور ابوالفرج ابن العبری الملطی المتوفی سنہ ۱۲۸۶ء مصنف تاریخ الدول۔

ابن العمید المکین کی تاریخ طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے، اربی نیوس نے جو ہولینڈ کا ایک مستشرق تھا لاطینی ترجمہ کے ساتھ لیڈن سے اس کا ایک ٹکڑا شائع کیا، جو ابتدائے رسالت سے دولتِ اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اخیر اٹھارہویں صدی | یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوتِ سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہو گئی، جس نے اورنٹیلسٹ کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کر دی، جنھوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کئے، اور ذیل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔

سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرقی میں سنہ ۱۷۷۸ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، اس کی تقلید میں انگریزوں نے بمقام کلکتہ سنہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور سنہ ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد سنہ ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دار العلوم قائم کیا، اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالکِ یورپ میں اس قسم کی درس گاہیں اور انجمنیں جاری ہو گئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کر کے باستثنائے چند اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو گیا، سب سے پہلے ریسک (REISKE) المتوفی سنہ ۱۷۷۴ء نے تاریخ ابوالفداء مع ترجمہ لاطینی و حواشی پانچ جلدوں میں شائع کی، سنہ ۱۸۰۹ء میں کیپٹن اے متھوس (A: N: MATHEWS) نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا، سنہ ۱۸۵۶ء میں وان کریمر (KREMER) نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرۃ الرسول کی گوٹنگن (COTTINGEN) سے اشاعت کی، اس کے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخِ مدینہ اور ابن قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی سنہ ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل (G. WEIL) نے ابن ہشام کا جرمنی میں ترجمہ کیا، سنہ ۱۸۷۷ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمۂ فرنسیس ہبرد... [illegible] نے شائع کی، والہوسن [illegible] ... نے سنہ ۱۸۸۲ء

میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان "محمد بمدینہ" برلن سے شائع کیا، سنہ ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے ہوٹسما (HOUTASMA) کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو جلدوں میں چھپی، سنہ ۱۸۷۹ء سے سنہ ۱۸۹۲ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادر الوجود تاریخ بارتھ (J. BARTH) اور نولدیکی (NOLDEKE) وغیرہ نے شائع کی، اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ (SACHUU) کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات، جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تصنیف نہیں، تقریباً سنہ ۱۹۰۵ء سے گزشتہ سال تک ایک ایک جلد کر کے لیڈن سے شائع ہوتی رہی۔

ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت، ممالکِ اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگاران پیغمبر عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

اوکسفورڈ کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:۔

"محمدؐ کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابلِ فخر چیز ہے[1]"

ہم اس موقع پر صرف ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں، جو بہ تخصیص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں یا اسلام کے اصولِ عقائد پر لکھی گئیں، اور جن میں سے اکثر ہمارے دفترِ تصنیف میں موجود ہیں یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۱	ڈاکٹر جی۔ بی (؟)	انگلستان	سیرت محمد خادع (نعوذ باللہ)	سنہ ۱۸۱۵ء
۲	ڈاکٹر وایٹ (واعظ آکسفورڈ)	″	بیمفٹن سرمنز اسلام اور پیغمبر اسلام	سنہ ۱۸۰۰ء
۳	گارڈفری ہگنس، ایم آر اے ایس	″	آپالوجی	سنہ ۱۸۲۹ء
۴	ڈاکٹر جے اے مولر	جرمن	اسلامزم	سنہ ۱۸۳۰ء
۵	گارسن ڈی ٹاسی	فرانس	اسلام و قرآن	از سنہ ۱۸۳۱ء تا ۱۸۴۴ء
۶	اڈورڈ لین	انگلستان	انتخابات القرآن	سنہ ۱۸۴۳ء
۷	ڈاکٹر ویل	جرمن	ترجمہ و تحشیہ ابن ہشام کتاب محمد پیغمبر	سنہ ۱۸۴۵ء و ۱۸۴۹ء
۸	کارلائل	انگلستان	ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	سنہ ۱۸۴۶ء
۹	کوسن ڈی برسیوال	فرانس	تاریخ عرب	سنہ ۱۸۴۷ء

[1] مارگولیتھ۔ محمد، دیباچہ صفحہ ا۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانۂ تصنیف
۱۰	واشنگٹن ارونگ	انگلستان	سیرت محمدؐ	۱۸۴۹ء
۱۱	ڈاکٹر اسپرنگر	جرمن	سیرت محمدؐ	۱۸۵۱ء
۱۲	وان کریمر	″	ترجمہ و تحشیۂ واقدی	۱۸۵۶ء
۱۳	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	مضمون "محمدؐ"	۱۸۵۸ء
۱۴	ڈوزی	ہولینڈ	تاریخ اسلام	۱۸۶۱ء
۱۵	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	بزرگ ترین عرب	۱۸۶۱ء
۱۶	ڈی لین		سیرت محمدؐ	″
۱۷	میور	انگلستان	سیرت محمدؐ	″
۱۸	برتھالمی سینٹ ہلیر	فرانس	محمدؐ و قرآن	۱۸۶۵ء
۱۹	نولڈیکی	جرمن	مضامین قرآن و اسلام	۱۸۶۹ء
۲۰	دو شیف مضمون نگار کوارٹرلی ریویو	انگلستان	اسلام	″
۲۱	مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو	″	محمدؐ	۱۸۷۲ء
۲۲	جولیس چارلس	فرانس	تاریخ بانیٔ اسلام	۱۸۷۴ء
۲۳	مضمون نگار کانٹمپریری ریویو	انگلستان	محمدؐ اور اسلام	۱۸۷۵ء
۲۴	باسورتھ اسمتھ	″	″	″
۲۵	سیدیو	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۷۷ء
۲۶	ولہوسن	جرمن	تبصرہ بر واقدی	۱۸۸۲ء
۲۷	اہل کراہل	جرمنی	سیرت محمدؐ	۱۸۸۴ء
۲۸	گولڈ زیہر		مطالعۂ اسلام	۱۸۹۰ء
۲۹	رینان	فرانس	تاریخ مذاہب	۱۸۹۲ء
۳۰	ایچ گریم	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	۱۸۹۴ء
۳۱	ہنری دی کاستری	فرانس	اسلام پر خیالات	۱۸۹۶ء
۳۲	ایف بوہل	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	۱۹۰۳ء
۳۳	والسٹن	انگلینڈ	آدھ گھنٹہ محمدؐ کے ساتھ	۱۹۰۵ء
۳۴	مارگولیتھ	″	محمدؐ	″
۳۵	کوئل	″	محمدؐ اور اسلام	۱۸۹۴ء

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانۂ تصنیف
۳۶	پرنس کاتیانی	ایٹالیہ	تاریخ کبیر محمد و اسلام و سلاطین اسلام	جاری
۳۷	میجر لیونارڈ	انگلینڈ	اسلام کا روحانی و اخلاقی پایہ	۱۹۰۹ء

مصنفین یورپ تین قسموں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایۂ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کا قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں، تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صاحب الرائے اور انصاف پرست ہیں، کہ راکھ کے ڈھیر میں بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں لیکن قلیلٌ ما ھم۔

(۲) عربی زبان اور علم ادب و تاریخ و فلسفہ، اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام پر یا شارع اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں، لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمن کا مشہور فاضل ساخو جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، بیرونی کا کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے، رشک کے قابل ہے، لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ وہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا، نولڈیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے، لیکن انسائیکلوپیڈیا (جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے، جا بجا نہ صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے رازِ پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

(۳) وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے مثلاً پامر صاحب یا مارگولس صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے، لیکن باوجود عربی دانی، کثرتِ مطالعہ، تفحص، کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ ؎

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیوس نے مسند امام احمد بن حنبل کی ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب و افترا، اور تاویل و تعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کر سکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر ہمینی کے مشہور عربی داں ہیں، کئی سال مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل رہے، لکھنؤ میں اگر شاہی

کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گزری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ، اول اوّل ان ہی نے تصحیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب ۳ جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔

یورپین مصنفین کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں۔

(۱) سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفاتِ سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، چنانچہ اس کی بحث اوپر گزر چکی، مصنفینِ سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روائتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں، مثلاً سیف، سُدّی، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایۃ ہیں، اس لئے عام اور معمولی واقعات میں اُن کی شہادت کافی ہو سکتی ہے، لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے اُن کے لئے یہ سرمایہ بے کار ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بروایاتِ صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں، اور ایک آدھ جو واقف ہے (مثلاً مارگولیس) تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں، اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سینکڑوں خرمنِ معلومات کو جلانے کیلئے کافی ہے۔

(۲) دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصولِ تنقیح شہادت اور ہمارے اصولِ تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں؟ حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے، نہ ضروری ہے، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ فرض کرو ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا، تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صورت تسلیم کرلی جائے گی۔

بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ "اسمائے رجال" کے دفترِ تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابلِ اعتنا ہے، بخلاف اس کے اگر

لے یہ کتاب جرمن زبان میں ہے، ہم جرمن نہیں جانتے لیکن اس کے اقوال اکثر یورپین مصنفین نے نقل کئے ہیں اور ہماری نظر سے گزرے ہیں۔

ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو، اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو، لیکن اس کی روایت قبول کرلی جائے گی۔

اس اختلاف اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے، مثلاً اہل یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے، جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں، سب موجود ہوتی ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتے ہیں، جو روایتیں سو برس سے زیادہ زمانہ تک محض زبانوں پر رہیں، ان میں اس قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں، یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں، چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلوماتِ عامہ کے ذریعہ سے ایک سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے، لیکن یہ جرأت صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین اس سے معذور ہیں۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں، ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کئے ہیں، اور جن کو بعض جگہ وہ بھول جاتے ہیں، ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

یورپین تصنیفات کے اصول مشترکہ | یورپین مصنفین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا اُن کی تصنیفات سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، حسب ذیل ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے لیکن مدینہ جا کر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعۃً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے اور اس کے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

(۲) کثرتِ ازدواج اور میل الی النساء۔

(۳) مذہب کی اشاعت جبر اور زور سے۔

(۴) لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

(۵) دنیا داروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

اس بنا پر ہماری کتاب کے ناظرین کو تمام واقعات میں اس نکتہ پر نظر رکھنی چاہیئے کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار پر بھی ٹھیک اتر سکتے ہیں یا نہیں۔

اصولِ تصنیف اور ترتیب | ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کئے ہیں، اب ان کے بتانے کا وقت آگیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے، ان کو سب پر مقدم رکھا ہے، یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے لیکن لوگوں نے آیات قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی، اس

لئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے۔

(۲) قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں، جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، اُن کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، اربابِ سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتبِ حدیث میں، ان موقعوں میں ڈھونڈتے ہیں، جہاں عنوان لو مضمون کے لحاظ سے اس کو درج ہونا چاہیئے اور جب اُن کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں، لیکن کتبِ حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں اس لئے اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کئے، جو اہلِ سیر کی نظر سے بالکل اوجھل ہو گئے تھے۔

(۳) روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، اُن کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور تا امکان کد و کاوش کی ہے، اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا ہے کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لئے جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے اُن کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا، تاکہ جس سلسلہ روایت کی تحقیق مقصود ہو، بہ آسانی ہو جائے۔

(۴) جن فروگزاشتوں کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، جہاں تک ممکن تھا اُن کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔

کتاب کے حصے | اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔

پہلے حصہ میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر وفات تک عام حالات اور واقعات و غزوات ہیں، اسی حصہ کے دوسرے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے، آل و اولاد اور ازواجِ مطہراتؓ کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔

دوسرا حصہ منصبِ نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض، تعلیمِ عقائد، اوامر و نواہی، اصلاحِ اعمال اور اخلاق ہے، اس بناء پر منصبِ نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائضِ خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتداء اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ دکھایا ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے، اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا، اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔

تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہِ اعجاز اور حقائق و اسرار سے بحث ہے۔

چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے، قدیم سیرت کی کتابوں میں معجزات کا الگ الگ باب باندھتے ہیں لیکن آج کل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور

یہ کتاب سات حصوں میں مرتب ہو گئی ہے اور ترتیب بھی بدل گئی ہے۔

امکان سے بحث کرنے کی ضرورت پیش آگئی، البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً معراج یا تکثیرِ طعام وغیرہ اُن کو اُس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے یعنی یورپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ ان کا سرمایۂ معلومات کیا ہے؟ تاریخی واقعات میں وہ کیونکر غلطیاں کرتے ہیں؟ مسائلِ اسلام کے سمجھنے میں اُن سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات یا مسائلِ اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں اُن کے جوابات۔

یہ ضرور نہیں کہ یہ حصے اسی ترتیب سے شائع ہوں، بلکہ جس حصہ کی تیاری کے سامان فراہم ہو جائیں گے اور مرتب ہو جائے گا، وہ شائع کر دیا جائے گا۔

اسناد اور حوالے | تاریخ اور روایت میں حوالہ اور استناد سب سے مقدم چیز ہے، اس لئے اس کے متعلق چند ضروری امور بیان کر دینے ضرور ہیں۔

(۱) صرف انہی کتابوں کا حوالہ دیا ہے، جو خود میری نظر سے گزری ہیں۔

(۲) جو واقعات کسی قدر اہم ہیں، اُن کے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں محدثانہ کد و کاوش نہیں کی ہے۔

(۳) مطبوعہ کتابوں کے حوالہ میں مطبع کا نام بتا دیا گیا ہے، قلمی کتابوں کے متعلق تصانیفِ سیرت کی فہرست جو اوپر گزر چکی ہے اس میں بتا دیا ہے کہ ہمارے استعمال میں کون سا نسخہ تھا۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ۔

عرب

وجہ تسمیہ | عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں، اہلِ لغت کہتے ہیں کہ عرب اور اعراب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں، اور چونکہ اہلِ عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو عرب اور دنیا کی اور تمام قوموں کو عجم (ژولیدہ بیان) کہہ کر پکارا۔

بعض کی رائے ہے کہ عرب اصل میں عربۃ تھا، قدیم اشعار میں عرب کے بجائے عربۃ آیا ہے۔

ورجّت، باحة العربات رحّها	ترقرق في مناكبها الدماءُ
وعربةُ ارض جدّ في الشر اهلُها	كما جدّ في شرب النقاخ ظماءُ
وعربةُ ارض ما يحِلّ حرامَها	من الناس الا اللوذعيّ الحلاحل

عربہ کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحرا کے ہیں اور چونکہ عرب کا بڑا حصہ دشت و صحرا ہے اس لئے تمام ملک کو عرب کہنے لگے۔

جغرافیہ عرب کے حدود اربعہ یہ ہیں :-

مغرب : بحیرۂ قلزم۔

مشرق : خلیج فارس اور بحر عمان۔

جنوب : بحر ہند۔

شمال : کی حدود بہت مختلف فیہ ہیں، بعض مملکت حلب اور فرات تک اُس کی حدود کو وسعت دیتے ہیں سینا کا جزیرہ نما جس کا نام التیہ ہے، اکثر مصنفین عرب و یورپ اس کو مصر میں شمار کرتے ہیں لیکن جیالوجی کی رو سے وہ عرب سے متعلق ہے۔

عرب کی پیمائش باقاعدہ اب تک نہیں ہوئی، تاہم اس قدر یقینی ہے کہ وہ جرمن اور فرانس سے چوگنا زیادہ وسیع ہے، طول تقریباً پندرہ سو، عرض چھ سو میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ میل مربع ہے۔

ملک کا بڑا حصہ ریگستان ہے، پہاڑوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے، سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ جبل السّراۃ ہے جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے، اس کی سب سے اونچی چوٹی آٹھ ہزار فٹ بلند ہے بعض حصے زرخیز اور شاداب بھی ہیں۔

چاندی اور سونے کی کانیں کثرت سے ہیں، علامہ ہمدانی نے "صفۃ جزیرۃ العرب" میں ایک ایک کان کا نشان دیا ہے، قریش جو تجارت کیا کرتے تھے، مورخین نے لکھا ہے زیادہ تر ان کا مال تجارت چاندی ہوتی تھی، برٹن صاحب نے مدین کی طلائی معادن پر خاص ایک کتاب لکھی ہے[1]۔

قدیم تاریخ کے ماخذ اسلام سے قبل عرب کی تاریخ کے ماخذ حسب ذیل ہیں :-

(۱) زمانۂ جاہلیت کی بعض تصنیفات جو سلاطین حیرۃ کے کتب خانہ میں محفوظ تھیں، اور جو ابن ہشام کو ہاتھ آئی تھیں اور جن کا ذکر علامہ موصوف نے کتاب التیجان میں کیا ہے۔

(۲) زبانی روایتیں جو قدیم سے چلی آتی تھیں، عرب کا حافظہ نہایت قوی تھا، یہاں تک کہ آج اشعار جاہلیت کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ اسلام کے زمانہ تک زبانی ہی روایت ہوتا چلا آتا تھا۔ اس بنا پر عرب کی قدیم تاریخ کا کافی سرمایہ محفوظ تھا، عرب کی جو قومیں معدوم ہو چکیں مثلاً طسم، جدیس، عاد، ثمود، ان کے متعلق بھی اس قدر تاریخی روایتیں محفوظ تھیں کہ ان کے ذریعہ سے مورخین اسلام، عرب کی تاریخ قدیم پر معتد بہ تصنیفات مرتب کر سکے، مثلاً ہشام کلبی نے طسم، جدیس، تبابعۂ یمن اور دیگر سلاطین عرب پر متعدد کتابیں لکھیں، جن کا ذکر ابن الندیم نے فہرست صفحہ ۹۶ میں کیا ہے۔

(۳) اشعار جاہلیت جن میں سے اکثر سلاطین اور اقوام اور عمارات عرب کا ذکر ہے، یہ اشعار صفۃ جزیرۃ العرب اور معجم البلدان میں کثرت سے موجود ہیں، انہی قدیم ماخذوں سے علامہ ہمدانی نے اپنی کتاب "الاکلیل" مرتب کی ہے جس کا آٹھواں باب خاص سلاطین حمیر کے آثار قدیمہ اور حمیری کتبات پر مشتمل ہے۔

---

[1] GOLD MINES OF MEDION اس کتاب کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ طبقات الامم (مطبوعہ بیروت) میں ہے۔

(۴) یورپ کی قدیم تصنیفات مثلاً مصنفین یونان نے ہیرو ڈوٹس سے (جو حضرت عیسیٰؑ سے چار سو برس قبل تھا) لے کر بطلیموس تک بہت سے قبائل عرب کے نام لکھے ہیں، اور اُن کی آبادیوں کے نام بھی بتاتے ہیں، رومن مورخ پلینی نے بھی عرب کے متعلق لکھا ہے، گو نہایت مختصر ہے۔

(۵) عرب کی قدیم ویران شدہ عمارتوں کے کتبات جو قدمائے اسلام نے دریافت کئے تھے، اور جو آج کل یورپ نے نہایت کثرت سے مہیا کئے ہیں۔

عرب کے اقوام و قبائل مورخین عرب نے اقوام و قبائل عرب کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔

عرب بائدہ : یعنی عرب کے قدیم ترین قبائل جو اسلام سے بہت پہلے فنا ہو چکے تھے۔

عرب عاربہ : بنو قحطان جو عرب بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے اور جن کا اصلی مسکن ملک یمن تھا۔

عرب مستعربہ : بنو اسماعیل یعنی حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو حجاز میں آباد تھی۔

ظہور اسلام کے وقت بنو قحطان اور بنو اسماعیل جن کو عدنانی قبائل بھی کہتے ہیں، ملک کے اصلی باشندے تھے، اور ان کے علاوہ خال خال یہودیوں کی آبادی تھی، اس بنا پر درحقیقت ملک عرب اس وقت تین مختلف عناصر سے مرکب تھا، ہر عنصر کا قوام بے شمار قبائل و فروع سے تھا جو یمن سے شام تک ہر قطعۂ زمین میں پھیلے ہوئے تھے اُن کی پھر مختلف چھوٹی چھوٹی شاخیں تھیں، چونکہ اس کتاب میں اکثر اُن کے نام آئیں گے، اس بنا پر ان کا ایک مختصر خاکہ درج ذیل ہے۔

بنو قحطان

اس خاندان کی تین بڑی شاخیں ہیں :-

(۱) قضاعہ (۲) کہلان (۳) ازد، حمیر بھی اسی کی شاخ ہے، جو یمن کے فرماں روا تھے، لیکن واقعات کو اُن سے کوئی تعلق نہیں۔

(۱) قبائل قضاعہ :- عام علمائے انساب قضاعہ کو بنو قحطان میں داخل کرتے ہیں، اور ہم بھی یہاں ان کی پیروی کرتے ہیں ورنہ از روئے تحقیق وہ بنو اسماعیل ہیں، بہر حال اُن کی حسب ذیل شاخیں ہیں۔

بنو کلب، بنو تنوخ، بنو جرم، بنو جہینہ، بنو نہد، بنو عذرہ، بنو اسلم، بلی، سلیح، تنجم، تغلب، نمر، اسد، تیم اللات، کلب۔

(۲) کہلان :-

بجیلہ، خثعم، ہمدان، کندہ، مذحج، طے، لخم، جذام، عاملہ۔

(۳) ازد :- انصار اسی کی شاخ تھے۔

اوس، خزرج، خزاعہ، غسان، دوس۔

مشہور عدنانی قبائل جن کا آخری مقسم مضر ہے، حسب ذیل ہیں۔ قبائل مضر اولاً بنی خندف اور بنو قیس دو خانوں پہ منقسم ہیں۔

---

[1] یہاں سے عرب کی قدیم حکومتیں تک زیادت ہے ش ن

۱۔ خندف

ہذیل، کنانہ، اسد، ضبۃ، مزینہ، رباب تیم، ہون۔

ان میں سے ہر ایک کے متعدد فروع ہیں۔

اصول	فروع
کنانہ۔	قریش، دول۔
ہون۔	قارہ۔
رباب	عدی، تیم، عکل، ثور۔
تیم	مقاعس، قریع، بہدلہ، یربوع، ریاح، ثعلبہ، کلیب۔

۲۔ قیس

عدوان، غطفان، اعصر، سلیم، ہوازن۔

ان میں بعض کے فروع یہ ہیں:۔

غطفان۔	عبس، ذبیان، فزارہ، مرہ۔
اعصر	غنی، باہلہ۔
ہوازن	سعد، نصر، جشم، ثقیف، سلول، بنو عامر۔ (عامر کی شاخیں بنو ہلال، بنو نمیر، بنو کعب ہیں)

یہود

بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ۔

عرب کی قدیم حکومتیں

بنو قحطان و آل اسماعیل نے اسلام سے پہلے متعدد حکومتیں قائم کی تھیں، جن کے جستہ جستہ واقعات کہیں ملتے ہیں؛ کتبوں اور دیگر مورخین کی تصریحوں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں پانچ متمدن سلطنتیں گذریں۔

(۱) معینی	معین یمن میں ایک مقام کا نام ہے جو کسی زمانہ میں سلطنت کا پایۂ تخت تھا،
(۲) سبائی	یعنی قوم سبا،
(۳) حضر موتی	حضر موت، یمن کا مشہور مقام ہے۔
(۴) قتبانی	قتبان، عدن میں ایک مقام ہے جو آجکل گمنام ہے۔
(۵) نابتی	حضرت اسماعیلؑ کے ایک بیٹے کا نام نابت تھا، یہ سلسلہ انہی کی طرف منسوب ہے۔

معینی سلطنت، جنوبی عربستان میں تھی، اس کے صدر مقامات قرن اور معین تھے، کتبوں سے تقریباً پچیس ، کا پتہ چلتا ہے، محققین یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم زمان تھیں یا متقدم و متاخر، گلازر

کا خیال ہے کہ معینی حکومت بہت متقدم ہے، اور حضرت عیسیٰؑ سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی، لیکن مولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیح سے پہلے کا نہیں ملتا، اس بناء پر سبائی اور معینی دونوں ہم عصر ہیں۔

سبائی دور، جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے، حضرت عیسیٰؑ سے سات سو برس قبل ہے، اس سلطنت کا پایۂ تخت مآرب تھا، اس زمانہ کے سنگی کتبے بکثرت موجود ہیں، حضرت عیسیٰؑ سے ایک سو پندرہ برس قبل تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے، اس دور کے بعد حمیر کا زمانہ ہے، حمیر نے مآرب پر قبضہ کر کے اس کو پائے تخت بنالیا۔

قریباً ۱۱۵ء قبل مسیح میں حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کر لیا، کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حمیر میں چھبیس فرماں روا گزرے، حمیر کے بعض کتبوں میں سنہ و سال بھی کندہ ہے، ان کے عہدِ حکومت میں رومی سلطنت نے عرب میں مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن یہ کوشش پہلی بھی تھی اور آخری بھی، اے لیس گالس، جس نے حضرت عیسیٰؑ سے ۱۸ برس قبل عرب پر چڑھائی کی تھی، بالکل ناکامیاب رہا، اس کے رہبر دغابازی سے اس کو صحرا میں لے گئے اور ریگستان میں پہنچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہوگیا۔

حمیر نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا، اسی زمانہ کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنا شروع کی اور ایک زمانہ میں حمیریوں کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی، اس عہد کا ایک کتبہ جو آجکل ہاتھ آیا ہے، اس پر یہ الفاظ ہیں۔

"رحمان اور مسیح اور روح القدس کی قدرت و فضل و رحمت سے اس یادگاری پتھر پر ابرہہ نے کتبہ لکھا جو کہ بادشاہ حبش ارامیس ذی ان کا نائب الحکومۃ ہے۔"

سبا اور حمیر کی عظمت اور اقتدار اور وسعتِ فتوحات کی روایتیں عرب میں اس قدر متواتر ہیں کہ ان کے قدر مشترک سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اشعار میں بھی کثرت سے واقعات مذکور ہیں، عربوں کے خیال کے موافق سلاطینِ حمیر نے ایران کے انتہائی مقامات فتح کر لئے تھے، ذوالقرنین جس کو عوام سکندر کہتے ہیں، اہل عرب کے نزدیک اسی حمیری خاندان کا فرماں روا تھا، شاہنامہ میں مذکور ہے کہ کیکاؤس کو شاہ ہاماوران نے گرفتار کر لیا تھا۔ علامہ ثعلبی نے تاریخ ایران میں (جو اب یورپ میں چھپ کر شائع ہو گئی ہے) لکھا ہے کہ ہاماوران حمیر کا بادشاہ تھا، اور ہاماوران دراصل وہی عربی حمیر ہے علامہ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سودابہ جو کیکاؤس کی زوجہ تھی، اور فردوسی کے بیان کے موافق سیاؤش پر عاشق ہو گئی تھی، اسی حمیری بادشاہ کی بیٹی تھی، اس کا اصلی نام سعدیٰ تھا، ایرانیوں نے اپنے تلفظ میں اس کو سودابہ کر لیا تھا۔

یورپ کی تحقیقات حال سے بھی سبا اور حمیر کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کا ثبوت ملتا ہے، پروفیسر نولدیکی جرمنی کا مشہور مستشرق لکھتا ہے۔

"ولادتِ مسیح سے ہزار سال قبل جنوبی و غربی عرب یعنی یمن[1] جو حمیر اور سبا کا ملک تھا، اور جو اپنی بارش

---

[1] یہ تمام تفصیل انسائیکلو پیڈیا کے اس آرٹیکل سے ماخوذ ہے، جو جی ڈبلو تھیاچر صاحب نے عرب پر لکھا ہے نیز لٹریری ہسٹری آف دی عربس مؤلفہ رینالڈ نکلسن پروفیسر کیمبرج ص ۲ تا ۶۔

گرما کے باعث زراعت کے لئے نہایت موزوں تھا، تمدن کے اس رتبہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذبات مدح وستایش کو تحریک ہوتی ہے، اور اہل یونان وروم نے اس کو "دولتمند عرب" کا جو لقب دیا تھا، وہ بے جا نہ تھا...... تورات میں متعدد عبارتیں ہیں، جو سبا کی عظمت وشوکت کی شہادت دیتی ہیں۔ چنانچہ ملکہ سبا کا سلیمانؑ سے ملاقات کا قصہ خاص طرح پر قابل ذکر ہے (۱۔ سلاطین۔ ۱۰ آیت ۱تا۱۰)

قوم ثمود کی عمارات سے ڈاؤتی اور یوٹنگ کی محنتوں نے ہم کو روشناس کر دیا ہے، نیز قوم نابت نے جو ثمود سے بہت ملتی جلتی ہے، اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً انہی سے حاصل کی ہے۔

کتابت کا فن جو سبائیوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال سے لیا تھا، اب اس کو خود انھوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا، یہاں تک کہ ایک طرف دمشق اور دوسری جانب ابی سینیا تک اس کو پھیلا دیا[1]۔

نابتی حکومت، جو شام کے حدود سے متصل تھی، اور جو قوم ثمود کی مرادف یا اُن کی قائم مقام تھی، اس کی نسبت فارسٹر صاحب اپنے جغرافیہ میں لکھتے ہیں:۔

"ان مختصر بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ زمانۂ قدیم میں نابت کا نام اور اثر نہ صرف ریگستانی اور صحرائی عرب پر مستولی تھا بلکہ حجاز و نجد کے صوبہائے عظیمہ پر بھی حاوی تھا، نابتی جہاں ایک طرف منافع تجارت سے بہرہ ہونے میں کمال رکھتے تھے، وہاں دوسری طرف بطور پیچھے بنو اسمٰعیل کے خطرات جنگ کے لئے بالکل مستعد رہتے تھے، فلسطین وشام میں ان کی غارت گریوں اور خلیج عرب میں مصری جہازات پر اُن کی رہزنی نے بارہا تاجداران مقدونیہ کو ان کی دشمنی پر آمادہ کر دیا، لیکن روما کی مجموعی قوت سے پیشتر کوئی شے انھیں روک نہ سکی، اور روما کی اطاعت بھی انھوں نے اسٹرابو کے زمانہ میں بالکل مجبورانہ اور مشتبہ انداز سے قبول کیا[2]۔"

یہ قدیم سلطنتوں کا حال تھا، اسلام کے قبل یہ تمام سلطنتیں برباد ہو چکی تھیں، اُن کے بجائے یمن میں صرف بڑے بڑے سردار رہ گئے تھے، جن کو قیل یا مقول کہتے تھے، عراق میں آل منذر کا خاندان قائم تھا، جو فارس کے زیر اثر تھے، خورنق اور سدیر عرب کی مشہور عمارتیں اسی سلسلہ کی یادگار ہیں، شام کے حدود میں غسانی خاندان فرمانروا تھا، جو قیصران روم کا ماتحت تھا، اور جس کا اخیر فرمانروا جبلہ بن الایہم غسانی تھا۔

تہذیب وتمدن تہذیب وتمدن کے لحاظ سے عرب کے مختلف حصے بالکل مختلف حالت رکھتے تھے۔ مانسیو لیبان فرنساوی نے اصول عمران کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوج کمال تک

[1] مورخین کی تاریخ عالم جلد ۸ یعنی ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ تیسری آرٹیکل نوشتہ پروفیسر نولڈیکی ص ۵۔
[2] تاریخی جغرافیہ عرب از دیرنڈ فارسٹر جلد اول ص ۲۲۰ تا ۲۲۱ بحوالہ تمدن عرب۔

پہنچ چکا تھا، کیونکہ اصول ارتقاء کے رو سے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعۃً اعلیٰ درجہ کی تہذیب وتمدن تک نہیں پہنچ سکتی۔

یہ ایک قیاسی استدلال ہے، تاریخ سے بھی اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے بعض حصے مثلاً یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہنچ چکے تھے، یورپ کے محققین آثار قدیمہ جنھوں نے یمن کے آثار قدیمہ کی تحقیقات کی ہے، اور پرانے کتبوں کو پڑھا ہے، وہ یمن کی قدیم تہذیب وتمدن کا اعتراف کرتے ہیں۔

صنعاء اور قلیس کے ذکر میں یاقوت حموی نے معجم میں قدیم آثارات عجیبہ کا تذکرہ کیا ہے، اور گو اس میں کچھ مبالغہ بھی ہے تاہم اصلیت کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔

اسی طرح عرب کے وہ مقامات جو ایران اور شام سے متصل تھے، مثلاً حیرہ جو آل نعمان کا پایۂ تخت تھا، اور حوران جو خاندان غسان کا صدر مقام تھا، تہذیب وتمدن سے خالی نہ تھے۔

مورخین عرب کا دعویٰ ہے کہ یمن نے ایک زمانہ میں اس حد تک ترقی کی تھی کہ وہاں کے سلاطین نے تمام ایران فتح کر لیا تھا، چنانچہ سمرقند کی وجہ تسمیہ یہ بتلاتے ہیں کہ یمن کا ایک بادشاہ جس کا نام شمر تھا، اُس نے سمرقند کو کھدوا کر برباد کر دیا تھا، اس بنا پر ایرانی اس مقدس کو شمر کند کہنے لگے، پھر معرب ہو کر سمرقند ہو گیا۔

عظیم الشان قلعوں اور عمارتوں کے آثار جو اب بھی کچھ کچھ باقی ہیں، اس بات کی قطعی شہادت ہیں کہ اس ملک میں کبھی اعلیٰ درجہ کا تمدن موجود تھا، علامہ ہمدانی نے اکلیل میں تمام آثار قدیمہ کا ذکر کیا ہے، چنانچہ صفۃ جزیرۃ العرب میں لکھتے ہیں۔

المشهور من محافد اليمن وقصورها القديمة التي ذكرتها العرب في الشعر والمثل ...... كثيرة الذي فيها من الشعر باب واسع وقد جمع ذالك كله الكتاب الثامن من الاكليل۔

یمن کے مشہور قدیم قصر اور ایوان جن کا ذکر اہل عرب نے اشعار اور امثال میں کیا ہے.... کثرت سے ہیں، اور ان کے متعلق اشعار کا ایک دفتر ہے، اکلیل کے آٹھویں باب میں ان سب کو جمع کر دیا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ میں اس موقع پر صرف اُن کے نام گنا دیتا ہوں، اور وہ یہ ہیں۔

غمدان، تُلغم، ناعط، صِرواح، سَلحین، ظَفار، هكر، ضهر، شِبام، غیمان، ینیون، ریام، براقش، مَعین، رَوثان، اریاب، هِند، هُنید، عُمران، نُجَیر۔

ان میں سے غمدان اور ناعط کا حال معجم البلدان میں تفصیل سے مذکور ہے، اور اس کی عظمت ورفعت کے متعلق ایسی باتیں نقل کی ہیں، جن پر ایشیائی مبالغہ کا دھوکہ ہوتا ہے، سلحین کی نسبت لکھا ہے کہ ستر برس میں تعمیر ہوا، شبام کے حال میں لکھا ہے:۔

لهم فيها حصون عجيبة هائلة۔ ان میں اُن کے متعدد ہیبت انگیز قلعے ہیں۔

قلعۂ ناعط وہب بن منبہ کے زمانہ تک موجود تھا، اس کے ایک کتبہ کو محدث موصوف نے پڑھا تو معلوم ہوا

[1] ج ۱ ص ۲۰۳، س۔

کہ سولہ سو برس کی تعمیر ہے۔ آج کل یورپ کے محققین نے ان مقامات میں جا کر جو تحقیقات کی ہے اس سے بھی حیرت انگیز تمدن کی تصدیق ہوتی ہے، تھیاچر صاحب اپنے آرٹیکل میں لکھتے ہیں[1]:

"جنوبی عربستان میں جہاں حضرت عیسیٰؑ سے صدیوں پہلے ایک ترقی یافتہ تمدن موجود تھا، قلعوں اور شہر پناہوں کے آثار اب تک موجود ہیں، اور ان کا ذکر متعدد سیاحوں نے کیا ہے......

یمن اور حضر موت میں یہ آثار کثرت سے ہیں، اور اکثر پر اب تک کتبے موجود ہیں، صنعا کے قریب ایک قلعہ تھا، جس کو قزوینی نے آثار البلاد میں دنیا کے عجائب ہفت گانہ میں سے ایک قرار دیا ہے (دیگر قلعوں کے لئے دیکھو جرنل جرمن اورنٹیل سوسائٹی جلد ا صفحہ ۲۰ سے آگے)، مآرب جو قدیم سبائی دارالسلطنت تھا، اس کے آثار قدیمہ کو ارنو، ہالیوے اور گلاذر نے دیکھا ہے۔

مآرب کے مشہور آثار میں سے ایک بڑی خندق کے آثار باقی ہیں، ان کو دیکھ کر عدن کے دوبارہ تعمیر شدہ حوض یاد آتے ہیں، ان کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی، جب گلازر نے وہ دو طویل الذیل کتبے شائع کئے جن میں اُن کے عیسوی قرن پنجم و ششم میں دوبارہ تعمیر کا ذکر ہے، یمن میں بمقام حران ایک اور خندق ہے جس کا طول تقریباً چار سو پچاس فٹ ہے"۔

لیکن عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب و تمدن کی یہ حالت نہ تھی، عربی زبان نہایت وسیع ہے، باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق ہے، ان کے لئے خاص عربی زبان میں الفاظ نہیں ملتے بلکہ ایران یا روم سے مستعار آئے ہیں، سکہ کے لئے ایک لفظ بھی موجود نہیں، درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں، درہم یونانی لفظ درخم ہے اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں ڈرام ہو گیا، چراغ معمولی چیز ہے، تاہم اس کے لئے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا، چراغ کو لے کر سراج کر لیا، پھر ایک مصنوعی لفظ بنایا، مصباح یعنی ایک آلہ ہے جس سے صبح بنا لی جاتی ہے، کوزہ کے لئے کوئی لفظ نہیں، کوزہ کو کوز کر لیا ہے، لوٹے کو ابریق کہتے ہیں، جو آب ریز کا معرب ہے، تشت فارسی لفظ تھا، اسی کو عربی میں طست کر لیا ہے، پیالہ کو کاس کہتے ہیں، وہی کاسہ فارسی لفظ ہے کرتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں، یہ بھی فارسی ہے، پاجامہ کو سروال کہتے ہیں جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لفظ نہ تھے، تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لئے کہاں سے لفظ آتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی آس پاس کے ممالک کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر کی تھی، اس لئے جو مقامات اُن ممالک سے دور تھے، اُسی اصلی حالت پر رہ گئے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے، مسئلہ حجاب کے شان نزول میں بخاری وغیرہ میں مذکور ہے کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرور نہ تھی مستورات رفع حاجت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں، ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت تک چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے جو رہ جاتا تھا وہی آٹا ہوتا تھا، بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو

[1] دیکھو انسائیکلو پیڈیا مضمون "عرب"۔ [2] بیت الخلاء۔ لیٹرین۔

گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے، ابو داؤد میں ایک صحابی کی روایت ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں تھا، لیکن میں نے آپ سے حشرات الارض[1] کا حرام ہونا نہیں سُنا[2]، اگرچہ اس حدیث کی شرح میں محدثین لکھتے ہیں کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حشرات الارض کی حرمت نہیں بیان کی، لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے، تاریخ اور ادب میں بتصریح موجود ہے کہ عرب کھنکھجورا، گوہ، گرگٹ، اسی اور جانوروں کا چمڑا کھاتے تھے۔

عرب کے مذاہب

عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب تھے، بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہے زمانہ یا فطرت (قانون قدرت) ہے، خدا کوئی چیز نہیں، ان ہی لوگوں کی نسبت قرآن مجید میں ہے۔

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ-۳)	اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے ہماری دنیا کی زندگی ہے ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو مارتا ہے تو زمانہ مارتا ہے۔

بعض خدا کے قائل تھے، لیکن قیامت اور جزا و سزا کے منکر تھے، اُن کے مقابلہ میں قرآن مجید نے قیامت کے ثبوت پر اس طرح استدلال کیا ہے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ (یٰسین-۵)	کہہ دو کہ ان ہڈیوں کو، وہی دوبارہ زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا۔

بعض خدا اور جزا و سزا کے بھی قائل تھے لیکن نبوت کے منکر تھے، ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ (الفرقان-۱)	اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازار میں چلتا پھرتا ہے۔
قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا (بنی اسرائیل-۱۱)	کہتے ہیں کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟

ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی پیغمبر ہو سکتا ہے تو اس کو فرشتہ ہونا چاہیئے جو حاجات انسانی سے منزہ ہو، لیکن عموماً لوگ بت پرست تھے، وہ بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ کہتے تھے کہ خدا تک پہنچنے کے وسیلے ہیں۔

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (زمر-۱)	ہم ان بتوں کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں۔

قبیلۂ حمیر جو یمن میں رہتا تھا، آفتاب پرست تھا، کنانہ چاند کو پوجتے تھے، قبیلۂ بنی تمیم دبران کی عبادت کرتا تھا، اسی طرح قیس، شعریٰ کی، قبیلۂ اسد عطارد کی، اور لخم و جذام مشتری کی پرستش کرتے تھے[3]۔ مشہور بتوں اور اُن کے پوجنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

[1] حشرات الارض کیڑے مکوڑے کو کہتے ہیں۔
[2] ابو داؤد جلد دوم صفحہ ۱۷۸، باب فی اکل حشرات الارض۔
[3] یہ تمام تفصیل "ملل و نحل" شہرستانی میں مذاہب عرب کے ذکر میں ہے۔

نام بُت	مقام	قبیلہ جو اس بُت کو پوجتے تھے
لات۔	طائف۔	ثقیف۔
عُزّیٰ۔	مکہ معظمہ۔	قریش وکنانہ۔
منات۔	مدینہ منورہ۔	اوس، خزرج اور غسان۔
ودّ۔	دومۃ الجندل۔	کلب۔
سُواع۔		ہذیل۔
یغوث۔		مذحج اور قبائل یمن۔
یعوق۔		ہمدان۔

سب سے بڑا بُت ہُبل تھا جو کعبہ کی چھت پر منصوب تھا، قریش لڑائیوں میں اُس کی جے پکارتے تھے۔

عرب میں بُت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحی تھا اس کا اصلی نام ربیعۃ ابن حارثۃ تھا، عرب کا مشہور قبیلہ خزاعہ اسی کی نسل سے ہے، عمرو سے پہلے جرہم کعبہ کے متولی تھے، عمرو نے لڑ کر جرہم کو مکہ سے نکال دیا اور خود حرم کا متولی ہو گیا، وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا، وہاں کے لوگوں کو بُت پوجتے دیکھا، تو پوچھا کہ اُن کو کیوں پوجتے ہو انھوں نے کہا یہ حاجت روا ہیں، لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں، قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں، عمرو نے چند بُت اُن سے لے لئے اور لاکر کعبہ کے آس پاس قائم کئے، کعبہ چونکہ عرب کا مرکز تھا، اس لئے تمام قبائل میں بُت پرستی کا رواج ہو گیا، ان میں سب سے قدیم بُت مناۃ تھا، یہ سمندر کے کنارے قدید کے قریب نصب تھا، اوس اور خزرج یعنی مدینہ کے لوگ اسی پر قربانی چڑھاتے تھے، اور جب کعبہ کا حج کر کے آتے تھے تو احرام یہیں اتارتے تھے، ہذیل اور خزاعہ بھی اس کی پرستش کرتے تھے۔[1]

یاقوت حموی نے معجم البلدان (ذکر مکہ) میں لکھا ہے کہ عرب میں بت پرستی کی عام اشاعت کی وجہ یہ ہوئی کہ قبائل عرب جو تمام اطراف سے حج کو آتے تھے، واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھروں کو اٹھا لیتے تھے، اور اُن کو اصنام کعبہ کی صورت پر تراش کر اُن کی عبادت کرتے تھے۔

الله کا اعتقاد عرب گو قریباً سب کے سب بت پرست تھے، لیکن اس کے ساتھ یہ اعتقاد ان کے دل سے کبھی نہیں گیا، کہ اصلی خدا سے برتر اور چیز ہے، اور وہی تمام عالم کا خالق ہے۔ اس خالق اکبر کو وہ الله کہتے تھے قرآن مجید میں ہے:

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ فَأَنّٰى يُؤْفَكُونَ (عنکبوت - ۶۰)

اور ان لوگوں (کافروں) سے تو پوچھ کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا، اور چاند اور سورج کو کس نے تابعدار بنا رکھا ہے تو بول اٹھیں گے کہ اللہ پھر کدھر بہکے جا رہے ہیں

[1] یہ تمام تفصیل معجم البلدان ذکر منات میں ہے۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ (عنکبوت)

پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا ہی کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں، پھر جب خدا ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں۔

قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے جس حقیقت کا اظہار کیا، آج تحقیقات آثار قدیمہ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے مذاہب واخلاق کی انسائیکلوپیڈیا میں مشہور مستشرق نولدکی کا جو قول نقل کیا ہے اسکے اقتباسات حسب ذیل ہیں:

"اللّٰہ" جو صفا کے کتبوں میں "ہلہ" لکھا ہوا ہے، نباتی اور دیگر قدیم باشندگان عرب شمالی کے نام کا ایک جز تھا مثلاً زید اللّٰہی ...... نباتی کتبات میں اللہ کا نام بطور ایک علیحدہ معبود کے نہیں ملتا، لیکن صفا کے کتبات میں ملتا ہے، متاخرین مشرکین میں اللہ کا نام نہایت عام ہے، ولہاسن نے عرب قدیم کے لٹریچر میں بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں، جن میں اللہ کا لفظ بطور ایک معبود اعظم کے مستعمل ہوا ہے، نباتی کتبات میں ہم بار بار کسی دیوتا کا نام پاتے ہیں، جس کے ساتھ اللہ کا لقب شامل ہے، اس سے ولہاسن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ کا لقب جو پہلے مختلف معبودوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، رفتہ رفتہ زمانہ مابعد میں صرف ایک عظیم ترین معبود کے لئے بطور علم کے مخصوص ہو گیا"

نصرانیت اور یہودیت اور مجوسیت اگرچہ زمانہ اور مدت کا تعین مشکل ہے، لیکن یہ تینوں مذہب ایک مدت دراز سے عرب میں رائج ہو چکے تھے، علامہ ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے کہ قبائل ربیعہ و غسان نصرانی تھے، قضاعہ میں بھی اس مذہب کا اثر پایا جاتا تھا، نصرانیت کو اس قدر ترقی ہو چکی تھی کہ خود مکہ معظمہ میں ایسے لوگ موجود تھے مثلاً ورقہ بن نوفل، جو عبرانی زبان میں انجیل کو پڑھ سکتے تھے، متعدد ایسے لوگ تھے جنھوں نے شام میں جا کر تعلیم پائی تھی۔

حمیر، بنو کنانہ، بنو حرث بن کعب، کندہ، یہ قبائل یہودی تھے، مدینہ منورہ میں یہود نے پورا غلبہ پالیا تھا اور تورات کی تعلیم کے لئے متعدد درسگاہیں قائم تھیں، جن کو بیت المدارس کہتے تھے، حدیث کی کتابوں میں اسی نام سے ان کا ذکر آتا ہے، قلعہ خیبر کی تمام آبادی یہودی تھی، امراء القیس کا ہم عصر مشہور شاعر سموئل بن عادیا جس کی وفاداری آج تک عرب میں ضرب المثل ہے، یہودی تھا۔

اہل کتاب کی روایتیں مکہ معظمہ میں اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن نازل ہوتا تھا، اور اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تھے، تو کفار بدگمانی کرتے تھے، کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپ کو سکھاتا ہے، خود قرآن مجید میں ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ (نحل - ۱۴)

اور ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ محمد کو کوئی آدمی سکھاتا ہے۔

قرآن مجید میں اس خیال کا ابطال بھی کر دیا ہے جس کی تفصیل مناسب وقت پر آئے گی۔

قبیلہ تمیم مجوسی تھا، زرارہ تمیمی نے جو اس قبیلہ کا مشہور رئیس تھا، اسی بنا پر اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔[1]

[1] ج ا ص ۲۶۶۔

گو اس پر اس کو ندامت ہوئی، اقرع بن حابس بھی مجوسی تھا۔

مذہب حنیفی

دین ابراہیمی کا ام الاصول توحید خالص تھی زمانہ کے امتداد اور جہالت کے شیوع سے یہ اصول اگرچہ شرک آلود ہو گیا تھا، یہاں تک کہ خود خانۂ خدا میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، تاہم بالکل فنا نہیں ہو سکتا تھا عرب میں کہیں کہیں اس کا دھندلا سا نشان نظر آتا تھا، جو لوگ صاحب بصیرت تھے، ان کو یہ منظر نہایت نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا کہ انسان عاقل، جمادِ لایعقل کے سامنے سر جھکائے، اس بناء پر بت پرستی کی برائی کا خیال بہتوں کے دل میں آیا، لیکن اس کا تاریخی زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی بت کے سالانہ میلہ میں ورقہ ابن نوفل، عبداللہ بن جحش عثمان بن الحویرث زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے، ان لوگوں کے دل میں دفعۃً یہ خیال آیا کہ یہ کیا بے ہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں، جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ چاروں قریش کے خاندان سے تھے ورقہ حضرت خدیجہؓ کے برادر عم زاد تھے، زید حضرت عمرؓ کے چچا تھے، عبداللہ بن جحش حضرت حمزہؓ کے بھانجے تھے عثمان عبدالعزیٰ کے پوتے تھے۔

زید دین ابراہیمی کی تلاش میں شام گئے، وہاں یہودی اور عیسائی پادریوں سے ملے، لیکن کسی سے تسلی نہیں ہوئی، اس لئے اس اجمالی اعتقاد پر اکتفا کیا کہ "میں ابراہیم کا مذہب قبول کرتا ہوں"۔ صحیح بخاری میں (باب بنیان الکعبہ سے پہلے) حضرت اسماءؓ (دختر حضرت ابوبکر صدیقؓ) سے روایت ہے کہ میں نے زید کو اس حالت میں دیکھا کہ کعبہ سے پیٹھ لگائے لوگوں سے کہتے تھے "اے اہل قریش، تم میں سے کوئی شخص بجز میرے، ابراہیم کے دین پر نہیں ہے۔"

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، زید ہی پہلے شخص ہیں جس نے اس رسم کی مخالفت کی، جب کوئی شخص ایسا ارادہ کرتا تو وہ جا کر اس لڑکی کو مانگ لیتے، اور خود اس کی پرورش کرتے۔

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے زید کو دیکھا تھا اور اُن سے صحبت رہی تھی، ورقہ اور عبداللہ بن جحش اور عثمان بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے۔

اسی زمانہ کے قریب امیہ بن ابی صلت نے جو طائف کا رئیس اور مشہور شاعر تھا، بت پرستی کی مخالفت کی، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں زبیر بن بکار کی سند سے لکھا ہے کہ امیہ نے زمانہ جاہلیت میں آسمانی کتابیں پڑھی تھیں اور بت پرستی چھوڑ کر دین ابراہیمی اختیار کر لیا تھا۔

اُمیہ کا دیوان آج بھی موجود ہے، اگرچہ اس کا بڑا حصہ جعلی ہے، تاہم اصلی کلام بھی اس میں پایا جاتا ہے، وہ غزوۂ بدر تک زندہ رہا، عتبہ جو رئیس مکہ اور امیر معاویہؓ کا نانا تھا، امیہ کا ماموں زاد بھائی تھا، امیہ نے اس کے قتل کی خبر سُنی تو اس کو سخت صدمہ ہوا، اور نہایت پُر درد مرثیہ لکھا، غالباً اسی کا اثر تھا کہ اسلام قبول نہ کر سکا۔

شمائل میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم ردیف تھے۔ انھوں نے امیہ کا ایک

لے معارف ابن قتیبہ ۲ے سیرت ابن ہشام مطبوعہ مصر ص ۷۶۔

شعر پڑھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اور" انھوں نے سو شعر پڑھے، ہر شعر کے ختم ہونے پر آپ فرماتے جاتے تھے کہ "اور"۔ اخیر میں آپ نے فرمایا کہ "امیہ مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا"۔

ابن ہشام نے بت پرستی کی مخالفت کرنے والوں میں انہی چاروں کا نام لکھا ہے، لیکن اور تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں اور متعدد اہل نظر پیدا ہو گئے تھے، جنھوں نے بت پرستی سے توبہ کی تھی، ان میں سب سے زیادہ مشہور شخص عرب کا نامور خطیب قس بن ساعدۃ الایادی ہے، اس کا تذکرہ آگے آتا ہے، ایک شخص قیس بن نشبہ تھا جس کی نسبت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں خدا پرست ہو چکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر مشرف بہ اسلام ہوا۔

یہ تحقیق نہیں کہ دین ابراہیمی کو دین حنیفی کیوں کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن اس کے معنی میں اختلاف ہے، مفسرین لکھتے ہیں کہ چونکہ اس دین فطرت میں بت پرستی سے انحراف تھا اس لئے اس کو حنیفی کہتے ہیں کیونکہ حنف کے معنی انحراف کے ہیں، عبرانی اور سریانی زبان میں حنیف کے معنی منافق اور کافر کے ہیں، ممکن ہے کہ بت پرستوں نے یہ لقب دیا ہو اور موحدین نے فخریہ قبول کر لیا ہو۔

یہ امر اکثر روایتوں سے ثابت ہے کہ عرب اور خصوصاً مکہ اور مدینہ میں متعدد اشخاص بت پرستی کے منکر ہو گئے تھے، اور ملت ابراہیمی کی جستجو میں تھے، یہ اس لئے کہ مجدد ملت ابراہیمی کے ظہور کا وقت قریب آ گیا تھا۔

ان چند راہ طلب اور حقیقت جو اشخاص کے وجود کی بناء پر مصنفین یورپ کہتے ہیں کہ مذہب صحیح اور توحید خالص کا رواج عام عرب میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن اگر یہ صحیح ہے تو یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اسلام کے ظہور پر اس قدر کیوں ہنگامہ برپا ہوا۔

کیا عرب میں ان مذاہب نے کچھ اصلاح کی

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، عرب میں تمام مشہور مذاہب موجود تھے، یہودیت بھی نصرانیت بھی، مجوسیت بھی، حنیفیت بھی، اور عقلی بلند پروازی کی معراج الحاد بھی، لیکن ان سب کا نتیجہ کیا تھا عقائد کے لحاظ سے یا تو خداؤں کی وہ کثرت جس کو نصرانیت نے بہت گھٹایا، تاہم تین کی تعداد سے کم نہ کر سکی اس کے ساتھ یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰؑ خود سولی پر چڑھ کر تمام بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ بن گئے یا توحید تھی لیکن خدا اس قسم کا تھا جو آدمیوں سے کشتی لڑتا تھا۔

بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہ تھی، قماربازی، شراب خوری، زناکاری کا رواج عام تھا بے حیائی کی یہ حالت کہ سب سے بڑا نامور شاعر امراء القیس جو شہزادہ بھی تھا قصیدہ میں اپنی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔

لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کا پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا عموماً جائز

لے یہ مارگولیوس کا بیان ہے ۲ے توراۃ تکوین آیت ۲۲ تا ۹۰ میں حضرت یعقوب کے خدا سے کشتی لڑنے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔

تھا، عیسائیوں کے بیان کے مطابق عرب قبل اسلام تمام مذاہب میں سب سے زیادہ عیسائیت سے متاثر تھا؛ تاہم اس اثر کا کیا نتیجہ تھا؟ اس کو خود عیسائی مورخین کی زبانی سے سننا چاہیئے، ایک عیسائی مورخ لکھتا ہے ؎۱

"عیسائیوں نے عرب کو پانچ سو برس تعلیم وتلقین کی، اس پر بھی خال خال عیسائی نظر آتے تھے یعنی بنو حارث نجران میں، بنو حنیف یمامہ میں اور کچھ بنی طے میں عیسائی تھے، باقی خیریت ..... بالآخر عرب کو حیث المذہب دیکھئے، تو اس کی سطح پر عیسائیوں کی ضعیف کوششوں کی کچھ خفیف سی موجیں لہراتی نظر آتی تھیں، اور یہود کی قوت بھی کبھی بڑی شدت سے طغیانی کرتی نظر آتی تھی، لیکن بت پرستی اور بنو اسماعیل کے بیہودہ اعتقادات کا دریا ہر سمت سے جوش مارتا ہوا کعبہ سے آکر ٹکراتا تھا۔"

یہ حالت صرف عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ تمام دنیا میں یہی تاریکی چھائی ہوئی تھی (اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصے میں آئے گی) کیا اس عام ظلمت، اس عالمگیر تیرگی، اس وسیع اور ہمہ گیر تاریکی میں ایک آفتاب عالمتاب کی حاجت نہ تھی۔

٭

؎۱ میور صاحب کی لائف آف محمد جلد ا دیباچہ۔

سلسلۂ اسماعیلی

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ مورخین عرب نے عرب کی تین قسمیں کی ہیں۔

عرب کی وہ قدیم قومیں جو بالکل برباد ہو گئیں مثلاً طسم وجدیس وغیرہ۔

خالص عرب جو قحطان کی اولاد ہیں مثلاً اہل یمن اور انصار اور تیسرا سلسلہ اسماعیلی۔

حضرت اسمٰعیلؑ جب مکہ میں آباد ہوئے تو حوالی مکہ میں بنو جرہم آباد تھے، حضرت اسمٰعیلؑ نے اس خاندان میں شادی کی، اس سے جو اولاد ہوئی وہ عرب مستعربہ کہلاتی ہے، اب عرب کا بڑا حصہ اسی خاندان سے ہے۔

پیغمبر اسلام اور خود اسلام کی تاریخ تمام تر اسی اخیر سلسلہ سے وابستہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ ہی کے خاندان سے ہیں اور جو شریعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت ہوئی، وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو عطا ہوئی تھی قرآن مجید میں ہے۔

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ هٰذَا (حج ۔۱۰) | تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب، اسی نے اس سے پہلے تمہارا نام مسلم رکھا (اور اس قرآن میں بھی)

لیکن یورپ کے بہت سے متعصب مورخ سرے سے ان حقائق کے منکر ہیں، یعنی نہ حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ عرب میں آئے نہ انھوں نے کعبہ کی بنیاد ڈالی، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں۔

چونکہ ان مباحث نے مذہبی تعصب کی صورت اختیار کر لی ہے اس لئے یہ توقع مشکل ہے کہ ہم اس بحث کو اس طرح طے کر سکیں گے کہ استدلال کی بنیاد یورپ کے مسلمات پر رکھی جائے۔

جو واقعات مختلف فیہ ہیں، بہت ہیں، لیکن اصولی امور صرف دو ہیں، جن میں دونوں فریق کا کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتا، یہ اصول جس فریق کے موافق طے ہوں اس کے فرعی جزئیات بھی اسی کے موافق تسلیم کر لینے چاہئیں اصول مذکورہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ عرب میں آکر آباد ہوئے یا نہیں؟

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کو قربانی کرنا چاہا تھا یا حضرت اسمٰعیلؑ کو؟

حضرت اسمٰعیلؑ کہاں آباد ہوئے

یہود مدعی ہیں کہ حضرت اسحٰقؑ ذبیح ہیں، اس بنا پر وہ قربانی گاہ کا موقع شام بتاتے ہیں، لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسحٰقؑ نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ تھے تو قربانی گاہ کے موقع کی نسبت عرب ہی کی روایتیں تسلیم کرنی پڑیں گی، اور اس حالت میں تاریخ کی تمام کڑیاں متصل ہو جائینگی۔

تورات میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اولاد حضرت ہاجرہ کے بطن سے ہوئی، جس کا نام اسمٰعیلؑ رکھا گیا، حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے، حضرت اسمٰعیلؑ جب بڑے ہوئے تو حضرت سارہ نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضرت اسحٰق کے ساتھ گستاخی کرتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ ہاجرہؑ اور اس کے

؎۱ اس کا مرجع بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا ہے اور بعض نے اللہ تعالیٰ کو اور یہی صحیح ہے جیسا کہ آیات سے صاف ظاہر

بیٹے کو گھر سے نکال دو، ان واقعات کے بعد توراۃ کے خاص الفاظ یہ ہیں:-

تب ابراہیمؑ نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہؑ کے کاندھے پر رکھا اور اس لڑکے کو بھی رخصت کیا، وہ روانہ ہوئی، بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا، اور آپ اسکے سامنے ایک تیر کے پٹے پر دور جا کر بیٹھی، کیونکہ اس نے کہا میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں، سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کر روئی، تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا، اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا، مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے، خدا نے سنی، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا، اور جا کر اپنی مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا، اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا، اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہو گیا، اور وہ فاران کے بیابان میں رہا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت بیاہنے کو لی۔ (توراۃ سفر پیدائش باب ۲۱)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ جب گھر سے نکالے گئے تو بالکل بچہ تھے، چنانچہ حضرت ہاجرہؑ نے مشک کو اور ان کو کاندھے پر اٹھایا، عربی توراۃ میں صاف یہ الفاظ ہیں۔

واضعًا ایاھا علی کتفھا والولد۔ حضرت ابراہیمؑ نے مشک اور بچہ دونوں کو ہاجرہ کے کندھے پر رکھا۔

لیکن توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی، اور جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کا ختنہ کیا تو حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر ۱۳ برس کی اور حضرت ابراہیمؑ کی ننانوے برس کی تھی[1] یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے گھر سے نکالے جانے کا واقعہ ختنہ کے بعد کا ہوگا، اس لئے اس وقت قطعًا ان کی عمر ۱۳ برس سے زیادہ تھی اور اس سن کا لڑکا اتنا چھوٹا نہیں ہوتا کہ ماں اسے کندھے پر اٹھائے پھرے، اس واقعہ سے غرض یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر اس وقت اتنی ہو چکی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ ان کو اور ان کی والدہ کو اصلی مقامِ سکونت سے کسی اور مقام پر لا کر آباد کر سکتے تھے۔

توراۃ کی عبارتِ مذکورہ میں تصریح ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ فاران میں رہے اور تیر اندازی کرتے رہے، عیسائی کہتے ہیں کہ فاران اس صحرا کا نام ہے جو فلسطین کے جنوب میں واقع ہے، اس لئے حضرت اسمٰعیلؑ کا عرب میں آنا خلافِ واقعہ ہے جغرافیہ دانانِ عرب عمومًا متفق ہیں کہ فاران حجاز کے پہاڑ کا نام ہے، چنانچہ معجم البلدان میں صاف تصریح ہے لیکن عیسائی مصنفین اس سے اتفاق نہیں کر سکتے، اس کا فیصلہ ایک بڑی طول طویل بحث پر مبنی ہے جو مباحثہ اور مناظرہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، اس لئے ہم اس کو قلم انداز کرتے ہیں، البتہ اس قدر بتانا ضروری ہے کہ عرب کی حد شمالی کسی زمانہ میں کس حد تک وسیع تھی۔

موسیو لیبان، تمدنِ عرب میں لکھتے ہیں۔

[1] پیدائش باب ۱۷، ۲۴- ۲۵

"اس جزیرے کی حد شمالی اس قدر صاف اور آسان نہیں ہے یعنی یہ حد اس طرح پہ قائم ہوتی ہے کہ غزہ سے جو فلسطین کا ایک شہر اور بحر متوسط پر واقع ہے، ایک خط جنوب بحر لوط تک کھینچا جائے اور وہاں سے دمشق اور دمشق سے دریائے فرات تک، اور دریائے فرات کے کنارے کنارے لا کر خلیج فارس میں ملا دیا جائے، پس اس خط کو عربستان کی حد شمالی کہہ سکتے ہیں۔"

اس بنا پر عرب کے حجازی حصہ کا فاران میں محسوب ہونا خلافِ قیاس نہیں، توراۃ میں جہاں حضرت اسماعیلؑ کی جائے سکونت کا بیان ہے، وہاں یہ الفاظ ہیں:-

"اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے سور کو جاتے ہیں، بستے تھے۔"

اس تحدید میں مصر کے سامنے جو زمین پڑتی ہے وہ عرب ہی ہو سکتا ہے، نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں جس قدر اعتنا ہے، بنو اسرائیل کے ساتھ ہے، بنی اسمٰعیل کا ذکر محض ضمنی طور پر آجاتا ہے، اور اس وجہ سے حضرت اسمٰعیل کا عرب میں آباد ہونا بہ تصریح نہیں ملتا، لیکن مختلف تلمیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ کا عرب میں آباد ہونا ایک مسلم امر تھا، عہد جدید میں جس کو عیسائی وحی الٰہی سمجھتے ہیں، پولوس کا ایک خط گلیتون کے نام ہے، اس میں یہ عبارت ہے۔

"ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی سے، دوسرا آزاد سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا، سو وعدے کے طور پر، یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہے، اس لئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہے، یہ ہاجرہ ہے، کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم کا جواب ہے۔"

اگرچہ معلوم نہیں کہ اصلی عبارت کیا تھی، اردو اور عربی دونوں ترجمے ناصاف ہیں، تاہم اس قدر واضح ہے کہ پولوس جو حضرت عیسیٰؑ کے سب سے بڑے جانشین ہیں، حضرت ہاجرہؑ کو عرب کا کوہ سینا کہتے تھے، اگر حضرت ہاجرہ عرب میں آباد نہ ہوئی ہوتیں تو ان کو عرب کا کوہ سینا کہنا کیا معنی رکھتا ہے آگے چل کر مکہ کے ذکر میں یہ بحث زیادہ مؤید ہو جائے گی۔

ذبیح کون ہے؟ توراۃ اگرچہ یہودیوں کی عدم احتیاط، اغراض ذاتی اور زمانہ کے انقلابات سے سرتاپا مسخ ہو گئی ہے اور خصوصًا پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس میں جو تصریحات اور تلمیحات تھیں، یہود کے دست تصرف نے ان کو بالکل برباد کر دیا ہے، تاہم حقائق کے عناصر اب بھی ہر جگہ موجود ہیں، توراۃ میں گو تصریحًا حضرت اسحاقؑ کا ذبیح ہونا لکھا ہے لیکن مطاویِ کلام میں اس بات کے قطعی دلائل موجود ہیں کہ وہ ہرگز ذبیح نہ تھے، اور نہ ہو سکتے تھے، امور ذیل کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

۱۔ شریعتِ سابقہ کے رو سے قربانی صرف اُس جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی، جو پہلوٹا بچہ ہو، اسی بنا پر ہابیل نے جن مینڈھوں کی قربانی کی تھی، وہ پہلونٹے بچے تھے۔

خدا نے حضرت موسیٰ سے جہاں لاویوں کے متعلق احکام ارشاد فرمائے وہاں فرمایا ہے۔

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس کیونکہ بنو اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلونٹا بچہ

له سفر تکوین باب ۲۵ آیت ۱۸ ته باب ۴ آیت ۲۴-

والبهائم۔ میرے لئے ہے (عدد ۸-۱۷)

۲- پہلونٹے بچہ کی افضلیت کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتی، توراۃ میں ہے کہ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں، ایک محبوبہ ہو اور دوسری غیر مرغوبہ، تو فضیلت اُسی اولاد کو ہوگی جو پہلونٹی ہو، گو وہ غیر مرغوبہ سے ہو۔

فانه اول قدرته وله حق البکوریة۔ (سفر تثنیہ، اصحاح ۲۱، آیت ۱۵ و ۱۷)

کیونکہ وہ اس کی پہلی قدرت ہے، اور اسی کو اولادِ اولین ہونے کا حق ہے۔

۳- جو اولاد خدا کو نذر کر دی جاتی تھی، اس کو باپ کا ترکہ نہیں ملتا تھا، توراۃ میں ہے۔

فی ذلك الوقت انذر الرب سبط لاوی لیحملوا تابوت عهد الرب ولکی یقفوا امام الرب لیخدموه ویبارکوا باسمه الی هذا الیوم لاجل ذالك لم یکن للاوی قسم ولا نصیب مع اخوته الرب هو نصیبه (توراۃ، اصحاح ۱۰- آیت ۸ و ۹)

تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اس لئے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے اور تاکہ خدا کے آگے کھڑا ہو تاکہ وہ خدا کی خدمت کریں اور اس کے نام سے آج تک برکت لیں، یہی وجہ ہے کہ لاویوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصہ اور ترکہ نہیں ملا، کیونکہ ان کا حصہ خدا ہے۔

۴- جو شخص خدا کی نذر کر دیا جاتا تھا، وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا، جس طرح آج حج میں احرام کھولنے کے وقت بال منڈاتے ہیں، توراۃ میں ہے۔

فهاانك تحملین وتلدین ابنا ولا یعلو موسی راسه لان الصبی یکون نذیرا للّٰه (توراۃ، قضاۃ، اصحاح ۱۳-۴)

اب تو حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی اور اس کے سر پر استرا نہ پھیرا جائے کیونکہ یہ بچہ خدا کے لئے نذر کیا جائے گا۔

۵- جو شخص خدا کو خادم بنایا جاتا تھا، اس کے لئے خدا کے سامنے کا لفظ استعمال کرتے تھے (توراۃ سفر عدد ۶-۱۶ و ۲۰ و سفر تکوین، ۱۷ و تثنیہ ۱۰-۸)

۶- حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ وہ بیٹا قربانی کیا جائے جو اکلوتا ہو، اور محبوب ہو (توراۃ، تکوین، اصحاح ۲۲ آیت ۲)

اب اصل مسئلہ پر غور کرو، لیکن پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں قربانی کرنا، اور خدا پر نذر چڑھانا ایک بات تھی، یعنی دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ بچہ کو فلاں معبد میں قربانی چڑھا دو، تو اس کے یہ معنی تھے کہ وہ اس معبد کی خدمت اور مجاورت کے لئے گھر سے الگ کر دیا جائے، لیکن یہ لفظ جب جانوروں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا تو حقیقی قربانی کے معنی مراد ہوتے تھے، توراۃ میں خدا کی زبان سے مذکور ہے۔

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبهائم (عدد اصحاح ۸-۱۷)

کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلونٹا بچہ میرے لئے ہے۔

اسی اصحاح میں تصریح کے ساتھ مذکور ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم بنی اسرائیل میں سے لاویوں کو لو، ۱۰- ان کو خدا کے سامنے پیش کرو کہ خدا کے لئے خاص کر دیئے جائیں، اور یہ لوگ دو گابوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیں جو

قربانی کی جائیں (اختصاراً)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس سے بھی یہی مراد تھی کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں، حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اس خواب کو عینی اور حقیقی سمجھا اور اس لئے بعینہٖ اس کی تعمیل کرنی چاہی لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ تمثیلی خواب تھا، اس بناء پر حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو خانۂ خدا کی خدمت کے لئے خاص کر دیا، اور جو شرطیں قربانی کی تھیں قائم رکھیں۔

بیان مذکورۂ بالا کے ذہن نشین کرنے کے بعد دلائل ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

(۱) حضرت اسحاقؑ کی ولادت حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد ہے، اس بناء پر حضرت اسحاقؑ اکلوتے بیٹے نہیں اور چونکہ قربانی کے لئے اکلوتے بیٹے کی شرط ہے، اس لئے حضرت اسحٰقؑ کی قربانی کا حکم نہیں ہو سکتا تھا۔

(۲) حضرت اسحٰقؑ کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا تمام ترکہ دیا، بخلاف اس کے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو صرف پانی کی ایک مشک دے کر رخصت کیا، یہ اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحٰقؑ کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہیں چڑھایا تھا

(۳) حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان میں مدت تک یہ رسم قائم رہی کہ لوگ سر کے بال نہیں منڈاتے تھے، حج میں احرام کے زمانہ تک جو بال نہیں منڈاتے، یہ اسی سنتِ اسماعیلی کی یادگار ہے۔

(۴) جو الفاظ قربانی اور نذر چڑھانے کے لئے ملتِ ابراہیمی میں استعمال کئے جاتے تھے، وہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے لئے استعمال کئے نہ کہ حضرت اسحٰقؑ کے لئے، توراۃ میں ہے کہ جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔

لیت اسمٰعیل یعیش امامك۔ کاش اسماعیل تیرے سامنے زندہ رہتا۔

توراۃ میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (سامنے زندہ رہنا) انہی معنوں میں ہوا ہے۔

(۵) حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کی محبوب ترین اولاد تھے، توراۃ جو تمام تر حضرت اسحٰقؑ کی یکطرفہ داستان ہے، اس میں حضرت اسحٰقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے جو امتیازی خصائص بیان کئے ہیں، یہ ہیں کہ حضرت اسحٰقؑ خدا کے وعدہ اور عہد کا مظہر ہیں اور حضرت اسمٰعیلؑ دعوتِ ابراہیمؑ ہیں، یعنی حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے اسی بناء پر خدا نے ان کا نام اسمٰعیل رکھا، کیونکہ اسمٰعیل دو لفظوں سے مرکب ہے، سمع اور ایل۔ سمع کے معنی "سننے" کے اور ایل کے معنی "خدا" کے ہیں۔ یعنی خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا سُن لی۔ توراۃ میں ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ "اسمٰعیلؑ" کے بارے میں، میں نے تیری سن لی۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے حضرت اسحٰقؑ کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے اس موقع پر بھی حضرت اسمٰعیلؑ کو یاد کیا، غرض چونکہ حضرت ابراہیمؑ کو قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ محبوب ترین بیٹا ہو، اس لئے حضرت اسمٰعیلؑ ہی ذبیح ہو سکتے ہیں نہ کہ حضرت اسحٰقؑ۔

(۶) حضرت اسحاقؑ کی جب خدا نے بشارت دی تو ساتھ ہی یہ بھی بشارت دی کہ میں اس کی نسل سے ابدی

لے توراۃ تکوین ۱۷-۲۰ تے تکوین اصحاح ۱۵ تے تکوین اصحاح ۱۷، ۱۸-۱۹

عہد باندھوں گا، تورات میں ہے۔

"پھر خدا نے کہا بلکہ تیری بیوی سارہ تیرے لئے ایک بیٹا جنے گی اور اس کا نام اسحٰقؑ رکھے گا اور میں ابدی عہد اس کی نسل سے قائم کروں گا" (تورات، تکوین اصحاح ۱۷، آیت ۱۸)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تورات میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا، اور فرشتہ نے ندا دی کہ ہاتھ کو روک لو تو فرشتہ نے یہ الفاظ کہے۔

"خدا کہتا ہے کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا" (تورات تکوین اصحاح ۲۲ آیت ۱۵)

اب غور کرو کہ خدا نے جب حضرت اسحاقؑ کی بشارت ہی کے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس کی نسل قائم رکھوں گا تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ جس وقت تک حضرت اسحاقؑ کی اولاد نہیں پیدا ہوئی تھی،[1] ان کی قربانی کا حکم ہوتا، لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبیح تسلیم کیا جائے تو تمام نصوص منطبق ہو جاتے ہیں، حضرت اسمٰعیلؑ اکبر اولاد تھے، محبوب تر تھے، قربانی کے وقت بالغ یا قریب البلوغ تھے، قربانی سے پہلے ان کی کثرتِ نسل کی بشارت نہیں دی گئی تورات میں تصریح ہے کہ چونکہ ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا، اس لئے اس بیٹے کی کثرتِ نسل کا وعدہ کیا گیا، یعنی یہ کثرت نسل اسی قربانی کے صلہ میں تھی، اس لئے ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہی ہو سکتے ہیں، کیونکہ حضرت اسحٰقؑ کی تکثیر نسل کا وعدہ تو ان کی ولادت ہی کے وقت ہو چکا تھا، جو کسی انعام و صلہ کے معاوضہ میں نہ تھا۔

مقام قربانی ۷۔ تورات میں قربانی گاہ کو جو موقع بتایا ہے وہ "مریا" ہے، یہودی کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمانؑ کا ہیکل تھا، عیسائی کہتے ہیں، یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی۔

لیکن یورپ کے محققوں نے ان دونوں دعووں کی تغلیط کی ہے، سر اسٹانلی لکھتے ہیں۔

"حضرت ابراہیمؑ صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکل کر اس مقام پر گئے جہاں ان کو خدا نے حکم دیا تھا لیکن یہ موریا کا پہاڑ نہیں ہے جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے، نہ عیسائیوں کے خیال کے موافق قبر مقدس کے گرجا کے پاس ہے، یہ قیاس تو یہودیوں کے قیاس سے بھی زیادہ بعید ہے اور اس سے بھی بعید مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ جبلِ عرفات ہے۔[2] غالباً یہ مقام جریزیم کے پہاڑ پر ہے اور وہی قربانی گاہ سے مشابہ مقام ہے۔"

اس سے تو اتنا ثابت ہوا کہ موریا کے تعین میں یہودیوں اور عیسائیوں کے دعوے غلط ہیں، باقی یہ امر کہ مسلمانوں کا دعویٰ بھی غلط ہے، اس کی تحقیق آگے آتی ہے۔

موریا کی تعیین میں جو اختلاف پیدا ہوا، اس نے ایک اور اختلاف پیدا کر دیا یعنی یہ کہ یہ لفظ کسی مقام کا نام ہے یا وصفی معنی رکھتا ہے، بہت سے مترجموں نے اس کو ایک مشتق لفظ سمجھا، اور اس لئے اس کا ترجمہ تورات کے بعض

---

[1] یہ مسلم ہے کہ حضرت اسحٰقؑ کی اولاد حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے بعد پیدا ہوئی (تکوین اصحاح ۲۵- آیت ۱۱)۔

[2] یہ غلط ہے مسلمان عرفات کو نہیں بلکہ منیٰ کو قربانی گاہ سمجھتے ہیں

نسخوں میں بلوطاتِ عالیہ اور بعض میں "زمین بلند" اور بعض میں مقام لکھ دیا گیا، لیکن زیادہ صائب الرائے لوگوں نے اس کو مقام کا نام سمجھا اور اس لئے لفظ کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ بحال خود رہنے دیا، لیکن امتداد زمانہ اور بے پروائی سے لفظ کی ہیئت بدل گئی، یعنی مریا کا مورہ ہو گیا خصوصاً اس وجہ سے کہ عبرانی زبان میں دونوں لفظوں کا املا قریب قریب ہے۔

مورہ کی نسبت تورات میں تصریح ہے کہ عرب میں واقع ہے، تورات میں ہے۔

وکان جیش المدیانیین شمالیھم عند تل مورۃ فی الوادی (قضاۃ۔ اصحاح ۷۔ آیت ۲۰)	اور مدیانیوںؑ کی فوج شمال کی جانب مورہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی (مدیان عرب میں واقع ہے۔)

تمام واقعات اور قرآن کو پیش نظر رکھا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ لفظ مورہ نہیں بلکہ مروہ ہے جو مکہ معظمہ کی پہاڑی ہے اور جہاں اب سعی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

عرب کی روایات، قرآن مجید کی تصریح، احادیث کی تعیین تمام چیزیں اس قیاس سے اس قدر مطابق ہوتی جاتی ہیں کہ اس قسم کا تطابق بغیر صحتِ واقعہ کے ممکن نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "قربانی گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربانی گاہ ہیں"[2]:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مروہ میں قربانی نہیں ہوتی تھی، بلکہ منیٰ میں ہوتی تھی، جو مکہ سے تین میل پر ہے، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مروہ ہی کو قربانی گاہ فرمایا، یہ اسی بنا پر تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہیں حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی تھی۔

قرآن مجید میں ہے۔

ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ (حج ۴)	پھر قربانی کے جانوروں کی جگہ کعبہ ہے۔
هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ (مائدہ ۱۳)	قربانی جو کہ کعبہ میں پہنچے۔

مروہ بالکل کعبہ کے مقابل اور اس کے قریب ہے، ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی اصلی جگہ کعبہ ہے منیٰ نہیں، لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ کے حدود کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔

قربانی کی یادگار یہودی حضرت اسحاقؑ کی اولاد ہیں، اس لئے اگر حضرت اسحٰقؑ ذبیح ہوتے تو اس کی کوئی یادگار ان کے یہاں موجود ہوتی، بخلاف اس کے حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان بلکہ تمام مسلمانوں میں جو حضرت اسمٰعیلؑ کی روحانی اولاد ہیں، قربانی کی تمام رسمیں آج تک موجود ہیں۔

اولادِ اسمٰعیلؑ میں قربانی کی تمام یادگاریں موجود ہیں، اور حج جو کہ ایک بڑا فریضۂ اسلام ہے، تمام تر اسی قربانی کی یادگار ہے، چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا تو پکارا، اے ابراہیم! حضرت ابراہیمؑ نے

---

[1] مدین عرب کی زمین ہے اور اہل عرب کو اکثر مدیانیوں کہتے ہیں، اور مدین کی زمین شام کے جنوب سے یمن کے شمال تک ہے اور یہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں جو قطورا سے تھے (ضمیمہ بائبل ص ۴۱۱)۔ [2] موطا امام مالک۔

کہا، "میں حاضر ہوں"؛

حج کے وقت مسلمان جو ہر قدم پر لبیک کہتے چلتے ہیں، یہ وہی ابراہیمی الفاظ ہیں، جن کا لفظی ترجمہ وہی ہے "میں حاضر ہوں"۔

۲۔ شریعتِ ابراہیمی میں دستور تھا کہ جس کو قربان گاہ پر چڑھاتے تھے یا خدا کے لئے نذر دیتے تھے وہ بابار معبد یا قربانی گاہ کے پھیرے کرتا تھا۔

حج میں صفا و مروہ کے درمیان جو سات بار سعی کرتے ہیں، یہ اسی کی یادگار ہے۔

۳۔ نذر کے فرائض میں ایک یہ تھا کہ ایام نذر تک بال نہیں کترواتے تھے، حج میں بھی یہی دستور ہے، جب احرام آتارتے ہیں تب بال کترواتے یا منڈاتے ہیں، خود قرآن مجید میں اس شعار کا ذکر ہے۔

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ (فتح - ۴) سروں کو منڈائے ہوئے۔

۴۔ حج کا ایک ضروری رکن قربانی ہے، یہ وہی حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے، اسی بناء پر قرآن مجید میں فرمایا ہے:-

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (صافات - ۳) اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے بدلے ہم نے ایک بڑی قربانی قائم کی

یہ دلائل تورات کی تصریحات و کنایات کی بناء پر تھے، قرآن مجید کے رو سے قطعاً اسمٰعیلؑ کا ذبیح ہونا ثابت ہے اگرچہ بعض مفسرین نے غلطی سے یہودیوں ہی کی روایت کی تائید کی ہے، قرآن مجید میں قربانی کا واقعہ ان الفاظ میں مذکور ہے۔

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ط (صافات - ۳)

اور حضرت ابراہیم نے کہا میں اپنے خدا کی طرف جاؤں گا وہ مجھ کو راستہ دکھائے گا، خدایا مجھ کو وہ اولاد دے کہ جو نیک چلن ہو تو ہم نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی، پھر جب وہ لڑکا اس کے ساتھ چلنے لگا تو ابراہیم نے کہا بیٹے میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں تیری کیا رائے ہے۔

آیت بالا میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اولاد کے لئے دعا مانگی اور خدا نے قبول کی اور وہی لڑکا قربانی کے لئے پیش کیا گیا۔

تورات سے ثابت ہے کہ جو لڑکا حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے پیدا ہوا، وہ حضرت اسمٰعیل ہیں، اور اسی لئے[1] ان کا نام اسمٰعیل رکھا گیا کہ خدا نے ان کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی درخواست سنی، اس بنا پر اس آیت میں جس کا ذکر ہے وہ حضرت اسمٰعیلؑ ہیں، اسحاقؑ نہیں

قربانی کے واقعہ کی تفصیل اور اختتام کے بعد حضرت اسحٰقؑ[2] کی ولادت کا ذکر ہے، اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ جس کا ذکر اوپر ہوا وہ حضرت اسحٰقؑ نہیں، بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ ہیں۔

[1] تورات تکوین اصحاح ۱۲ آیت [2] تورات تکوین اصحاح ۸ - آیت ۷۔

مسلمانوں کا نام جو مسلم رکھا گیا، یہ وہ نام ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے ایجاد کیا تھا، قرآن مجید میں ہے۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ (حج - ۱۰) تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اسی نے پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا۔

اس تسمیہ کی تاریخ قربانی سے شروع ہوتی ہے، یعنی حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربانی کرنا چاہا اور اُن سے کہا کہ مجھ کو خدا کا یہ حکم ہوا ہے تمہاری کیا رائے ہے؟ تو حضرت اسمٰعیلؑ نے نہایت استقلال کے ساتھ گردن جھکا دی کہ یہ سر حاضر ہے، اس موقع پر خدا نے "اَسْلَمَا" کا لفظ استعمال کیا جو اسلام سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی تسلیم اور حوالہ کر دینے کے ہیں۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا (صافات - ۳) پھر جب دونوں نے اپنے آپ کو (ہمارے) حوالہ کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم و رضا ہے یعنی جب قربانی کا حکم ہوا تو باپ بیٹے دونوں نے بے عذر گردنیں جھکا دیں، یہ وصف مقبول بارگاہ ہوا، اور پھر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا یہی شعارِ مذہبی قرار پایا، اسی بناء پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پیروانِ ملت کا نام مسلم رکھا۔

قربانی، ایثار اور اسلام درحقیقت یہ سب مترادف الفاظ ہیں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت اسمٰعیل ہی نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا، اگر حضرت اسحاقؑ قربانی ہوتے تو یہ لقب ان کی اولاد یا انکی امت کو ملتا۔

قربانی کی حقیقت

اس مسئلہ کی حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے، جب اس پر غور کیا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس سے اصل مقصود کیا تھا، قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھا دیا کرتی تھیں، یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی، مخالفین اسلام کا خیال ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا لیکن یہ سخت غلطی ہے اکابر صوفیاء نے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں، دو قسم کے ہوتے ہیں یعنی

[1] ابھی گزشتہ صفحات کے حاشیہ میں گزر چکا ہے کہ بعض مفسرین نے قرب لفظ کی وجہ سے سمّی کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار دیا ہے تابعین میں حضرت ابن زید اور حضرت حسن بصری کا یہی مسلک ہے اور ابوحیان نے اسی کی تائید کی ہے لیکن صحابہ میں حضرت ابن عباسؓ اور تابعین میں مجاہد ضحاک، قتادہ، اور سفیان نے اللہ کی طرف ضمیر پھیری ہے اور یہ معنی لیتے ہیں کہ تمہارا نام مسلم قرآن کے نزول سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے رکھا اور اس قرآن میں بھی اس نے تمہارا یہ نام رکھا" س"

[2] اس مقام پر مصنف کی یہ عبارت مزید تشریح کی محتاج ہے، مصنف نے جیسا کہ لکھا ہے کہ رؤیا دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک یعنی جس میں صورتِ واقعہ بعینہٖ دکھائی جاتی ہے اور دوسری تمثیلی جس میں صورتِ واقعہ کسی مثالی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اس کو بہت سے علماء نے تسلیم کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ خواب کی اس دوسری قسم میں اصل مقصود رؤیا کی دوسری مثالی صورت ہوتی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے ماں باپ کو آفتاب و ماہتاب اور بھائیوں کو ستاروں کی شکل میں دیکھنا یا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کی وبا کو ایک بڑھیا کی شکل میں دیکھنا اور احد میں مسلمان شہداء کو ذبح گایوں کے رنگ میں دیکھنا۔ محدث خطابی معالم السنن میں لکھتے ہیں۔

اور تمثیلی، عینی میں بعینہٖ وہی چیز مقصود ہوتی ہے جو خواب میں نظر آتی ہے۔ تمثیلی میں تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں کسی مطلب کو پورا ادا کرنا ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھایا گیا تھا، اس سے یہ مراد تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں، یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں، بلکہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیئے جائیں، تورات میں جا بجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

وبعض الرویا مثل یضرب لیتاول علی الوجہ الذی یجب ان یصرف الیہ معنی التعبیر فی مثلہ وبعض الرویا لا یحتاج الی ذلک بل یاتی کالمشاھدۃ۔	بعض خواب تمثیلی ہوتے ہیں جن کو اس مثالی صورت میں اس لئے بیان کیا جاتا ہے کہ اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے جس طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض خواب اس کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

(فتح الباری جلد ۱۲ ص ۴۰۲)

امام ابوبکر ابن العربی مالکی احکام القرآن میں اسی حقیقت کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس رویا کے ضمن میں یوں فرماتے ہیں کہ بعض رویا نام کی طرح ہوتے ہیں (یعنی عینی و تصریحی جو بالکل لفظاً لفظاً واقعہ کے عین مطابق ہوتے ہیں) اور بعض مثل کنیتوں کی طرح ہوتے ہیں یعنی کسی مناسبت معنوی کے سبب سے وہ کسی دوسرے ہم شکل واقعہ کی صورت میں دکھائے جاتے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ خواب اسی دوسری قسم کا تھا (احکام القرآن ج ۲ ص ۱۹۶، مصر)

مصنف سیرت نے اس مقام پر ان ہی بعض علماء کی تقلید کر کے حضرت ابراہیمؑ کے اس خواب کو تمثیلی کہا ہے اور اسی بنا پر ان کو یہ کہنے کی ضرورت ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اس خواب کو جو تمثیلی تھا، اپنی خطائے اجتہادی سے عینی و حقیقی سمجھے اور اس کی بعینہٖ تعمیل پر آمادہ ہو گئے، لیکن عین وقت پر ان کو وحی الٰہی نے ان کی اس اجتہادی خطا پر متنبہ کر دیا اور حضرت اسماعیلؑ کی بعینہٖ قربانی سے روک کر ان کی جگہ جانور کی قربانی پیش کی۔

لیکن جامع کا ذوق اس مقام پر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی ماننے سے ابا کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو محبت الٰہی سے سرشار تھے خطائے اجتہادی سے نہیں بلکہ غلبۂ شوق اطاعت و محبت میں اس حکم الٰہی کی تعمیل اپنی طرف سے بالکل بعینہٖ و بلفظہٖ کرنے پر آمادہ ہو گئے، تاکہ اس ابتلا میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پورے اتریں اور اپنی طرف سے بیٹے کی جان کی قربانی کی جگہ اس کی خدمت توحید و تولیت کعبہ کے لئے وقف کر دینے کی تاویل کا سہارا لے کر نفس کی متابعت کے شبہ اور دھوکے سے بھی پاک رہیں، تاآنکہ اللہ تعالیٰ خود اس حقیقت کو اپنے لفظوں میں واضح فرما دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، آواز آئی۔

یَا اِبْرَاھِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (صافات ۳) وَفَدَیْنَاہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (صافات)	ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کی عوض میں دیا۔

اور امت پر یہ قربانی اسی تمثیلی رنگ میں واجب ٹھہرائی گئی یعنی جسمانی اطاعت و قربانی کی تمثیل، جانور کی قربانی کی شکل میں یہ تشریح ان بعض علماء کی متابعت میں ہے جو بعض دینی و علمی اسباب کی بنا پر اس کو رویائے تمثیلی سمجھتے ہیں اور نہ جمہور علما اس رویا کو عینی ہی سمجھتے ہیں، لیکن عین اس وقت جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر عمل کر کے اپنی طرف سے فرزند کے ذبح کی پوری عزیمت کر کے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواب کو عینی خیال کیا، اور بعینہٖ اس کی تعمیل کرنی چاہی، گو یہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیاء سے ہو سکتی ہے (گو یہ غلطی قائم نہیں رہتی بلکہ خدا اس پر متنبہ کر دیتا ہے) اس بناء پر گو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس فعل سے روک دیئے گئے، لیکن خدا نے ان کی حسن نیت کی قدر کی اور فرمایا۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (صافات - ۳)	تو نے خواب کو سچا کیا، ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں۔

بہرحال یہاں اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ قربانی سے مقصود خدمت کعبہ کے لئے نذر چڑھانا تھا، نذر چڑھانے کے لئے شریعت سابقہ میں جو لفظ مستعمل تھا وہ "خدا کے سامنے" تھا، تورات میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیلؑ کے حق میں خدا سے جو دعا کی وہ ان لفظوں میں تھی۔

لیت اسمٰعیل یعیش امامک (تورات تکوین اصحاح، آیت ۱۹)	کاش اسمٰعیل تیرے سامنے زندگی کرتا۔

اسی خواہش کے مطابق ان کو خواب میں تمثیلی پیرایہ میں حکم دیا گیا کہ وہ بیٹے کی قربانی کریں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں حضرت اسحٰقؑ کی قربانی کا نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) اپنے کام کو پورا کر چکے تھے اور تعمیل حکم میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں رہی تھی کہ وحی الٰہی نے آواز دی، اے ابراہیمؑ تم نے اپنا کام پورا کر دیا اور اپنے خواب کو سچ کر دکھایا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اب اس کی جگہ ملت ابراہیم کی یہ سنت عظیم جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہو گی۔

ظاہر ہے کہ بہر دو صورت یہ جانور کی قربانی جیسا کہ بعض ائمہ محققین نے لکھا ہے نفس کی قربانی کی تمثیل ہے اور اس قربانی کا گوشت اس روز عید میں قربانی کنندہ کے لئے برکت، احباب کے لئے تحفہ اور فقراء کے لئے سامان دعوت بنا۔

مزید تفصیل کے لئے معارف ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ مضمون "ذبح عظیم" اور معارف صفر ۱۳۵۶ھ کے شذرات ملاحظہ ہوں۔ "س"

مکہ معظمہ

حضرت اسماعیلؑ کی بحث مسکن میں گزر چکا کہ وہ عرب تھا، مقام ذبح کی تعیین میں یہ ثابت ہو چکا کہ وادی مکہ تھا، اس بنا پر مکہ کی نسبت ایک بحث نہایت قدیم زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

متعصب عیسائی مورخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کی قدامت کا دعویٰ مسلمانوں کا خاص دعویٰ ہے، قدیم تاریخوں میں اس کا نشان نہیں ملتا۔ اس بنا پر ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔

مکہ کا قدیم اور اصلی نام بکہ ہے، قرآن مجید میں یہی نام ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا (آل عمران ۱۰) — پہلا متبرک گھر جو آدمیوں کے لئے بنایا گیا وہ "بکہ" میں تھا۔

کتاب زبور۔ ۸۴-۶ میں ہے۔

"بکہ کی وادی میں گزرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے، برکتوں سے مورۃ کو ڈھانک لیتے، قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں"۔

اس عبارت میں بکہ کا جو لفظ ہے، یہ وہی مکہ معظمہ ہے، لیکن اگر اس لفظ کو اسم علم کے بجائے مشتق قرار دیں تو اس کے معنی "رونے" کے ہوں گے، اور یہ وہی عربی لفظ بکا ہے، چونکہ یہود و نصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہتے آئے، اس لئے بہت سے مترجمین نے عبارت مذکور میں بکہ کا ترجمہ رونا کر دیا ہے، لیکن ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت میں وادی بکا کے کیا معنی ہوں گے؟ زبور کی عبارت مذکورہ کی اوپر کی آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نشید میں حضرت داؤدؑ نے مکہ معظمہ اور مروہ اور قربان گاہ اسماعیلؑ کی نسبت اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے، اوپر کی عبارت یہ ہے (حضرت داؤدؑ خدا سے کہتے ہیں) اے فوجوں کے خدا تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں، میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے..... اے خدا! تیرے قربان گاہ، میرے مالک اور میرے خدا ہیں، مبارک ہو ان لوگوں کی جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں، اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں، اس کے بعد بکہ والی آیتیں ہیں اب غور کرو حضرت داؤدؑ جس مقام کے پہنچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں، وہ اس مقام پر صادق آسکتا ہے جس میں حسب ذیل باتیں پائی جائیں۔

(۱) قربانی گاہ ہو۔

(۲) حضرت داؤدؑ کے وطن سے دور ہو کہ وہاں تک سفر کر کے جائیں۔

(۳) وہ وادی بکہ کہلاتا ہو۔

ؔ مرگیولوس اپنی کتاب میں لکھتا ہے اگرچہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البنا قرار دیا ہے لیکن صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی، مرگیولوس نے اس کے ثبوت میں اسا بکا حوالہ بھی دیا ہے اور ہم کو بھی اس کی صحت سے انکار نہیں، لیکن اس کل بیان میں مغالطہ ہے جس کو ہم نے اصل کتاب میں ظاہر کر دیا ہے۔

(۴) وہاں مقام مورہ بھی ہو، ان باتوں کو پیش نظر رکھو تو قطعاً یقین ہو جائے گا کہ بکہ وہی مکہ معظمہ اور مورۃ وہی مروۃ ہے، اس کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہو گا کہ یہودی کس طرح تعصب سے الفاظ کو ادل بدل کر دیتے ہیں يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ، ڈاکٹر ہسٹنگس نے "ڈکشنری آف دی بائبل" "وادی بکا" پر جو آرٹیکل لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

اس لفظ سے اگر کوئی واقعی وادی مراد ہے تو وہ حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

(۱) ایک وادی ہے جس میں ہو کر زائرین بیت المقدس جاتے ہیں۔

(۲) وادی اخور ہے، جو یشوع باب ۷، آیات ۲۴-۲۶ وغیرہ میں مذکور ہے۔

(۳) وادی رفائیون ہے جو سامویل دوم باب ۵ آیات ۱۸، ۲۲ وغیرہ میں مذکور ہے۔

(۴) کوہ سینا کی ایک وادی ہے۔

(۵) بیت المقدس تک جو کاروانی راستہ شمال سے آتا ہے، اس راستہ کی آخری منزل ہے (دیکھو رینان کی کتاب "حیات عیسیٰ" باب ۴)

لیکن کیا عجیب بات ہے ڈاکٹر ہسٹنگس کو اتنے احتمالات کثیرہ میں کہیں مکہ معظمہ کا پتہ نہیں لگتا۔ مصرعہ

ہما ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجاست

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ جن جن وادیوں کا نام لیا ہے، ان میں ایک کو بھی بکا کے لفظ سے کسی قسم کی مناسبت نہیں، یہاں تک کہ ایک حرف بھی مشترک نہیں، بخلاف اس کے بکا اور بکہ بالکل ایک لفظ ہیں، فرق اسی قدر ہے جس قدر ایک ہی لفظ کے تلفظ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

جدید انسائیکلوپیڈیا میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ مرگیولوس کا ہے، اس میں مکہ معظمہ کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا بجز اس کے کہ زبور (۸۴-۶) وادی بکہ" کا لفظ ہے۔

لیکن مرگیولوس صاحب اس تاریخی شہادت کو ضعیف سمجھتے ہیں۔

پروفیسر دوزی جو فرانس کا مشہور محقق اور عربی دان عالم ہے، وہ لکھتا ہےؔ۔

"بکہ" وہی مقام ہے جس کو یونانی جغرافیہ دان ماکروبہ لکھتے ہیں"۔

لیکن مارگیولوس کو پروفیسر دوزی کے بیان پر بھی اعتماد نہیں۔

کارلائل صاحب نے اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لکھا ہے کہ:۔

"رومن مورخ سیلس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور اشرف ہے اور یہ ولادت مسیح سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے"۔

ؔ انسائیکلوپیڈیا اخیر جلد ۷، ص ۳۹۹، ارزاں ایڈیشن ؔ ایضاً

اگر کعبہ حضرت عیسیٰؑ سے بہت پہلے موجود تھا تو مکہ بھی قریباً اسی زمانہ کا شہر ہوگا کیونکہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا ہے اس کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہو جاتا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کا عرض اور طول بطلیموسؒ کے جغرافیہ میں حسب ذیل ہے۔

"طول ۷۸ درجہ عرض ۲۳ درجہ"

بطلیموس نہایت قدیم زمانہ کا مصنف ہے، اگر اس نے اپنے جغرافیہ میں مکہ کا ذکر کیا ہے تو اس سے زیادہ قدامت کی کیا سند درکار ہے۔

مارگیولوس نے جس بنا پر مکہ معظمہ کی قدامت سے انکار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اصابہ میں تصریح ہے کہ مکہ میں سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی وہ سعید بن یا سعد بن عمرو نے تعمیر کی، لیکن مارگیولوس کو یہ معلوم نہیں کہ مورخین نے جابجا یہ بھی تصریح کی ہے کہ چونکہ اہل عرب کعبہ کے مقابل یا آس پاس عمارات بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے، اس لئے عمارتیں نہیں بنوائیں بلکہ خیموں اور شامیانوں میں رہتے تھے، اور اس طرح مکہ ہمیشہ سے خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر دنیا میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، ایران، ہند، مصر، یورپ میں عالمگیر اندھیرا تھا، قبولِ حق ایک طرف، اس وسیع خطۂ خاک میں گز بھر زمین نہیں ملتی تھی جہاں کوئی شخص خالص خدائے واحد کا نام لے سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کلدان میں یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا، مصر آئے، ناموس کو خطرہ کا سامنا ہوا، فلسطین پہنچے، کسی نے بات تک نہ پوچھی، خدا کا جہاں نام لیتے تھے، شرک اور بت پرستی کے غلغلہ میں آواز دب دب کر رہ جاتی تھی، معمورۂ عالم کے صفحے، نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے اب ایک سادہ، بے رنگ، ہر قسم کے نقش و نگار سے معرا ورق درکار تھا، جس پر طغرائے حق لکھا جاتے، یہ صرف حجاز کا صحرائے ویران تھا جو تمدن اور عمران کے داغ سے کبھی داغدار نہیں ہوا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو عرب میں لائے اور ان کو یہیں آباد کیا، حضرت سارہؑ نے جیسا کہ توراۃ میں ہے، کچھ عرصہ کے بعد انتقال کیا، حضرت ابراہیمؑ مکہ میں چلے آئے، حضرت اسمٰعیلؑ جوان ہو چکے تھے اعلانِ حق میں ایک ہم آواز ہاتھ آیا، دونوں نے مل کر ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی۔[1]

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيلُ (بقرہ-۱۵)	اور جب کہ ابراہیم اور اسمٰعیل خانہ خدا کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔

گھر بن چکا تو وحی الٰہی نے آواز دی۔

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوكَ رِجَالًا وَعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَاْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ۔ (سورۂ حج-۴)	ہمارا گھر طواف کرنے والوں میں نماز میں قیام کرنے والوں رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کر اور تمام لوگوں کو پکار دے کہ حج کو آئیں، پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی ہر دور دراز گوشہ سے آئیں گے۔

[1] بطلیموس کے جغرافیہ کا ترجمہ عباسیوں کے زمانہ میں ہو گیا تھا، مسعودی اور ابن الندیم نے اکثر اس کے حوالے دیئے ہیں۔
[2] محققین کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی منہدم و بے نشان عمارت کی دوبارہ بنیاد اٹھا کر بلند کی، مزید توضیح کے لئے سیرۃ النبی جلد پنجم باب حج عنوان مکہ اور کعبہ میں دیکھئے۔ "س"

اس وقت اعلان و اشتہار کے وسائل نہیں تھے، ویران جگہ تھی اور آدمی کا کوسوں تک پتہ نہ تھا، ابراہیمؑ کی آواز حدود حرم سے باہر نہیں جا سکتی تھی لیکن وہی معمولی آواز کہاں کہاں پہنچی، مشرق سے مغرب تک، شمال سے جنوب تک اور زمین سے آسمان تک۔

علامہ ازرقی نے تاریخ مکہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو تعمیر کی اس کا عرض و طول حسب ذیل تھا۔

بلندی ———— زمین سے چھت تک ۹ گز۔
طول ———— حجر اسود سے رکن شامی تک ۳۲ گز۔
عرض ———— رکن شامی سے غربی تک ۲۲ گز۔

عمارت بن چکی تو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ تا کہ ایسے مقام پر لگا دوں جہاں سے طواف شروع کیا جائے، تاریخ مکہ موسوم بہ اعلام باعلام بیت الحرام میں ہے۔

فقال ابراهيم لاسماعيل عليهما الصلوة والسلام يا اسماعيل ايتني الحجر اضعه حتى يكون علما للناس يبتدؤن منه الطواف۔	پھر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لا دو تا کہ میں ایسی جگہ نصب کر دوں جہاں سے لوگ طواف شروع کریں۔

خدا کا یہ گھر ایسا سادہ تعمیر ہوا تھا کہ نہ چھت تھی نہ کواڑ اور نہ چوکھٹ بازو تھے، جب قصی بن کلاب کو کعبہ کی تولیت حاصل ہوئی تو انھوں نے قدیم عمارت گرا کر نئے سر سے تعمیر کی اور کھجور کے تختوں کی چھت ڈالی۔[1]

کعبہ کی برکت اور کشش سے لوگ آس پاس آباد ہونے لگے چنانچہ سب سے پہلے قبیلہ جرہم آکر آباد ہوا، اس قبیلہ میں مضاض بن عمرو جرہمی ایک ممتاز شخص تھے، حضرت اسمٰعیلؑ نے ان کی لڑکی سے شادی کی، ان سے بارہ اولاد ہوئی جن کے نام توراۃ میں مذکور ہیں، ان میں سے اکثر اہل عرب قیدار کی اولاد ہیں، حضرت اسماعیلؑ کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت کعبہ کے متولی ہوئے، ان کے مرنے کے بعد ان کے نانا مضاض نے یہ منصب حاصل کیا، اور کعبہ کی تولیت خاندانِ اسمٰعیلؑ سے نکل کر جرہم کے خاندان میں آگئی، لیکن پھر ایک اور قبیلہ خزاعہ نے کعبہ پر قبضہ کر لیا، اور مدت تک اسی خاندان میں یہ منصب رہا، حضرت اسمٰعیلؑ کا خاندان موجود تھا، لیکن اس نے کچھ مزاحمت نہیں کی، قصی بن کلاب کا زمانہ آیا تو انھوں نے اپنا آبائی حق حاصل کیا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

حرم کعبہ پر سب سے پہلے جس نے پردہ چڑھایا وہ یمن کا حمیری بادشاہ اسعد تبع تھا، یمن میں خاص قسم کی چادریں بنی جاتی ہیں، جن کو برد یمانی کہتے ہیں، یہ پردہ انہی چادروں سے تیار کیا گیا تھا، قصی بن کلاب کے زمانہ سے تمام بائل پر ایک محصول لگا دیا گیا جس سے پردہ تیار کیا جاتا تھا، علامہ ازرقی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی

[1] اعلام بحوالہ کتاب النسب از ابن بکار و ابن الماوردی۔

یمنی پردہ چڑھایا تھا، لیکن اس روایت کے سلسلہ کا ایک راوی واقدی ہے۔

خدا کا گھر سیم و زر کی نقش آرائیوں کا محتاج نہ تھا، لیکن دولت اور ملک کی ترقی کے یہ لوازم ہیں، اس لئے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے کعبہ کے ستونوں پر سونے کے پتر چڑھائے، عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں ۳۶ ہزار اشرفیاں اس کام کے لئے بھیجیں، امین الرشید نے ۱۸ ہزار اشرفیاں نذر کیں، کہ دروازہ کی چوکھٹ وغیرہ طلائی بنوا دی جائے، اعلام (تاریخ مکہ) میں عہد بہ عہد کی طلاکاریوں کی تفصیل لکھی ہے لیکن یہ واقعات عہد نبوت کے بعد کے ہیں، جو ہماری کتاب کا موضوع نہیں، اور سچ یہ ہے کہ آفتاب پر سونا چڑھانا ضروری بھی نہیں۔

حضرت اسمٰعیل کی قربانی

خدا کا گھر بن چکا تو ضرورت تھی کہ اس کی تولیت اور خدمت کے لئے کوئی نفس قدسی تمام مشاغل سے الگ ہو کر اپنی زندگی اس پر نذر چڑھا دے، اس قسم کی نذر کو ابراہیمی شریعت میں قربانی سے تعبیر کرتے تھے، تورات میں یہ محاورہ بکثرت آتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں انبیاء علیہم السلام پر جو وحی آتی ہے اس کے مختلف انواع ہیں، جن میں سے ایک خواب بھی ہے، چنانچہ صحیح بخاری باب بدء الوحی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی جو ابتداء ہوئی خواب سے ہوئی، یہ خواب کبھی تمثیلی ہوتا ہے، جس طرح حضرت یوسفؑ نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا تھا، بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب دکھلایا گیا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں، انھوں نے اس خواب کو عینی سمجھا اور بعینہٖ اس کی تعمیل پر آمادہ ہوئے۔

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے استقلال اور جاں نثاری پر اعتماد تھا، لیکن یہ تحقیق طلب تھا کہ پانزدہ سالہ نوجوان بھی اپنی گردن پر چھری چلتے دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا۔

يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۔ (صٰفٰت)

بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتا، تیری کیا رائے ہے۔

بیٹے نے نہایت استقلال سے جواب دیا۔

۱؎ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں قباطی کا پردہ چڑھایا تھا جو مصر میں بنا جاتا ہے ان کے بعد معمول ہو گیا کہ ہر خلیفہ اپنے عہد خلافت میں پردہ چڑھاتا تھا، بنو امیہ نے دیبا کا پردہ چڑھایا تھا، مامون الرشید ہر سال تین پردے چڑھاتا تھا، حج کے زمانہ میں دیبائے احمر کا، رجب میں قباطی کا، عید الفطر میں دیبائے سپید کا، مصر میں جب سلطان صالح ابن سلطان قلاؤن بادشاہ ہوا تو مصر کے دو گاؤں پردہ کے مصارف کے لئے وقف کر دیئے۔ جب ترک خاندان قسطنطنیہ میں حکمران ہوا تو سلطان سلیمان نے چند گاؤں اور اضافہ کر دیئے (اعلام باعلام بیت اللہ الحرام) خانہ کعبہ پر پردہ چڑھانے کی تاریخ بہ تفصیل فتوح البلدان بلاذری اور تاریخ مکہ ازرقی اور معجم البلدان وغیرہ میں ہے، ہم نے آخر تصنیف یعنی اعلام کو لیا ہے کہ وہ ان سب کے بعد کی تصنیف اور جامع ہے۔

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (صٰفٰت ۳)

اباجان! آپ کو جو حکم ہوا ہے وہ کر گزریئے، خدا نے چاہا تو میں ثابت قدم رہوں گا۔

اب ایک طرف تو ننانوے سالہ پیر ضعیف ہے، جس کو دعاہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لئے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہے۔

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے، جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے، اور اب باپ ہی کا مہر پرور ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے، ملائکہ، قدسی، فضائے آسمانی، عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں، اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعۃً عالم قدس سے آواز آتی ہے۔

يٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (صٰفٰت ۳)

ابراہیم! تو نے خواب کو سچ کر دکھایا ہم نیک بندوں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں۔

طغیان ناز ہیں کہ جگر گوشۂ خلیل
در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا، اس کا صلہ یہی تھا کہ یہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اس کی یادگار رہ جائے۔

❖

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

سِلسلۂ نسب

سلسلۂ نسب سلسلۂ نسب یہ ہے، محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوٴی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ ابن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

صحیح بخاری (باب مبعث النبی) میں یہیں تک ہے، لیکن امام بخاری نے اپنی تاریخ میں عدنان سے حضرت ابراہیمؑ تک نام گنائے ہیں یعنی عدنان بن عدد بن المقوم ابن تارح بن یشجب بن یعرب بن نابت بن اسمٰعیلؑ بن ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، جن کا ذکر توراۃ میں بھی ہے، ان میں سے قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی، انہی کی اولاد میں عدنان ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی کے خاندان سے ہیں۔

عرب کے نسب دان تمام پشتوں کو محفوظ نہیں رکھتے تھے، چنانچہ اکثر نسب ناموں میں عدنان سے حضرت اسمٰعیلؑ تک صرف آٹھ نو پشتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں۔ عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیلؑ تک اگر صرف نو دس پشتیں ہوں تو یہ زمانہ تین سو برس سے زیادہ نہ ہوگا، اور یہ امر بالکل تاریخی شہادتوں کے خلاف ہے۔ علامہ سہیلی روض الانف (ص ۸) میں لکھتے ہیں۔

ویستحیل فی العادۃ ان یکون بینھما اربعۃ ابلاو سبعۃ کما ذکر ابن اسحاق او عشرۃ او عشرون فان المدۃ اطول من ذلک کلہ۔	اور یہ عادۃً محال ہے کہ دونوں میں ۴ یا ۷ پشتوں کا فاصلہ ہو، جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا، ۲۰،۱۰ پشتیں ہوں کیونکہ زمانہ اس سے بہت زیادہ ہے۔

علامہ موصوف نے بہت سے تاریخی حوالوں اور شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ عدنان سے حضرت اسمٰعیلؑ تک ۴۰ پشتوں کا فاصلہ ہے، اس غلطی نے بعض عیسائی مورخوں کو اس بات کا موقع دیا ہے کہ سرے سے اس بات کے منکر ہو گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاندان ابراہیمؑ سے ہیں۔[1]

اس غلطی کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ اہل عرب زیادہ تر مشہور آدمیوں کے نام پر اکتفا کرتے تھے اور بیچ کی پشتوں

[1] سر ولیم صاحب نے صریحاً یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان سے نہ تھے ان کے الفاظ یہ ہیں۔ یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر کو اسمٰعیلؑ کی اولاد سے خیال کیا جائے اور غالباً یہ کوشش کہ وہ اسمٰعیلؑ کی نسل میں سے ثابت کئے جائیں، ان کی عین حیات میں پیدا ہوئی تھی، اور اس طرح پر محمدؐ کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے، اور اسمٰعیلؑ اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے تھے۔ (لیکن ایک طرف سر ولیم میور صاحب کا تنہا شبہ ہے، دوسری طرف بیسیوں یورپین اور یہودی مورخین ہیں، جو نہ صرف خاندان قریش کو بلکہ تمام شمالی عرب و حجاز کو ابراہیمی النسل تسلیم کرتے ہیں، (دیکھو فارسٹر صاحب کا جغرافیہ تاریخی عرب)

کو چھوڑ دیتے تھے، اس کے علاوہ اہل عرب کے نزدیک چونکہ عدنان کا حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان سے ہونا قطعی اور یقینی تھا، اس لئے وہ صرف اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ عدنان تک سلسلۂ نسب صحیح طور سے نام بنام پہنچ جائے، اوپر کے اشخاص کا نام لینا غیر ضروری سمجھتے تھے، اس لئے چند مشہور آدمیوں کا نام لے کر چھوڑ دیتے تھے تاہم عرب میں ایسے محققین بھی تھے جو اس فروگذاشت سے واقف تھے، علامہ طبری نے تاریخ میں لکھا ہے کہ مجھ سے بعض نسب دانوں نے بیان کیا کہ میں نے عرب میں ایسے علماء دیکھے جو معد سے لے کر اسمٰعیلؑ تک ۴۰ پشتوں کے نام لیتے تھے، اور اس شہادت میں عرب کے اشعار پیش کرتے تھے، اس شخص کا یہ بھی بیان تھا کہ میں نے اس سلسلہ کو اہل کتاب کی تحقیقات سے ملایا تو پشتوں کی تعداد برابر تھی، البتہ ناموں میں فرق تھا۔[1] اسی مورخ نے ایک اور موقع پر لکھا ہے کہ شہر تدمر میں ایک یہودی تھا جس کا نام ابو یعقوب تھا، وہ مسلمان ہو گیا تھا، اس کا بیان تھا کہ ارمیا پیغمبر کے منشی نے عدنان کا جو نسب نامہ لکھا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے۔[2] اس شجرے میں بھی عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیلؑ تک چالیس نام ہیں، بہر حال یہ واقعہ یقینی ہے کہ عدنان حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عدنان کے خاندان سے ہیں۔

بنائے خاندان قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اگرچہ ابا عن جد[3] معزز اور ممتاز چلا آتا تھا، لیکن جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا وہ نضر بن کنانہ تھے، بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا اور انہی کی اولاد قریشی ہے، حافظ عراقی سیرت منظوم میں لکھتے ہیں۔

[1] تاریخ طبری مطبوعہ یورپ ج ۳ ص ۱۱۱۸ [2] تاریخ طبری مطبوعہ یورپ ج ۳ ص ۱۱۱۵ [3] تاریخ عرب کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے لیکن مارگلیس نے نہایت کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو مبتذل ثابت کیا جائے ان کے الفاظ یہ ہیں، یہ بالکل ظاہر ہے کہ محمدؐ ایک غریب اور ادنیٰ خاندان سے تھے اس کے بعد صاحب موصوف نے حسب ذیل استدلال پیش کئے ہیں (۱) قرآن مجید میں ہے کہ قریش کو حیرت تھی کہ ان میں ایسا پیغمبر کیوں نہ بھیجا گیا جو شریف خاندان سے ہوتا (۲) پیغمبر کے عروج کے زمانہ میں قریش نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس درخت سے تشبیہ دی جو کوڑے پر جمتا ہے (۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ایک شخص نے مولیٰ کے لفظ سے خطاب کیا تو آپؐ نے اس لقب سے انکار کیا (۴) فتح مکہ کے دن آپ نے فرمایا کہ آج شرفائے کفار کا خاتمہ ہو گیا۔ قرآن شریف کے الفاظ یہ ہیں وقالوا لولا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم ۔ یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں (مکہ و طائف) کے کسی رئیس پر کیوں نہ اترا، عظیم اور شریف دو الگ لفظ ہیں، قرآن میں عظیم کا لفظ ہے، اہل عرب دولت اور اقتدار والے کو عظیم کہتے تھے، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت سے نہیں بلکہ جاہ و دولت سے انکار تھا، دوسرا استدلال اگر صحیح ہو تو دشمن کی ہر بات کو صحیح ماننا چاہیئے، کفار نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ، جادو زدہ، شاعر سب کچھ کہا، ان میں سے کونسی بات صحیح ہے، بے شبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مولیٰ اور سید کے لفظ سے انکار کیا لیکن متعدد حدیثوں میں صاف تصریح ہے کہ آپؐ نے فرمایا مجھ کو سید اور مولیٰ نہ کہو، مولیٰ اور سید خدا ہے، قرآن میں ہر جگہ خدا ہی کو مولیٰ کہا ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاندانی شرافت کا ابطال کیونکر ہوتا ہے؟ اخیر استدلال بھی حیرت انگیز ہے۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کم نسبی کیونکر ثابت ہوتی ہے؟ کفار شرفائے مکہ سے مراد میاں جبارین و متکبرین مکہ ہیں۔ مارگلیس صاحب نے یہ دلائل نولدیکی سے نقل کئے ہیں جو مشہور جرمنی مستشرق ہے۔

ع: این خانہ ہمہ آفتاب است۔

أمّا قريش فالأصح فهر بجامعها والأكثرون النضر

قصی

نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا، اس زمانہ میں حرم کے متولی خلیل خزاعی تھے، قصی نے خلیل کی صاحبزادی سے جس کا نام حبی تھا شادی کی تھی، اس تعلق سے خلیل نے مرتے وقت وصیت کی کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی جائے، اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا، قصی نے ایک دار المشورہ قائم کیا، جس کا نام دار الندوہ رکھا، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے، قافلے باہر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، نکاح اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے۔

قصی نے بڑے بڑے نمایاں کام کئے جو ایک مدت تک یادگار رہے، مثلاً سقایہ اور رفادہ جو خدام حرم کا سب سے بڑا منصب تھا، انہی نے قائم کیا، تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سینکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے، چنانچہ قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا کہ حجاج کے کام آئے، مشعر حرام بھی انہی کی ایجاد ہے جس پر ایام حج میں چراغ جلاتے تھے، چنانچہ عقد الفرید میں تصریح کی ہے۔ قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب اول انہی کو ملا، چنانچہ علامہ ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے، اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا، اس لئے ان کو قریش کہتے ہیں، کیونکہ تقریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اسی بنا پر ان کو مجمع بھی کہتے تھے، چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

قصی ابو کم من یسمی مجمعا بہ جمع اللہ القبائل من فہر

قصی کی چھ اولاد تھی، عبد الدار، عبد مناف، عبد العزیٰ، عبد بن قصی، تخمر، برہ۔ قصی نے مرتے وقت حرم محترم کے تمام مناصب سب سے بڑے بیٹے عبد الدار کو دیئے، اگرچہ وہ سب بھائیوں میں ناقابل تھے، لیکن قصی کے بعد قریش کی ریاست عبد مناف نے حاصل کی، اور انہی کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص خاندان ہے، عبد مناف کے چھ بیٹے تھے، ان میں سے ہاشم نہایت صاحب صولت اور بااثر تھے، انھوں نے بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ حرم کے مناصب جو عبد الدار کو دیئے گئے، واپس لے لئے جائیں، وہ لوگ اس منصب عظیم کے قابل نہیں

---

[1] زرقانی جلد اول صفحہ ۹۰۔ [2] سقایہ یعنی حاجیوں کو آب زمزم پلانا اور رفادہ حاجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔

[3] قصی بن کلاب کا مفصل تذکرہ طبقات ابن سعد جزو اول مطبوعہ لیڈن ۱۳۲۲ھ صفحہ ۳۶ سے لے کر ۴۲ تک ہے، قریش کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا، اس لئے قریش کہلائے بعض کہتے ہیں کہ ایک مچھلی کا نام ہے جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے، چونکہ قصی بہت بڑے سردار تھے اس لئے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی عام خیال یہ ہے کہ قریش قصی یا کسی اور شخص کا نام ہے، لیکن امام سہیلی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قبیلہ کا نام ہے، جس طرح قبائل عرب جانوروں کے نام پر نام رکھتے تھے مثلاً اسد، نمر وغیرہ۔ مورخین یورپ کا خیال ہے کہ قبائل جانوروں کی پرستش کرتے تھے اور انہی جانوروں کے نام سے مشہور ہو جاتے تھے، لیکن عربی تاریخوں میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

عبد الدار کے خاندان نے انکار کیا اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں، بالآخر اس پر صلح ہو گئی کہ عبد الدار سے سقایہ اور رفادہ واپس لے کر ہاشم کو دے دیا۔

ہاشم

ہاشم نے اپنے فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو نہایت سیر چشمی سے کھانا کھلاتے تھے، چرمی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم اور منیٰ کے پاس سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، قیصر روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوایا کہ قریش جب اس کے ملک میں اسباب تجارت لے کر جائیں تو ان سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا، چنانچہ اہل عرب جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لئے جایا کرتے تھے، اس زمانہ میں انگوریہ (انقرہ)، جو ایشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے، قیصر کا پایہ تخت تھا، تجار قریش انگوریہ میں جاتے تو قیصر نہایت عزت اور حرمت سے خیر مقدم کرتا تھا۔

عرب میں راستے محفوظ نہ تھے، ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کر کے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے، جس کے صلہ میں کاروان قریش ان قبائل میں ان کی ضرورت کی چیزیں خود لے کر جائے گا اور ان سے خرید و فروخت کرے گا، یہ سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلۂ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا۔

ایک دفعہ مکہ میں قحط پڑا، ہاشم نے اس قحط میں روٹیاں چورا کر کے لوگوں کو کھلائیں، اس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہو گیا، عربی زبان میں چورا کرنے کو ہشم کہتے ہیں، جس کا اسم فاعل ہاشم ہے۔

ایک بار تجارت کی غرض سے شام گئے، راستہ میں مدینہ میں ٹھہرے، وہاں سال کے سال بازار لگتا تھا، بازار میں گئے تو ایک عورت کو دیکھا جس کے حرکات و سکنات سے شرافت اور فراست کا اظہار ہوتا تھا، اس کے ساتھ حسین اور جمیل بھی تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ خاندان بنی نجار سے ہے اور سلمیٰ نام ہے، ہاشم نے اس سے شادی کی درخواست کی، اس نے قبول کر لی، غرض نکاح ہو گیا، شادی کے بعد یہ شام کو چلے گئے اور غزہ میں جا کر انتقال کیا، سلمیٰ کو حمل رہ گیا تھا، لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام شیبہ رکھا گیا، اس نے قریباً ۸ برس تک مدینہ میں پرورش پائی، ہاشم کے بھائی جن کا نام مطلب تھا، ان کو یہ حالات معلوم ہوئے تو فوراً مدینہ روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر بھتیجے کی جستجو کی، سلمیٰ نے ان کے آنے کا حال سنا تو بلا بھیجا، تین دن مہمان رہے، چوتھے دن شیبہ کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ روانہ ہوئے، ان کی عمر ۸ برس کی تھی، یہاں آ کر ان کا نام عبد المطلب پڑ گیا۔

عبد المطلب کے لفظی معنی "مطلب کا غلام" ہیں، اس لئے ارباب سیر نے وجہ تسمیہ میں بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، جن میں صحیح تر یہ ہے کہ چونکہ مطلب نے ان کی پرورش کی تھی، اور یہ یتیم تھے، اس لئے عرب کے محاورہ کے مطابق "غلام مطلب" مشہور ہو گئے، عبد المطلب کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ چاہ زمزم جو ایک مدت سے اٹ کر گم ہو گیا تھا، انھوں نے اس کا پتہ لگایا اور کھدوا کر نئے سرے سے درست کروایا۔

انھوں نے منت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے، خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسوں بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے اور پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو، دیکھو

---

[1] امالی ابو علی قالی [2] طبری ص ۱۰۸۸ و ۱۰۸۹ [3] ص ۳۵ [4] مسند دیکھو زرقانی جلد اول ص ۸۵۔

کس کے نام پر نکلتا ہے، اتفاق سے عبداللہ کا نام نکلا، یہ اُن کو لے کر قربان گاہ کو چلے، عبداللہ کی بہنیں جو ساتھ تھیں رونے لگیں، اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربانی کیجیے، ان کو چھوڑ دیجیے، عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ عبداللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو، اتفاق یہ کہ عبداللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا، عبدالمطلب نے اب دس کے بجائے بیس اونٹ کر دیے، یہاں تک کہ بڑھاتے بڑھاتے سو تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ آیا، عبدالمطلب نے سو اونٹ قربانی کئے اور عبداللہ بچ گئے۔ یہ واقدی کی روایت ہے، ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹوں کے معاوضہ کی تدبیر روسائے قریش نے تجویز کی تھی۔

عبدالمطلب کے دس یا بارہ بیٹوں میں سے پانچ شخصوں نے اسلام یا کفر کی خصوصیت کی وجہ سے شہرت عام حاصل کی یعنی ابولہب، ابوطالب، عبداللہ، حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ، عام طور پر مشہور ہے کہ ابولہب کا اصلی نام اور ہے خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ نے دیا، لیکن یہ غلطی ہے، ابن سعد نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ یہ لقب خود عبدالمطلب نے دیا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ ابولہب نہایت حسین اور جمیل تھا اور عرب میں گورے چہرے کو شعلۂ آتش کہتے ہیں، فارسی میں بھی آتشیں رخسار ہے۔

عبداللہ قربانی سے بچ گئے تو عبدالمطلب کو اُن کی شادی کی فکر ہوئی، قبیلۂ زہرہ میں وہب بن عبدمناف کی صاحبزادی جن کا نام آمنہ تھا، قریش کے تمام خاندانوں میں ممتاز تھیں، وہ اس وقت اپنے چچا وہیب کے پاس رہتی تھیں، عبدالمطلب وہیب کے پاس گئے اور عبداللہ کی شادی کا پیغام دیا، انھوں نے منظور کیا اور عقد ہو گیا اسی موقع پر خود عبدالمطلب نے بھی وہیب کی صاحبزادی سے جن کا نام ہالہ تھا شادی کی، حضرت حمزہؓ انہی ہالہ کے بطن سے ہیں، ہالہ رشتہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہوئیں، اور اس بنا پر حضرت حمزہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔

دستور تھا کہ نوشاہ شادی کے بعد ۳ دن تک سسرال میں رہتا تھا، عبداللہ تین دن سسرال میں رہے اور پھر گھر چلے آئے، اس وقت ان کی عمر تقریباً سترہ برس سے کچھ زیادہ تھی۔

عبداللہ تجارت کے لئے شام کو گئے، واپس آتے ہوئے مدینہ میں ٹھہرے اور بیمار ہو کر یہیں رہ گئے عبدالمطلب کو یہ حال معلوم ہوا تو اپنے بڑے بیٹے حارث کو خبر لانے کے لئے بھیجا، وہ مدینہ میں پہنچے تو عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا، چونکہ یہ خاندان میں سب سے زیادہ محبوب تھے، تمام خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔

عبداللہ نے ترکہ میں اونٹ، بکریاں اور ایک لونڈی چھوڑی تھی، جس کا نام اُم ایمنؓ تھا، یہ سب چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترکہ میں ملیں، ام ایمنؓ کا اصلی نام برکۃ تھا۔

سیرت ابن ہشام دبرحاشیہ زاد المعاد صفحہ ۵۰، ابن سعد، زرقانی جلد اول صفحہ ۹۰، سطر ۲ طبقات ابن سعد جزء اول قسم اول ص ۶۲

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

ولادت لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرِ کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخِ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبحِ جان نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیمؑ، جمالِ یوسفؑ، معجز طرازیِ موسیٰؑ جان نوازیِ مسیحؑ، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں اور شاہنشاہِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبحِ جان نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے، اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتش کدۂ کفر، آذرکدۂ گمراہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیمِ عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہِ کونین۔

شمسۂ نہ مسند ہفت اختران — ختم رسل خاتم پیغمبران
احمدِ مرسل کہ خردِ خاکِ اوست — ہر دو جہان بستۂ فتراکِ اوست
اُمّی و گویا بہ زبانِ فصیح — از الف آدم و میمِ مسیح
رسم ترنج است کہ در روزگار — پیش وہد میوہ پس آرد بہار

عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلِّمْ۔

تاریخِ ولادت تاریخِ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے دلائلِ ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپؐ کی ولادت ۹، ربیع الاول روز دو شنبہ مطابق ۲۰، اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی تھی۔

محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے وہ کئی صفحوں میں آیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیمؑ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا اور ۱۰ھ تھا اور اس وقت آپؐ کی عمر کا تریسٹھواں سال تھا۔

آپ کا نام محمد رکھا گیا، اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے یہ نام رکھا تھا۔

رضاعت سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی والدہ نے اور دو تین روز کے بعد ثوبیہ نے دودھ پلایا، جو ابولہب کی لونڈی تھی[1]۔

حلیمہ سعدیہ ثوبیہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ کو دودھ پلایا، اس زمانہ میں دستور تھا کہ شہر کے رؤسا اور شرفا، شیرخوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے، یہ رواج اس غرض سے تھا کہ بچے بدوؤں میں پل کر فصاحت کا جوہر پیدا کرتے تھے[2]، اور عرب کی خالص خصوصیات محفوظ رہتی تھیں۔

شرفائے عرب نے مدت تک اس رسم کو محفوظ رکھا، یہاں تک کہ بنو امیہ نے دمشق میں پایۂ تخت قائم کیا اور شاہانہ شان و شوکت میں کسریٰ و قیصر کی ہمسری کی، تاہم ان کے بچے صحراؤں میں بدوؤں کے گھر میں پلتے تھے، ولید بن عبدالملک خاص اسباب سے نہ جا سکا اور حرم شاہی میں پلا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانِ بنو امیہ میں صرف ولید ہی ایک شخص تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا۔

غرض دستور مذکور کی بنا پر سال میں دو مرتبہ دیہات سے شہر میں عورتیں آیا کرتی تھیں، اور شرفائے شہر اپنے شیرخوار بچوں کو اُن کے حوالے کر دیا کرتے تھے، اس دستور کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے چند روز بعد قبیلۂ ہوازن کی چند عورتیں، بچوں کی تلاش میں آئیں، ان میں حضرت حلیمہ سعدیہؓ بھی تھیں، اتفاق سے اُن کو کوئی بچہ ہاتھ نہیں آیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) (۲) ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ (سنہ ۱) کا آغاز ۲۰ جنوری ۵۷۱ء کو ۸ بجکر ۲۳ منٹ پر لگا تھا (۳) اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ۴۰ برس پیچھے ہٹیں تو آپ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء ہے جس میں از روئے قواعد ہیئت، ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی۔

(۴) تاریخ ولادت میں اختلاف ہے لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ ۸ سے لے کر ۱۲ تک میں منحصر ہے۔

(۵) ربیع الاول مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے ان وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت قطعاً ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تھی۔

[1] بخاری باب یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب۔ [2] امام سہیلی نے بتفصیل یہ واقعات لکھے ہیں اور یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں اس لئے فصیح ہوں کہ قبیلۂ بنی سعد میں پلا ہوں (الروض الانف ج اول ص ۱۰۹ آخر)۔ سر ولیم میور صاحب لائف آف محمد میں لکھتے ہیں کہ محمد کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی، ان کے اخلاق آزادانہ اور مستغنی عن الغیر تھے، جس کی وجہ ان کا پانچ سال تک بنی سعد میں بسر کرنا تھا اور اسی وجہ سے ان کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کے خالص نمونہ کے موافق تھی۔ [3] ابن اثیر ج ۵ صفحہ ۶ طبع لیڈن۔ [4] سہیلی نے لکھا ہے کہ عرب میں دودھ پلانا اور اس کی اجرت لینا شریفانہ کام نہیں خیال کیا جاتا تھا، اسی بنا پر عرب میں مثل ہے: الحرۃ لا تاکل بثدییھا، اس بنا پر سہیلی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سال قحط پڑا تھا، اس لئے مجبوراً حضرت حلیمہؓ اور ان کے قبیلہ نے یہ خدمت گوارا کی تھی، لیکن تمام تاریخوں میں ہے کہ مکہ میں ہر سال باہر سے عورتیں اس کام کے لئے آیا کرتی تھیں، ہمارا خیال ہے کہ اس کام کو معیوب سمجھنا عرب کا عام خیال نہ تھا، یہ خیال اہل شہر اور امراء کے ساتھ مخصوص ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے اُن کو مقرر کرنا چاہا تو ان کو خیال آیا کہ یتیم بچے کو لے کر کیا کروں گی، لیکن خالی ہاتھ بھی نہ جا سکتی تھیں، اس لئے حضرت آمنہ کی درخواست قبول کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر گئیں، ان کی ایک صاحبزادی تھیں، جن کا نام شیما تھا ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت اُنس تھا، وہی آپ کو کھلایا کرتی تھیں، دو برس کے بعد حلیمہ آپ کو مکہ میں لائیں، اور آپ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کیا، لیکن چونکہ اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی، آپ کی والدہ نے فرمایا کہ واپس لے جاؤ، چنانچہ دوبارہ گھر لائیں، اس میں اختلاف ہے کہ آپ حضرت حلیمہؓ کے یہاں کتنے برس تک رہے، ابن اسحاق نے وثوق کے ساتھ ۶ برس لکھا ہے۔

ہوازن کا قبیلہ فصاحت و بلاغت میں مشہور ہے، ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "میں تم سب میں فصیح تر ہوں، کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے[1]" بنی سعد ہوازن ہی کے قبیلہ کو کہتے ہیں۔

حضرت حلیمہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا محبت تھی۔ عہد نبوت میں جب وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ میری ماں میری ماں کہہ کر لپٹ گئے، یہ دلچسپ واقعات آگے آئیں گے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت حلیمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے وفات کر گئیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ابن ابی خیثمہ نے تاریخ میں، ابن جوزی نے حدا[2] میں، منذری نے مختصر سنن ابی داؤد میں، ابن حجر نے اصابہ میں ان کے اسلام لانے کی تصریح کی ہے، حافظ مغلطائی نے اُن کے اسلام پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام التحفۃ الجسیمہ فی اثبات اسلام حلیمہ ہے۔

حضرت حلیمہؓ کے شوہر یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی باپ کا نام حارث ابن عبدالعزیٰ ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مکہ میں آئے اور اسلام[3] لائے۔

حارثؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ "یہ تم کیا کہتے ہو!" آپ نے فرمایا ہاں وہ دن آئے گا کہ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ میں سچ کہتا تھا، حارث مسلمان ہو گئے۔

رضاعی بہن بھائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چار رضاعی بھائی بہن تھے جن کے نام یہ ہیں، عبداللہ، انیسہ، حذیفہ اور حذافہ جو شیما کے لقب سے مشہور تھیں، ان میں سے عبداللہ اور شیما کا اسلام لانا ثابت ہے، باقیوں کا حال معلوم نہیں۔

مدینہ کا سفر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جب چھ برس کی ہوئی تو آپ کی والدہ آپ کو لے کر مدینہ گئیں، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کی ننہال خاندانِ نجار میں تھیں، وہیں ٹھہریں، اس سفر میں ام ایمنؓ بھی ساتھ تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ تھیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ آپ کی والدہ اس ننہالی رشتہ کی وجہ سے مدینہ گئیں، لیکن یہ رشتہ دور کا رشتہ تھا، قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق سے اتنا بڑا سفر کیا جائے میرے نزدیک بعض مورخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لئے گئی تھیں جو مدینہ

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۷۱، [2] زرقانی ج ۳ ص ۲۶۰، [3] اصابہ فی احوال الصحابہ مطبوعہ مصر مطبع سعادت جلد ۱ ص ۲۸۳۔

یں مدفون ہے۔ بہرحال ایک مہینہ تک مدینہ میں مقیم رہیں، واپس ہوتے ہوئے جب مقام ابواء[1] میں پہنچیں تو اُن کا انتقال ہوگیا، اور یہیں مدفون ہوئیں، ام ایمنؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر مکہ میں آئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام مدینہ کی بہت سی باتیں یاد رہ گئی تھیں، جب آپ قیام مدینہ کے زمانہ میں ایک دفعہ بنو عدی کے منازل پر گزرے تو فرمایا کہ اسی مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں، یہی وہ تالاب ہے جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا، اسی میدان میں، میں انیسہ ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔[2]

عبدالمطلب کی کفالت

والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دامن تربیت میں لیا، ہمیشہ آپ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔[3]

عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی اور حجون میں مدفون ہوئے، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ برس کی تھی، عبدالمطلب کا جنازہ اٹھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ساتھ تھے، اور فرط محبت سے روتے جاتے تھے، عبدالمطلب نے مرنے کے وقت اپنے بیٹے ابوطالب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سپرد کی، ابوطالب نے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، یہ واقعہ خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عبدالمطلب کی موت نے بنو ہاشم کے رتبۂ امتیاز کو دفعۃً گھٹا دیا، اور یہ پہلا دن تھا کہ دنیوی اقتدار کے لحاظ سے بنو امیہ کا خاندان بنو ہاشم پر غالب آگیا، عبدالمطلب کی مسند ریاست پر اب حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصب ریاست میں سے صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

ابوطالب کی کفالت

عبدالمطلب کے دس بیٹے مختلف ازواج سے تھے، ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ اور ابوطالب ماں جائے بھائی تھے، اس لئے عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب ہی کے آغوش تربیت میں دیا، ابوطالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپ کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتے تھے، سوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر سوتے اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے۔

غالباً جب آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپ نے بکریاں چرائیں، فرانس کے ایک نامور مورخ نے لکھا ہے

[1] ایک گاؤں کا نام ہے جو جحفہ سے ۲۳ میل پر واقع ہے۔ [2] طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۷۳۔ [3] عبدالمطلب کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز رکھنا ایک مسلّم واقعہ ہے لیکن مارگولیس صاحب کو دادا کا پوتے پر مہربان ہونا بھی گوارا نہیں فرماتے ہیں کہ یتیم لڑکے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی اور اخیر زندگی میں ان کے چچا حمزہ نے نشہ کی حالت میں محمد کو طعنہ اپنے باپ کا غلام کہا تھا (دیکھو لائف آف محمد از مارگولیس صفحہ ۴۹) حضرت حمزہؓ کے جس قول سے استدلال ہے، مارگولیس خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نشہ کی حالت تھی، اس کی تفصیل جیسا کہ بخاری (غزوۂ بدر وغیرہ) میں ہے یہ ہے کہ بدر کے مال غنیمت سے حضرت علیؓ کو دو اونٹ ملے تھے، اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی، حضرت حمزہؓ شراب میں مخمور ادھر سے گزرے اور اونٹ کا پیٹ پھاڑ کر دل اور جگر کا کباب بنایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ حضرت حمزہؓ کے پاس گئے اور ان کو ملامت کی، حضرت حمزہؓ سخت مخمور تھے اس حالت میں وہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے، کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ابوطالب چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ذلیل رکھتے تھے، اس لئے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا، بڑے بڑے شرفا اور امرا کے بچے بکریاں چراتے تھے خود قرآن مجید میں ہے وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا، زمانہ رسالت میں آپ اس سادہ اور پرلطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ آپ صحابہؓ کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے، صحابہ جھڑبیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے، آپ نے فرمایا جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں زیادہ مزے کے ہوتے ہیں، یہ میرا اس زمانہ کا تجربہ ہے جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا[1]

شام کا سفر

ابوطالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے، قریش کا دستور تھا، سال میں ایک دفعہ تجارت کی غرض سے شام کو جایا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی کہ ابوطالب نے حسب دستور شام کا ارادہ کیا، سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابوطالب چلنے لگے تو آپ ان سے لپٹ گئے، ابوطالب نے آپ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا، عام مورخین کے بیان کے موافق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا، اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب ابوطالب بصرے میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے، جس کا نام بحیرا تھا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا یہ سید المرسلین ہیں، لوگوں نے پوچھا تم نے کیونکر جانا، اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے سب سجدے کے لئے جھک گئے۔

یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے، تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سر ولیم میور، ڈریپر، مارگولیس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں، اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیئے تھے، انہی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اور اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں[2]۔

[1] طبقات ابن سعد صفحہ ۸۰ جلد اول بخاری فی کتاب الاجارۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کیا ہے کہ میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا، قراریط کے معنی میں اختلاف ہے، ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے، اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے، اس بنا پر ان کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے، اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارۃ میں نقل کیا ہے لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے، علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے (عینی ج ۵ ص ۶۳۱) فتح الباری میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ [2] ڈریپر صاحب معرکۂ علم و مذہب میں لکھتے ہیں، بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی۔ آپ

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیئے جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں بھی نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیئے جائیں، اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے، اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں، سب مرسل ہیں یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا، اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے اس کے متعلق تین باتیں قابل لحاظ ہیں

(۱) ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ حسن اور غریب ہے، اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں جانتے۔ حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

(۲) اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمن بن غزوان ہے، اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے لیکن اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے، علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے، جن میں سب سے بڑھ کر منکر وہ روایت ہے جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے۔

(۳) حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے، علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں۔

(۴) اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلال اور ابو بکرؓ بھی اس سفر میں شریک تھے، حالانکہ اس وقت بلالؓ کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابو بکرؓ بچے تھے۔

(۵) اس حدیث کے اخیر راوی ابو موسیٰ اشعریؓ ہیں، وہ شریک واقعہ نہ تھے، اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد میں جو سلسلہ سند مذکور ہے وہ مرسل یا معضل ہے یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے اور جو روایت معضل ہے اس میں راوی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا، بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کمال تک قابو پالیا تھا۔ سر ولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب و مشاہدات کے نتائج تھے، لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینہ میں پیدا ہو سکتا، جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے۔

[۱] نبراس فی شرح عیون السیر لابن سید الناس اور زرقانی اور میزان الاعتدال اور اصابہ تذکرہ عبدالرحمن ابن غزوان مستدرک حاکم مع تلخیص ج ۲ ص ۶۱۵، س۔ [۲] جزو اول قسم اول ص ۷۵، س۔

اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے۔

(۶) حافظ ابن حجر رواۃ پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن چونکہ حضرت ابو بکرؓ اور بلالؓ کی شرکت بداہۃً غلط ہے، اس لئے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں۔ عبدالرحمن بن غزوان کی نسبت خود انہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ خطا کرتا تھا، اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے: ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔

حرب فجار کی شرکت

عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا جو متواتر سلسلہ چلا آتا ہے، ان میں یہ جنگ سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک تھی۔

یہ لڑائی قریش اور قیس کے قبیلہ میں ہوئی تھی، قریش کے تمام خاندان نے اس معرکہ میں اپنی اپنی الگ فوجیں قائم کی تھیں، آل ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبدالمطلب تھے اور اسی صف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے، بڑے زور کا معرکہ ہوا، اول قیس، پھر قریش غالب آئے اور بالآخر صلح پر خاتمہ ہو گیا، اس لڑائی میں قریش کا رئیس اور سپہ سالار اعظم حرب بن امیہ تھا جو ابو سفیان کا باپ اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔

چونکہ قریش اس جنگ میں برسر حق تھے اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شرکت فرمائی، لیکن جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے، آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، امام سہیلیؒ نے صاف تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جنگ نہیں کی، ان کے الفاظ یہ ہیں۔

وانما لم یقاتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع اعمامہ فی الفجار وقد بلغ سن القتال لانہا کانت حرب فجار وکانوا ایضا کلھم کفارا ولم یاذن اللہ لمؤمن ان یقاتل الا لیکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔	اور آپ نے اس لڑائی میں جنگ نہیں کی حالانکہ آپ لڑائی کی عمر کو پہنچ چکے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی، نیز یہ وجہ تھی کہ فریقین کافر تھے اور مسلمانوں کو لڑائی کا حکم صرف اس لئے خدا نے دیا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔

اس لڑائی کو فجار اس لئے کہتے ہیں کہ ایام الحرام میں یعنی ان مہینوں میں پیش آئی تھی جن میں لڑنا ناجائز تھا۔

حلف الفضول

لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سینکڑوں گھرانے برباد کر دیئے تھے اور قتل و سفاکی موروثی اخلاق بن گئے تھے، یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جنگ فجار سے لوگ واپس پھرے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور خاندان کے سرگروہ تھے یہ تجویز پیش کی، چنانچہ خاندان ہاشم، زہرہ اور تیم، عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا[۲]۔

[۱] جامع نے بحیرا راہب کے قصہ کی مکمل تنقید سیرۃ النبی جلد سوم باب مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت میں کی ہے اس کو ملاحظہ فرمایا جائے، س۔ [۲] طبقات جلد ا ص ۸۲۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ میں شریک تھے اور عہد نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا، اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لئے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں[1]

اس معاہدہ کو حلف الفضول اس لئے کہتے ہیں کہ اول اول اس معاہدہ کا خیال جن لوگوں کو آیا ان کے نام میں لفظ فضیلت کا مادہ داخل تھا، یعنی فضیل بن حرث، فضیل بن وداعہ اور مفضل، یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلہ کے تھے، اگرچہ یہ معاہدہ بے کار گیا اور کسی کو یاد بھی نہ رہا، چنانچہ قریش نے نئے سرے سے بنیاد ڈالی۔ تاہم بانی اول کو نیک نیتی کا یہ ثمرہ ملا کہ اُن کے نام کی یادگار اب تک باقی ہے۔

تعمیر کعبہ

کعبہ کی عمارت صرف قد آدم اونچی تھی، اور دیواروں پر چھت نہ تھی، جس طرح ہمارے ملک میں عیدگاہیں ہوتی ہیں، چونکہ عمارت نشیب میں تھی، بارش کے زمانہ میں شہر کا پانی حرم میں آتا تھا، اس کی روک کیلئے بالائی حصہ پر بند بنوا دیا گیا تھا، لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، اور عمارت کو بار بار نقصان پہنچتا تھا، بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ موجودہ عمارت ڈھا کر نئے سرے سے زیادہ مستحکم بنائی جائے۔ حسن اتفاق یہ کہ جدہ کے بندرگاہ پر ایک تجارتی جہاز کنارہ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا، قریش کو خبر لگی تو ولید بن مغیرہ نے جدہ پہنچ کر جہاز کے تختے مول لے لئے، جہاز میں ایک رومی معمار تھا جس کا نام باقوم تھا، ولید اس کو ساتھ لایا، اور تمام قریش نے مل کر تعمیر شروع کی، مختلف قبائل نے عمارت کے مختلف حصے آپس میں تقسیم کر لئے تھے کہ کوئی اس شرف سے محروم نہ رہ جائے، لیکن جب حجر اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت جھگڑا پیدا ہوا، ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ خدمت اسی کے ہاتھ سے انجام پائے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں کھنچ گئیں۔

عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص جان دینے کی قسم کھاتا تھا، تو پیالہ میں خون بھر کر اس میں انگلیاں ڈبو لیتا تھا، اس موقع پر بھی بعض دعوے داروں نے یہ رسم ادا کی، چار دن تک یہ جھگڑا برپا رہا، پانچویں دن ابو امیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمر تھا رائے دی کہ کل صبح کو سب سے پہلے جو شخص آئے وہی ثالث قرار دے دیا جائے، سب نے یہ رائے تسلیم کی، دوسرے دن تمام قبائل کے معزز آدمی موقع پر پہنچے، کرشمہ ربانی دیکھو کہ صبح کو سب سے پہلے لوگوں کی نظریں جس پر پڑیں، وہ جمال جہاں تاب چہرہ محمدی تھا، لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ کیا کہ اس شرف سے تنہا بہرہ ور ہوں، آپ نے فرمایا جو قبائل دعوے دار ہیں، سب کا ایک ایک سردار انتخاب کر لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر بچھا کر حجر اسود کو اس میں رکھ دیا اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے چاروں کونے تھام لیں اور اوپر کو اٹھائیں، جب چادر موقع کے برابر آ گئی تو آپ نے حجر اسود کو اٹھا کر نصب فرما دیا۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ دین الٰہی کی عمارت کا آخری تکمیلی پتھر بھی ان ہی

[1] مسند، ج ۱ ص ۱۹۰ [2] لیکن امام سہیلی نے مسند حارث بن اسامہ سے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ اس معاہدہ میں یہ الفاظ تھے، ترد الفضول علی اھلہا [3] مسند طیالسی جلد اول ص ۱۰، مستدرک حاکم جلد اول ص ۵۰۳

ہاتھوں سے نصب ہوگا[1]۔

اسی طرح ایک سخت لڑائی آپ کے حسن تدبیر سے رک گئی، کعبہ کی عمارت اب مسقف کر دی گئی، لیکن چونکہ سامان تعمیر کافی نہ تھا، ایک طرف زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر بنیادیں قائم کی گئیں اور اس حصہ کے گرد چار دیواری کھینچ دی گئی کہ پھر موقع ہوگا تو کعبہ کے اندر لے لیں گے، یہی حصہ ہے جس کو آج حطیم کہتے ہیں، اور جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نبوت ارادہ فرمایا تھا کہ دیوار ڈھا کر نئے سرے سے عمارت بنائی جائے لیکن پھر خیال ہوا کہ نئے نئے مسلمان ہیں، دیوار کعبہ کے ڈھانے سے بدگمان ہو جائیں گے[2]۔

شغل تجارت

عرب اور خصوصاً قریش یعنی بنی اسمٰعیل ظہور اسلام کے ہزاروں برس پہلے سے تجارت پیشہ تھے[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ ہاشم نے قبائل عرب سے تجارتی معاہدے کرکے اس خاندانی طریقۂ اکتساب کو اور زیادہ مستحکم اور باقاعدہ کر دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب بھی تاجر تھے، اس بنا پر سن رشد کو پہنچنے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب فکر معاش کی طرف توجہ ہوئی تو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہ آیا۔

ابو طالب کے ساتھ آپ بچپن میں بھی بعض تجارتی سفر کر چکے تھے، جس سے ہر قسم کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا، اور آپ کے حسن معاملہ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی۔ لوگ عموماً اپنا سرمایہ کسی تجربہ کار اور امین شخص کے ہاتھ میں دے کر اس کے منافع میں شرکت کر لیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی خوشی کے ساتھ اس شرکت کو گوارا فرماتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرکائے تجارت کی شہادتوں سے جو احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کس دیانت اور راست بازی کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے تھے۔

تاجر کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ نادر مثال ایفائے عہد اور اتمام وعدہ کی ہو سکتی ہے، لیکن منصب سے پہلے مکہ کا تاجر امین اس اخلاقی نظیر کا بہترین نمونہ تھا، حضرت عبد اللہ بن ابی الحمساء ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا تھا، کچھ معاملہ ہو چکا تھا کچھ باقی تھا میں نے وعدہ کیا کہ پھر آؤں گا، اتفاق سے تین دن تک مجھ کو اپنا وعدہ یاد نہ آیا، تیسرے دن جب وعدہ گاہ پر پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی جگہ منتظر پایا، لیکن اس خلاف وعدہ سے آپ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا، صرف اس قدر فرمایا کہ تم نے مجھے زحمت دی، میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں[5]۔

کاروبار تجارت میں ہمیشہ آپ اپنا معاملہ صاف رکھتے تھے، نبوت سے پہلے بھی جن لوگوں سے تجارت میں

[1] یہ ایک حدیث کی طرف تلمیح ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ میں نبوت کی عمارت کا آخری پتھر ہوں، یعنی مکمل مذہب اور خاتم الرسل ہوں۔
[2] یہ واقعات ابن ہشام، طبقات، طبری میں متفرق اور زرقانی جلد اول ص ۲۰۶ تا ۲۰۰ میں مجتمعاً مذکور ہیں، اخیر کا واقعہ صحیح بخاری میں بھی ہے، بخاری میں یہ بھی ہے کہ قریش جب کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے اور دوش مبارک پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے تھے یہاں تک کہ شانے چھل گئے تھے۔ [3] اضافہ و زیادہ [4] تورات تکوین قصہ یوسف [5] سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۳۰۰ مطبع محمدی کتاب الادب باب فی العدۃ۔

آپ کا سابقہ تھا، وہ بھی اس کی شہادت دیتے تھے، سائبؓ نامی ایک صحابی جب، مسلمان ہو کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے ان کی تعریف کی، آپ نے فرمایا، میں تم سے زیادہ ان کو جانتا ہوں، سائبؓ نے کہا، آپ پر میرے ماں باپ قربان، آپ میرے شریک تجارت تھے، لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا فکنت لا تدادی ولا تماری[1] قیسؓ بن سائب مخزومی ایک اور صحابی بھی آپ کے شریک تجارت تھے، وہ بھی انہی الفاظ کے ساتھ آپ کے حسن معاملہ کی شہادت دیتے ہیں[2]۔

تجارت کی غرض سے شام و بصریٰ اور یمن کے متعدد سفر آپ نے کئے تھے۔

تزویج خدیجہ حضرت خدیجہؓ ایک معزز خاتون تھیں، ان کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ملتا ہے، اور اس رشتہ کے لحاظ سے وہ آپ کی چچیری بہن تھیں، انکی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں، اب وہ بیوہ تھیں، چونکہ نہایت شریف النفس اور پاکیزہ اخلاق تھیں، جاہلیت میں لوگ ان کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے، نہایت دولت مند تھیں، طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ جب اہل مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا ان کا سامان تمام قریش کے برابر ہوتا تھا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اب پچیس برس کی ہو چکی تھی، متعدد قومی کاموں میں آپ شریک ہو چکے تھے، تجارت کے کاروبار کے ذریعہ سے لوگوں کے ساتھ معاملات پیش آتے تھے، اس بنا پر آپ کے حسن معاملہ، راستبازی، صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاقی کی عام شہرت ہو چکی تھی، یہاں تک کہ زبان خلق نے آپ کو امین کا لقب دے دیا تھا حضرت خدیجہؓ نے ان اسباب کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ میرا مال تجارت لے کر شام کو جائیں، جو معاوضہ میں اوروں کو دیتی ہوں آپ کو اس کا مضاعف دوں گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا اور مال تجارت لے کر بصریٰ تشریف لے گئے۔

واپس آنے کے تقریباً تین مہینہ کے بعد حضرت خدیجہؓ نے آپ کے پاس شادی کا پیغام دیا، ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے، عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں، اور اس میں بالغہ نابالغہ کی قید نہ تھی، حضرت خدیجہؓ نے چچا کے ہوتے خود براہ راست تمام مراتب طے کئے، تاریخ معین پر ابوطالب اور تمام رؤسائے خاندان جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے، حضرت خدیجہؓ کے مکان پر آئے، ابوطالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانسو طلائی درہم مہر قرار پایا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد زندہ تھے، اور ان کی موجودگی میں نکاح ہوا، لیکن شراب میں مخمور تھے، جب ہوش میں آئے تو نکاح کا حال سن کے برہم ہوئے کہ برابر کا جوڑ نہیں۔

لیکن یہ روایت صحیح نہیں، امام سہیلی نے بہ تصریح اور بہ دلیل ثابت کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد جنگ فجار کے قبل انتقال کر چکے تھے۔

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۱۷، [2] اصابہ ج ۵ ص ۳۵۳، ترجمہ حضرت قیسؓ بن سائب۔

حضرت خدیجہؓ جس مکان میں رہتی تھیں وہ آج بھی (حسب بیان مورخ طبری) انہی کے نام سے مشہور ہے امیر معاویہؓ نے اس مکان کو خرید کر مسجد بنا دیا۔

شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس کی تھی، اور پہلے دو شوہروں سے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں، ان کے نام اور مفصل حالات آگے آئیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر اولاد ہوئی، بجز حضرت ابراہیمؑ کے حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ہوئی ان کے حالات آگے تفصیل سے آئیں گے۔

جستہ جستہ واقعات یہ واقعات تھے جن میں تاریخی ترتیب معلوم ہے، اس لئے مسلسل لکھے گئے، ان امور کے سوا جستہ جستہ واقعات کا بھی پتہ لگتا ہے، چونکہ ان کے سنین اور تاریخیں غیر معلوم ہیں، اس لئے ان کو عام سلسلہ سے الگ یکجا لکھنا زیادہ موزوں ہوگا۔

حدود سفر اہل مکہ عموماً تجارت کی غرض سے سفر کرنے کے عادی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس تقریب سے متعدد سفر کئے، شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گزر چکا ہے، اس کے علاوہ اور مقامات تجارت میں بھی آپ کا تشریف لے جانا ثابت ہے، عرب میں مختلف مقامات میں جو بازار قائم تھے، ان میں سے جباشہ کا ذکر ابن سید الناس نے کیا ہے، حضرت خدیجہؓ نے جہاں جہاں آپ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا ان میں جرش بھی ہے، جو یمن میں ہے، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے، اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپ دو دفعہ تشریف لے گئے، اور ہر دفعہ حضرت خدیجہؓ نے معاوضہ میں ایک اونٹ دیا[3]۔

نبوت کے جس سال آپ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفد آئے، ان میں جب بحرین سے عبدالقیس کا وفد آیا، تو آپ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے[4]۔ مورخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں، اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو اور وسعت دی ہے، ایک مورخ نے لکھا ہے، کہ آپ نے بحری سفر بھی کیا تھا، جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی صحیح تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے[5]، مورخ مذکور کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپ مصر بھی

---

[1] حضرت خدیجہؓ کے نکاح کے واقعات ابن ہشام، ابن سعد و طبری میں باختلاف اجمال و تفصیل و اثبات و نفی مذکور ہیں، میں نے قرائن سے جو روایت زیادہ قابل اعتبار پائی نقل کی ہے، یکجا تمام حالات دیکھنے ہوں تو زرقانی جلد اول ص ۲۳۲ سے ۲۳۶ تک دیکھنا چاہیئے۔

[2] حضرت خدیجہؓ کے مکان کا ذکر صرف طبری نے کیا ہے، ابن حنبل (مسند ابن عباس) میں واقعات مذکور ہیں۔

[3] نور النبراس فی شرح ابن سید الناس [4] مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۰۶ [5] مارگولیس ص ۵۷۔

تشریف لے گئے تھے، اور دیڈ سی (بحر میت) کا بھی معائنہ کیا تھا، لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہیں۔

مراسم شرک سے اجتناب

یہ قطعاً ثابت ہے کہ آپؐ بچپن اور شباب میں بھی جب کہ منصب پیغمبری سے ممتاز نہیں ہوئے تھے، مراسم شرک سے ہمیشہ مجتنب رہے۔

ایک دفعہ قریش نے آپؐ کے سامنے کھانا لاکر رکھا، یہ کھانا بتوں کے چڑھاوے کا تھا، جانور جو ذبح کیا گیا تھا کسی بُت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا، آپؐ نے کھانے سے انکار کیا۔

نصاریٰ نے دعویٰ کیا ہے کہ آپؐ کے اعتقادات میں جو تغیر ہوا ہے وہ عہدِ نبوت سے ہوا ہے، ورنہ اس سے پہلے آپؐ کا طرزِ عمل وہی تھا جو آپ کے خاندان اور اہل شہر کا تھا، چنانچہ آپؐ نے اپنے پہلے صاحبزادہ کا نام عبد العزیٰ رکھا تھا، اور یہ روایت خود امام بخاری کی تاریخ صغیر میں موجود ہے، لیکن یہ روایت اگر صحیح بھی ہو تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کیونکر استدلال ہو سکتا ہے۔

حضرت خدیجہؓ اسلام سے پہلے بُت پرست تھیں، انھوں نے یہ نام رکھا ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک منصب ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے، اس لئے آپؐ نے تعرض نہ فرمایا ہوگا۔ اور اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت فی نفسہ بھی ثابت نہیں، اس روایت کا سب سے زیادہ ترجیح سلسلہ وہ ہے جو امام بخاری نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے، اس کا پہلا راوی اسمٰعیل ہے جس کا پورا نام اسمٰعیل بن ابی اویس ہے، اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے لیکن گروہ کثیر کی رائے حسب ذیل ہے۔

معاویہ بن صالح	اسمٰعیل اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔
یحییٰ بن مخلط	وہ جھوٹ بولتا ہے اور محض ہیچ ہے۔
امام نسائی	ضعیف اور غیر ثقہ ہے۔
نصر بن سلمہ مروزی	وہ کذاب ہے۔
دار قطنی	میں اس کو صحیح روایت کے لئے پسند نہیں کرتا۔
سیف بن محمد	وہ جھوٹ حدیثیں بناتا ہے۔
سلمہ بن شبیب	مجھ سے اس نے خود اقرار کیا کہ جب کبھی کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا تو میں ایک حدیث بنالیتا تھا۔

ٍٍیورپین مورخین جن کی بنیاد صرف قیاس ورائے پر ہوتی ہے اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معرجا در حقیقت یورپ کے عہد مظلم کی مضحکہ انگیز روایت ہے بحری سفر آپ نے یقیناً نہیں کیا لیکن اگر بحرین تشریف لے جانے کی روایت صحیح ہے تو خلیج فارس آپ نے دیکھا ہوگا، بحر میت کا مشاہدہ بھی ممکن ہے کیونکہ اس کا موقع عرب وشام کے درمیان میں ہے جہاں سے آپ کئی بار تجارت کے ساتھ گزرے ہوں گے۔ ٍٍمسند صحیح بخاری باب مناقب ذکر زید بن عمرو بن نفیل، یہ حدیث امام بخاری نے اور ابواب میں بھی نقل کی ہے اس کے الفاظ میں اجمال رہ گیا ہے جو اس روایت میں صاف ہوگیا ہے، مسند ابن امام حنبل (ج اول ص ۱۸۹) میں ایک روایت ہے جس میں بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو اس کھانے پر بلایا اور زید نے انکار کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاریخ سے کبھی بتوں پر ذبح کیا ہوا کھانا نہیں کھایا لیکن اس روایت کے راویوں کا حال نہیں ملتا اور یوں بھی بخاری کے سامنے اس روایت کی کیا وقعت ہے۔ عزیٰ ایک بت کا نام تھا

[illegible] امر واقعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے بت پرستی کی برائی شروع کردی تھی، اور جن لوگوں پر آپؐ کو اعتماد تھا، ان کو اس بات سے منع فرماتے تھے۔ (مستدرک حاکم جلد سوم ذکر زید بن حارثہ)

موحدین کی ملاقات

اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے فیض الٰہی کی حضشعاعیں عرب میں پھیلنی شروع ہوگئی تھیں، چنانچہ قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عبید بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل نے بت پرستی سے انکار کر دیا تھا، ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید سے ملاقات کی تھی جس کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے، ورقہ عیسائی ہو گئے تھے، اور چونکہ حضرت خدیجہؓ کے چچا زاد تھے اور مکہ ہی میں رہتے تھے، اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ آپؐ ان سے بھی ملے ہوں گے، بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان سے آپؐ کی دوستی تھی

ادب و محاضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدہ نے عکاظ میں جو خطبہ دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس خطبہ میں شریک تھے، اس خطبہ کا بڑا حصہ اکثر اہل ادب نے نقل کیا ہے، چونکہ اس کے فقرے بظاہر قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کی طرح چھوٹے اور مقفیٰ ہیں، اس لئے عیسائی مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طرز اسی سے لیا ہے، چنانچہ بعض فقرے یہ ہیں۔

ایہا الناس اسمعوا وعوا، واذا وعیتم فانتفعوا، انہ من عاش مات، ومن مات فات

ٍٍمسٹر مارگولیس نے اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے اور اس کے ثبوت میں دعویٰ سے زیادہ حیرت انگیز فریب کاری کی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ دونوں سونے سے پہلے ایک بُت کی پرستش کیا کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا، مصنف موصوف نے اس کی سند میں امام حنبل کی روایت (جلد ۴ صفحہ ۲۲۲) پیش کی ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں

حدثنی جار لخدیجۃ بنت خویلد انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یقول لخدیجۃ ای خدیجۃ واللہ لا اعبد اللات والعزی واللہ لا اعبد ابدا قال فتقول خدیجۃ خل اللات خل العزی قال کانت صنمھم التی کانوا یعبدون ثم یضطجعون۔	مجھ سے خدیجہ بنت خویلد کے ایک ہمسایہ نے بیان کیا کہ پیغمبر صاحب کو حضرت خدیجہؓ سے یہ کہتے سنا کہ اے خدیجہ خدا کی قسم میں لات اور عزیٰ کی پرستش نہ کروں گا، خدیجہؓ کہتی تھیں کہ لات کو چھوڑیے، عزیٰ کو جانے دیجئے یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے، راوی نے کہا کہ لات و عزیٰ وہ بت تھے جن کی پرستش اہل عرب سونے سے پہلے کیا کرتے تھے۔

ایک معمولی عربی دان بھی سمجھ سکتا ہے کہ عبارت مذکور میں کانوا کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اہل عرب لات و عزیٰ کی پرستش کیا کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا تو تثنیہ کا صیغہ ہوتا نہ کہ جمع کا، اس کے علاوہ خود اسی روایت میں لات و عزیٰ کی پرستش سے آنحضرت صلعم کا انکار کرنا مذکور ہے، مارگولیس صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی لیکن مصنف موصوف نے اس کی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا بلکہ ولہوسن کا حوالہ دیا ہے (دیکھو مارگولیس کی کتاب ص ۷۰) معجم البلدان ایک جغرافی کتاب ہے اس روایت اس مضمون کی موجود ہے لیکن اول تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب کوئی سند نہیں ہو سکتی، ثانیاً یہ روایت کلبی سے ہے جو مشہور دروغگو ہے، ثالثاً مشاہدات میں تصریح ہے کہ قریش نے کبھی اسلام لانے سے پہلے عزیٰ کا ذکر کیا تھا [illegible]

ماھوات‌ان امطروبنات، ورزاق واقوات، وآباء وامهات، واحیاء واموات، وجمیع واشتات، ان
فی السماء لخبرا، وان فی الارض لعبرا، لیل داج، وسماء ذات ابراج، وبحار ذات امواج، مالی اری الناس
یذهبون فلا یرجعون، ارضوا بالمقام فاقاموا، ام ترکوا هناک فناموا، این من بغی وشید وزخرف
ونجد، وغره المال والولد، این من بغی وطغی۔

قس بن ساعدہ کی روایت اور اس کا خطبہ مختصر ومطول بعبارات مختلف بغوی، ازدی، بیہقی، جاحظ وغیرہ نے نقل کیا ہے، لیکن وہ سرتاپا مصنوعی اور موضوع ہے، اس کے رواۃ عموماً ناقابل سند بلکہ کذاب ہیں، چنانچہ سیوطی نے موضوعات میں اس روایت کے تمام طریقوں کو نقل کرکے اُن کے رواۃ سے بحث کی ہے، اور علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ کے اقوال تفصیل سے نقل کئے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ یہ روایت مختلف طریقوں سے مروی ہے، لیکن ہر طریقہ میں کوئی نہ کوئی راوی ایسا ہے جو موضوع حدیثیں بنایا کرتا تھا، اس کا ایک مشترک راوی محمد بن حجاج ہے، اس کی نسبت ابن معین کا قول ہے کہ کذاب اور خبیث ہے۔ ابن عدی نے لکھا ہے کہ ہریسہ کی حدیث اسی نے وضع کی ہے۔ ایک طریقہ کا راوی سعید بن ہبیرہ ہے، اس کی نسبت ابن حبان نے لکھا ہے کہ ثقہ لوگوں کی زبانی جھوٹی حدیثیں روایت کرتا تھا یا تو وہ خود یہ حدیثیں تصنیف کرتا تھا یا اور لوگ اس کے لئے بنا دیا کرتے۔ ایک طریقہ کے راوی قاسم بن عبداللہ اور احمد بن سعید ہیں، اور یہ دونوں حدیث بنانے میں بدنام ہیں، بیہقی نے اس روایت کے متعلق ایک بڑا قصہ نقل کیا ہے، جس میں حضرت ابوبکرؓ نے قس بن ساعدہ کا پورا خطبہ اپنی یاد سے بیان کیا ہے، یہ روایت پوری کی پوری موضوع ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس روایت کے اور طریقے بھی نقل کئے ہیں اور ان کی تضعیف کی ہے۔

؎ یہ پوری تفصیل اللآلی المصنوعۃ، مطبوعہ مصر ص ۹۵ تا ۱۰۰ میں ہے۔ ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے، بنوامیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہوگیا تھا کہ اپنے زمانہ کے شعراء اور فصحاء سے اشعار اور خطبے تصنیف کراتے تھے اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعراء اور خطباء کے نام سے مشہور کرتے تھے، محمد ابن اسحاق اس رتبہ کے شخص ہیں کہ امام بخاری نے جزء القراءۃ میں ان سے روایت کی ہے تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال (مطبوعہ مصر ص ۹۲) میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دے دیتے تھے کہ ان کے بارے میں اشعار کہہ دو، ان اشعار کو وہ اپنی کتاب میں شامل کردیتے تھے، ابن ہشام میں حضرت حمزہؓ، ابوبکرؓ، امیہ بن ابی الصلت، ابوطالب کے سینکڑوں اشعار نقل کئے ہیں جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے، ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کرکے اکثر موقعوں پر لکھ دیتے ہیں کہ فن شعر کے ماہر ان اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں مثلاً سریہ عبیدۃ بن الحرث میں (ابن ہشام جلد دوم ص ۳ مطبوعہ مصر) حضرت ابوبکرؓ کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے۔

واکثر اھل العلم بالشعر ینکر ھذہ القصیدۃ لابی بکر۔ — اور اکثر اہل علم اور فن شعر والے اس بات کے منکر ہیں کہ یہ قصیدہ حضرت ابوبکرؓ کا ہے۔

یہ وضع مختلف اغراض سے کی جاتی تھی، زیادہ اس وجہ سے کہ ان خطبوں یا شعروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی یا اور کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کردیتے تھے مثلاً یہی قس بن ساعدہ کا خطبہ، اس میں یہ فقرے بھی ہیں۔

احباب خاص

نبوت سے پہلے جو لوگ آپ کے احباب خاص تھے، سب نہایت پاکیزہ اخلاق، بلند رتبہ اور عالی منزلت تھے، ان میں سب سے مقدم حضرت ابوبکرؓ تھے، جو برسوں آپ کے شریک صحبت رہے حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی حکیم بن حزام جو قریش کے نہایت معزز رئیس تھے، وہ بھی احباب خاص میں تھے حرم کا منصب رفادۃ انہی کے ہاتھ میں تھا، دارالندوۃ کے بھی یہی مالک تھے، چنانچہ اسلام کے بعد امیر معاویہؓ کے ہاتھ ایک لاکھ درہم پر بیچ ڈالا، لیکن یہ کل رقم خیرات کردی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں ۵ برس بڑے تھے اگرچہ یہ مدت تک یعنی ہجرت کے آٹھویں سال تک ایمان نہیں لائے، لیکن اس حالت میں بھی آنحضرت صلی اللہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

نبیا قد حان حینہ واظلکم اوانہ فطوبی لمن — ایک پیغمبر کا زمانہ قریب آگیا ہے سو اس کو مبارکی ہے جو اس پر
من بہ فہداہ وویل لمن خالفہ وعصاہ۔ — ایمان لائے گا اور وہ اس کو ہدایت کرے گا اور تباہی ہے اس
(اللآلی المصنوعہ ص ۲) — کے لئے جو اس کی مخالفت اور نافرمانی کرے گا۔

ابوطالب کے نام سے جو لامیہ قصیدہ ابن ہشام وغیرہ نے نقل کیا ہے (ابن ہشام ۹۳، ۹۴) سرتاپا موضوع ہے اس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں

فاصبح فینا احمد فی ارومۃ — تقصر عنہ سورۃ المتطاول
فایدہ رب العباد بنصرہ — واظھر دینا حقہ غیر باطل

(اس قصیدہ کو سرتاپا موضوع کہنے کے بجائے جیسا کہ مصنفؒ نے کہا ہے اکثر کہنا صحیح ہے کیونکہ اس کے دو شعر صحاح میں بھی مذکور ہیں مثلاً صحیح بخاری وصحیح مسلم باب الاستسقاء۔ خود ابن اسحاق نے اس قصیدہ کو نقل کرکے لکھا ہے وبعض اھل العلم بالشعر ینکر اکثرھا یعنی بعض ماہرین شعر اس کے اکثر اشعار کی صحت سے انکار کرتے ہیں۔ س) اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کے متعلق جو باتیں ہیں ان کے مطابق اشعار تصنیف کراتے اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی، امیہ بن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں ان کو دیکھ کر صاف یقین ہوجاتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید کو سامنے رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں مثلاً

فقلت لہ اذھب بھرون فادعوا — الی اللہ فرعون الذی کان طاغیا
وقولا لہ انت رفعت ھذہ — بلا عمد ارفق اذا بک بانیا
وقولا لہ انت سویت وسطھا — منیرا اذا ما جنہ اللیل ھادیا

ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مارگولیس نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے، چنانچہ کہتے ہیں قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے (صفحہ ۶۰ تا صفحہ ۶۳) ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیرخواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا، آج یورپ والے کس سے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر نہ تھے بلکہ جاہلیت کے خطباء اور شعراء سے معتقدات و خیالات بلفظہا اخذ کرلیتے تھے لیکن ادب کا نکتہ شناس اور فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فن ادب اور روایت میں مہارت کے لئے ابھی تک ایک زمانہ درکار ہے اور جب وہ زمانہ آئے گا تو یورپ کو اپنی بدمذاقی پر خود شرم آئے گی۔

؎ اصابہ ذکر حضرت ابوبکرؓ (حضرت ابوبکرؓ کا نام عبداللہ تھا، اصابہ میں اسی نام کے ذیل میں حضرت ابوبکرؓ کا حال لکھا ہے) صفحہ [illegible]
؎ اصابہ ذکر حکیم بن حزام (جلد اصفحہ ۳۴۹)۔

...نہ خود سے ساجت بحث رہتے تھے، ایک دفعہ جب ذی یزن کا اسباب نیلام ہوا تھا اس میں ایک عمدہ حلہ تھا انہوں نے پچاس اشرفیوں میں اس کو خریدا اور مدینہ لے کر آئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر کریں، آپ نے فرمایا کہ میں مشرکوں کا ہدیہ نہیں قبول کرتا، البتہ قیمت لو تو لے سکتا ہوں، مجبور ہو کر انھوں نے قیمت لینی گوارا کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لے لیا۔

حضرت ضمادؓ بن ثعلبہ جو ازد کے قبیلے سے تھے، جاہلیت میں طبابت اور جراحی کا پیشہ کرتے تھے، یہ بھی احباب میں سے تھے، نبوت کے زمانہ میں یہ مکہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھا کہ راستہ میں جا رہے ہیں اور پیچھے لونڈوں کا غول ہے، مکہ کے کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہتے تھے، لونڈوں کا غول دیکھ کر ضماد نے قیاس کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا محمدؐ! میں جنون کا علاج کر سکتا ہوں، آپ نے حمد و ثنا کے بعد ... موثر کلمے ادا کئے، ضماد مسلمان ہو گئے۔ اس واقعہ کو مختصراً مسلم و نسائی نے بھی لکھا ہے، لیکن زیادہ تفصیل مسند امام احمد بن حنبل (ج ۱ ص ۳۰۲) میں ہے، جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تجارت کے کاروبار میں شریک تھے ان میں سے ایک صاحب قیس بن سائب مخزومی تھے، مجاہد بن جبر جو مشہور مفسر گزرے ہیں، انہی کے غلام تھے، ان کا بیان ہے کہ شرکا کے ساتھ آپ کا معاملہ نہایت صاف رہتا تھا اور کبھی کوئی جھگڑا یا مناقشہ پیش نہیں آتا تھا[1]۔

---

[1] مسند امام حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۲۵، استیعاب رجلد ۲ صفحہ ۵۳۹، و اصابہ، ذکر قیس۔

آفتابِ رسالت کا طلوع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں پیدا ہوئے، مکہ بت پرستی کا مرکز اعظم تھا، خود کعبہ میں تین سو ساٹھ[1] بت تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا تمغائے امتیاز صرف اس قدر تھا کہ اس صنم کدہ کے متولی اور کلید بردار تھے، بااین ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بتوں کے آگے سر نہیں جھکایا۔ دیگر رسوم جاہلیت میں بھی کبھی شرکت نہیں کی، قریش نے اس بنا پر کہ ان کو عام لوگوں سے ہر بات میں ممتاز رہنا چاہیئے، یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ ایام حج میں قریش کے لئے عرفات جانا ضرور نہیں اور یہ کہ جو لوگ باہر سے آئیں وہ قریش کا لباس اختیار کریں ورنہ اُن کو عریاں ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ہوگا، چنانچہ اسی بنا پر طوافِ عریاں کا عام رواج ہو گیا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں میں کبھی اپنے خاندان کا ساتھ نہ دیا۔

عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا، راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہو کر کسی مقام پر جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا داستان شروع کرتا تھا، لوگ بڑے ذوق و شوق سے رات رات بھر سنتے تھے، بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے وہیں نیند آ گئی، اٹھے تو صبح ہو چکی تھی، ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا، اس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا، چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا لیکن دونوں دفعہ توفیق الٰہی نے بچا لیا کہ "تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے"[2]۔

یہ فطرت سلیم اور نیک سرشتی کا اقتضا تھا لیکن ایک شریعتِ کبریٰ کی تاسیس، ایک مذہب کامل کی تشیید اور رہنمائی کونین کے منصب عظیم کے لئے کچھ اور درکار تھا، اسی زمانہ کے قریب میں اور حق پرستوں زید، ورقہ، عثمان بن حویرث کے دل میں خیال آیا کہ جماد لا یعقل کے آگے سر جھکانا حماقت ہے، چنانچہ سب مذہب حق کی تلاش کے لئے نکلے لیکن ناکامی کی دیوار سے سر ٹکرا کر رہ گئے، ورقہ اور عثمان عیسائی ہو گئے، اور زید یہ کہتے کہتے مر گئے، "اے خدا! اگر مجھ کو یہ معلوم ہوتا کہ تجھ کو کس طریقے سے پوجنا چاہیئے تو میں اسی طریقہ سے تجھ کو پوجتا"[3]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے دنیاوی تعلقات تھے، تجارت کا کاروبار تھا، متعدد اولادیں تھیں، تجارت کی ضرورت سے اکثر سفر کرنا پڑتا تھا، لیکن دستِ قدرت کو جو کام لینا تھا وہ ان تمام مشاغل سے بالاتر تھا، دنیا اور دنیا کے تمام کام آپ کو ہیچ نظر آتے تھے، تاہم مطلوب حقیقی کا اب تک پتہ نہ تھا۔

مکہ معظمہ سے تین میل پر ایک غار تھا جس کو حرا کہتے ہیں، آپ مہینوں وہاں جا کر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے، کھانے

---

[1] ابن ہشام مطبوعہ مصر ۱۲۹۵ھ جلد اول صفحہ ۹۶ [2] ابن ہشام صفحہ ۶۹ [3] بزار و مستدرک بحوالہ نسیم الریاض ج ۱ اول صفحہ ۶۰۹ و خصائص الکبریٰ سیوطی ج ۱ صفحہ ۸۸ ... سر ولیم میور صاحب لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں لکھتے ہیں: "ہماری تمام تصنیفات محمد کے بارہ میں ان کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہل مکہ میں کمیاب تھیں، متفق ہیں"۔

پینے کا سامان ساتھ لے جاتے، وہ ختم ہو چکتا تو پھر گھر پر تشریف لاتے اور پھر واپس جا کر مراقبہ میں مصروف ہوتے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ غار حرا میں تحنث یعنی عبادت کیا کرتے تھے، یہ عبادت کیا تھی؟ عینی شرح بخاری میں ہے۔

قیل ما کان صفة تعبدہ اجیب بان ذلک کان بالتفکر والاعتبار۔ — یہ سوال کیا گیا ہے کہ آپ کی عبادت کیا تھی؟ جواب یہ ہے کہ غور و فکر اور عبرت پذیری۔

یہ وہی عبادت تھی جو آپ کے دادا ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کی تھی، ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی، دھوکا ہوا، چاند نکلا تو اور بھی شبہ ہوا، آفتاب پر اس سے زیادہ، لیکن جب سب نظروں سے غائب ہو گئے تو بے ساختہ پکار اٹھے۔

لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ..... — میں فانی چیزوں کو نہیں چاہتا۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (انعام) — میں اپنا منہ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے زمین و آسمان پیدا کیا۔

ایک مغربی مورخ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کی کیفیت اس طرح ادا کی ہے:

"سفر و حضر میں ہر جگہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے تھے، میں کیا ہوں؟ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں، کیا کوہ حرا کی چٹانیں، کوہ طور کی سر بفلک چوٹیاں، کھنڈر اور میدان، کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا، نہیں ہرگز نہیں، بلکہ گنبد گرداں، گردش لیل و نہار، چمکتے ہوئے ستارے برستے ہوئے بادل، کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا[1]۔"

نبوت کا دیباچہ یہ تھا کہ خواب میں آپ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے۔ جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے تھے بعینہ وہی پیش آتا تھا۔ ایک دن جب کہ آپ حسب معمول غار حرا میں مراقبہ میں مصروف تھے، فرشتہ غیب نظر آیا کہ آپ سے کہہ رہا ہے۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (اقرأ) — پڑھ اس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ تیرا خدا کریم ہے وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعے علم سکھایا وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔

آپ گھر واپس تشریف لائے تو جلال الٰہی سے لبریز تھے۔

آپ نے حضرت خدیجہؓ سے تمام واقعہ بیان کیا، وہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو عبری زبان جانتے

[1] کارلائل ہیروز مذکور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ [2] وحی کے انواع میں سے ایک خواب بھی ہے۔ [3] صحیح بخاری کے شروع میں ہے۔ اول ما بدی به رسول الله صلی الله علیه وسلم من الوحی الرؤیا الصالحة فی النوم۔ بخاری کتاب التعبیر میں زیادہ صاف طریقہ پر یہ مسئلہ ادا کیا گیا ہے۔ [4] صحیح بخاری باب بدء الوحی و کتاب التعبیر، یہ روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، حضرت عائشہؓ اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھیں، محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مرسل کہتے ہیں، لیکن صحابہؓ کا مرسل محدثین کے نزدیک قابل حجت ہے کیونکہ متروک راوی بھی صحابہ ہی ہوں گے۔

تھے اور توریت و انجیل کے ماہر تھے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ کی کیفیت سنی تو کہا یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ پر اترا تھا۔

روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈر پیدا ہوا، حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ آپ متردد نہ ہوں، خدا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا، پھر وہ آپ کو ورقہ کے پاس لے گئیں، انہوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بے شبہ یہ الفاظ نکلے "مجھ کو ڈر ہے"۔ لیکن یہ تردد، یہ ہیبت، یہ اضطراب جلال الٰہی کا تاثر اور نبوت کے بار گراں کی عظمت کا تخیل تھا، آپ نے کیا دیکھا؟ ناموس اعظم نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوتے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں۔

صحیح بخاری باب التعبیر میں ہے کہ چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں، دفعۃً حضرت جبریل نظر آتے تھے اور کہتے تھے "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو" اس سے آپ کو اس وقت تسکین ہو جاتی تھی، لیکن جب پھر وحی کچھ دنوں کے لئے رک جاتی تھی تو پھر آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبریل نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے حصہ اول کی شرح میں معترضین کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ "ایک پیغمبر کو نبوت میں کیونکر شک ہو سکتا ہے اور ہو تو کسی عیسائی کے تسکین دینے سے کیا تسکین ہو سکتی ہے؟" پھر ایک مشہور محدث کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ "نبوت ایک امر عظیم ہے، اس کا تحمل دفعتاً نہیں ہو سکتا۔ اس لئے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب کے ذریعے سے مانوس کیا گیا، پھر جب دفعۃً فرشتہ نظر آیا تو آپ اقتضائے بشریت سے خوف زدہ ہو گئے، حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسکین دی، پھر جب ورقہ نے تصدیق کی تو آپ کو پورا یقین ہو گیا، محدث مذکور کے الفاظ یہ ہیں:-

فلما سمع کلامه ایقن بالحق واعترف به۔ — جب آپ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپ کو حق کا یقین آ گیا اور آپ نے اس کا اعتراف کیا۔

محدث مذکور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ وحی بار بار اس لئے رک جاتی تھی کہ آپ رفتہ رفتہ اس کے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں[1]۔

لیکن جب کہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبوت سے پہلے سفر شام میں (بمقام بصریٰ) جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے تھے، اس کی تمام شاخیں آپ پر جھک آئیں، جس سے بحیرا نے آپ کے نبی ہونے کا یقین کیا" جب کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا" جب کہ صحاح میں موجود ہے کہ نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلائشیں نکال کر پھینک دیں، تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیونکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپ اسقدر

[1] فتح الباری شرح صحیح بخاری کتاب التعبیر جلد ۱۲ صفحہ ۳۱۰ مطبوعہ مصر۔

خوف زدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا، اور آپؐ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دینے کا ارادہ کرتے تھے اور بار بار حضرت جبرئیل کو اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی تھی، کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا؟ حضرت موسیٰ نے درخت سے آواز سُنی کہ "میں خدا ہوں" تو کیا ان کو کوئی شبہ پیدا ہوا؟ حافظ ابن حجر وغیرہ کی پیروی کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں، ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ خود اصل روایت بہ سند مرفوع متصل ہے یا نہیں؟ یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا، چنانچہ خود شارحین بخاری نے تصریح کر دی ہے، یہ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کے لئے سند مقطوع کافی نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرضِ نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیشِ نظر تھیں، اگر آپؐ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغِ دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیمؑ کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں تو مشکل نہ تھی، لیکن خاتم انبیا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغِ اسلام سے منور کر دینا تھا، اس لئے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا، سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پُرخطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس کے لئے صرف وہ لوگ انتخاب کئے جا سکتے تھے جو فیض یابِ صحبت رہ چکے تھے جن کو آپؐ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپؐ کے صدقِ دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے، یہ لوگ حضرت خدیجہؓ آپؐ کی حرمِ محترم تھیں، حضرت علیؓ تھے جو آپؐ کی آغوشِ تربیت میں پلے تھے، زیدؓ تھے جو آپؐ کے آزاد کردہ غلام اور بندۂ خاص تھے، حضرت ابوبکرؓ تھے جو برسوں سے فیضیابِ خدمت تھے، سب سے پہلے آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کو یہ پیغام سنایا، وہ سُننے سے پہلے مومن تھیں، پھر اور بزرگوں کی باری آئی اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔

حضرت ابوبکرؓ دولت مند، ماہرِ انساب، صاحب الرائے اور فیاض تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، غرض ان اوصاف کی وجہ سے مکہ میں ان کا عام اثر تھا اور معززینِ شہر ان سے ہر بات میں مشورہ لیتے تھے، اربابِ روایت کا بیان ہے کہ کبارِ صحابہؓ میں سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص فاتحِ ایران، حضرت طلحہؓ سب انہی کی ترغیب اور ہدایت سے اسلام لائے ان کی وجہ سے یہ چرچا چپکے چپکے اور لوگوں میں بھی پھیلا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان سابقین اولین میں عمارؓ، خبابؓ بن الارت، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، طلحہؓ، ارقمؓ، سعیدؓ بن زید عبداللہؓ بن مسعود، عثمانؓ بن مظعون، عبیدہؓ اور صہیبؓ رومی زیادہ ممتاز ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا، نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمانِ خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے، نماز کا جب وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے، ابن الاثیر کا بیان ہے کہ چاشت کی نماز آپؐ حرم ہی میں ادا کرتے تھے، کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی، ایک دفعہ آپؐ حضرت

لہ اصابہ فی احوال الصحابہ میں بزرگانِ موصوف کا تذکرہ ملاحظہ کرنا چاہیئے لہ دیکھو ریاض النضرۃ لمحب الطبری مطبوعہ مصر صفحہ ۵۴ لہ کامل ابن اثیر ج ۲ صفحہ ۵ ذکر الاختلاف فی اول من اسلم الخ۔

علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے آپؐ کے چچا ابو طالب آ نکلے، اُن کو اس جدید طریقۂ عبادت پر تعجب ہوا، کھڑے ہو گئے اور بغور دیکھتے رہے، نماز کے بعد پوچھا کہ یہ کون سا دین ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہمارے دادا ابراہیمؑ کا یہی دین تھا۔ ابو طالب نے کہا میں اس کو اختیار تو نہیں کر سکتا لیکن تم کو اجازت ہے، اور کوئی شخص تمہارا مزاحم نہ ہو سکے گا۔

یہ تاریخِ اسلام کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیونکر پھیلا؟ مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار بتایا ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی، لیکن ایک خاص پہلو پر یہیں نگاہ ڈال لینی چاہیئے، یعنی یہ کہ اوائلِ اسلام میں جب کہ اسلام لانا جان و مال سے ہاتھ دھونا تھا، کون لوگ اور کس قسم کے لوگ ایمان لائے؟ اس زمانہ میں جو لوگ اسلام لائے ان میں چند خصائص مشترک تھے اس قسم کے (لیکن بالعکس) مشترک خصائص ان لوگوں میں بھی پائے جاتے تھے جنھوں نے شدت سے مخالفت کی، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے۔

(۱) اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاشِ حق میں سرگرداں اور فطرۃً نیک اور پاکیزہ اخلاق تھے مثلاً حضرت ابوبکرؓ، جاہلیت میں بھی عفیف، پارسا اور صدق و دیانت میں مشہور تھے۔ عثمان بن مظعون صوفی مزاج تھے اور اسلام سے پہلے شراب چھوڑ چکے تھے، اسلام کے بعد چاہتے تھے کہ راہب بن جائیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا۔ صہیبؓ عبداللہ بن جدعان کے تربیت یافتہ تھے جو اسلام سے پہلے تارکِ شراب ہو کر وفات پا چکے تھے، حضرت ابوذرؓ جن کا اسلام لانے والوں میں چھٹا یا ساتواں نمبر تھا۔ ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے بُت پرستی چھوڑ چکے تھے اور غیر متعین طریقہ سے جس طرح اُن کے ذہن میں آتا تھا خدا کا نام لیتے تھے اور نماز پڑھتے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال سُنا تو اپنے بھائی کو بھیجا کہ صحیح خبر لائیں، وہ مکہ میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن مجید کی سورتیں سُنیں، واپس جا کر ابوذرؓ سے کہا، میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کو لوگ مرتد کہتے ہیں وہ مکارمِ اخلاق سکھاتا ہے اور جو کلام سناتا ہے وہ شعر نہیں کوئی اور چیز ہے، تمہارا طریقہ اس سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ابوذرؓ کو تسکین نہیں ہوئی، خود مکہ میں آئے، زبانِ مبارک سے آپؐ کا ارشاد سنا اور اسلام قبول کر لیا، وہ تمام عمر دنیاوی تعلقات سے الگ رہے، ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمان کے لئے زر و مال کا جمع کرنا جائز نہیں، چنانچہ اس بنا پر حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانے میں اُن کو مدینہ سے دور بھیج دیا تھا۔

(۲) بعض صحابہؓ ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے، یعنی وہ لوگ جو زمانۂ اسلام سے پہلے بُت پرستی ترک کر چکے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کا پیرو کہتے تھے، لیکن اس اجمالی اعتقاد کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے اور اس لئے تلاشِ حق میں سرگرداں تھے، انہی میں زید بھی تھے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، انہوں نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ برس پہلے وفات پائی، لیکن ان کے صاحبزادے سعید موجود تھے، وہ باپ کے ارشادات سُن چکے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تو ان کو وہ رہنما ہاتھ آ گیا جس کی جستجو میں اُن کے باپ دنیا سے چلے

لہ حضرت ابوذرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے لیکن باہم اختلاف ہے، میں نے دونوں سے ملا کچھ لیا ہے، لیکن اختصار کے لحاظ سے بہت سی باتیں چھوڑ دیں۔

گئے اور وہ اب تک سرگشتہ تھے۔

(۳) یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصب اعظم میں سے کوئی منصب نہیں رکھتے تھے، بلکہ اکثر ایسے تھے مثلاً عمارؓ، خبابؓ، ابوفکیہؓ، صہیبؓ وغیرہ جن کو دولت وجاہ کے دربار میں جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو لے کر حرم میں جاتے تو رؤسائے قریش ہنسی کرتے۔

أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا (انعام ۱۱) یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔

کفار کے نزدیک ان کا افلاس اُن کی تحقیر کا سبب تھا لیکن یہی چیز تھی جس کی وجہ سے ایمان کی دولت سب سے پہلے ان ہی کے ہاتھ آ سکتی تھی، دولت و مال ان کے دلوں کو سیاہ نہیں کر چکا تھا، فخر و غرور ان کو انقیادِ حق سے روک نہیں سکتا تھا۔ ان کو یہ ڈر نہ تھا کہ اگر بت پرستی چھوڑ دیں گے تو کعبہ کا کوئی منصبِ عظیم ہاتھ سے جاتا رہے گا، غرض ان کے دل ہر قسم کے زنگ سے پاک تھے اور حق کی شعاعیں اُن پر دفعۃً پرتو افگن ہو سکتی تھیں، یہی سبب ہے کہ انبیاء کے ابتدائی پیرو ہمیشہ نادار اور مفلس لوگ ہوتے تھے، عیسائیت کے ارکانِ اولین ماہی گیر تھے۔ حضرت نوحؑ کے مقربینِ خاص کی نسبت کفار کو اعلانیہ کہنا پڑا۔

وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ (ہود) اور ہم تو بظاہر یہ دیکھتے ہیں کہ تیری پیروی انہی لوگوں نے کی جو رذیل ہیں اور ہم تو تم میں کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو۔

یہ سابقینِ اسلام جس قسم کا راسخ ایمان لاتے تھے اس کی تفصیل آگے آتی ہے جس سے ظاہر ہوگا کہ قریش کی سخت خونخواریاں جور و ظلم کے شدائد، دولت و مال کی انتہائی ترغیبیں، کوئی چیز ان کو متزلزل نہ کر سکی اور آخر انہی کمزور ہاتھوں نے قیصر و کسریٰ کا تخت اُلٹ دیا۔

تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت راز داری کے ساتھ فرضِ تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتابِ رسالت بلند ہو چکا تھا، صاف حکم آیا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر-۶) اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہہ دے۔

اور نیز حکم آیا۔

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (شعراء-۱۱) اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر پکارا، یا معشر القریش! لوگ جمع ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟ سب نے کہا ہاں! کیونکہ تم کو ہمیشہ سے ہم نے سچ بولتے دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذابِ شدید نازل ہوگا۔ یہ سُن کر سب لوگ جن میں ابولہب آپ کا چچا بھی شامل تھا، سخت برہم ہو کر واپس چلے گئے۔ (صحیح بخاری جلد ۲، ص ۷۰۲)

چند روز کے بعد آپ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ دعوت کا سامان کرو۔ یہ درحقیقت تبلیغ اسلام کا پہلا موقع تھا، تمام خاندانِ عبدالمطلب مدعو کیا گیا، حمزہ، ابوطالب، عباس سب شریک تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کو کفیل ہے۔ اس بارِ گراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟[1]

تمام مجلس میں سناٹا تھا، دفعۃً حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا۔ گو مجھ کو آشوبِ چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں، تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔[1]

قریش کے لئے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ دو شخص (جن میں ایک سیزدہ سالہ نوجوان ہے) دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آ گئی، لیکن آگے چل کر زمانہ نے بتا دیا کہ یہ سراپا سچ تھا۔

اب مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت تیار ہو گئی تھی، جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی۔ آپ نے حرمِ کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا۔ کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی، اس لئے دفعۃً ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور ہر طرف سے لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حضرت حارثؓ بن ابی ہالہ گھر میں تھے ان کو خبر ہوئی، دوڑے ہوئے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانا چاہا، لیکن ہر طرف سے اُن پر تلواریں برس پڑیں اور وہ شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی۔[2]

قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب

مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی۔ قریش کا خاندان جو تمام عرب پر مذہبی حکومت رکھتا تھا اور جس کی وجہ سے وہ ہمسایگانِ خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندانِ الٰہی کہلاتے تھے، اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور اور کلید بردار تھے۔ اس تعلق سے قریش کا کاروبار زیادہ پھیلا گیا یہاں تک کہ متعدد محکمے اور بڑے بڑے مناصب قائم کئے گئے جن کی تفصیل یہ ہے۔

منصب	منصب کی تفصیل	کس خاندان کو کون منصب حاصل تھا	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کون لوگ ان مناصب پر فائز تھے؟
حجابہ	کعبہ کی کلید برداری اور تولیت		عثمان بن طلحہ
رفادہ	غریب حجاج کی خبرگیری	خاندانِ نوفل	حرث بن عامر
سقایۃ	حجاج کے پانی پلانے کا انتظام	خاندانِ ہاشم	حضرت عباسؓ
مشورہ		خاندانِ اسد	یزید بن ربیعۃ الاسود
دیات و مغارم	خون بہا کا فیصلہ کرنا	خاندانِ امیہ	حضرت ابوبکرؓ
عقاب	علم برداری	خاندانِ امیہ	ابوسفیان
قبہ	خیمہ و خرگاہ کا انتظام اور سواروں کی افسری	خاندانِ مخزوم	ولید بن مغیرہ

[1] طبری نے "تاریخ" جلد ۳ صفحہ ۱۱۷۱ اور تفسیر جلد ۱۹ صفحہ ۶۸ میں عبدالغفار بن قاسم اور منہال بن عمرو کے واسطہ سے اس کو روایت کیا ہے پہلا شیعی اور متروک ہے اور دوسرا مذبذب ہے۔ اس روایت میں اور بھی وجوہ ضعف ہیں گو وجوہ وضع ہیں [illegible] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر حارث بن ابی ہالہ [2] یہ تمام تفصیل عقد الفرید جلد دوم صفحہ ۴۳ میں ہے [illegible]

منصب	کام	خاندان	نام
سفارت و منافرت	سفیر ہو کر جانا اور جن قبیلوں میں یہ نزاع پیش آئے کہ شریف تر کون ہے؟ اس کا فیصلہ کرنا۔	خاندانِ عدی	حضرت عمرؓ
ازلام والیسار	محکمہ مال کا انتظام	خاندانِ جمح	صفوان بن امیہ
اموال	مہتمم خزانہ	خاندان سہم	حرث بن قیس

آغازِ اسلام میں جو لوگ قریش کے رؤسائے اعظم تھے اور جن کی عظمت و اقتدار کا اثر تمام مکہ پر تھا، ان کے نام یہ ہیں:-

نام	حال
ابوسفیان بن حرب (حضرت معاویہؓ کے باپ)	حرب فجار میں انہی کا باپ قریش کا سپہ سالار تھا۔
ابولہب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا)	
ابوجہل۔	ولید بن مغیرہ کا بھتیجا اور اپنے قبیلہ کا سردار۔
ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ)	قریش کا رئیس اعظم تھا۔
عاص بن وائل سہمی (حضرت عمرو بن العاص کا باپ)	نہایت دولت مند، کثیر الاولاد اور صاحب اثر تھا۔
عتبہ بن ربیعہ (امیر معاویہؓ کا نانا)	نہایت شریف الطبع اور صاحب ریاست تھا

ان کے علاوہ اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث بن کلدۃ، اخنس بن شریق ثقفی، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط صاحب اثر تسلیم کئے جاتے تھے۔

اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خاندان ہاشم اور بنو امیہ برابر کے حریف تھے اور دونوں میں مدت سے رشک و رقابت چلی آتی تھی۔

پہلا سبب ناتربیت یافتہ اور تند خو قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جو اُن کے آبائی رسم و عقائد کے خلاف ہو ان کو سخت برہم کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ان کی مخالفت محض زبانی مخالفت نہیں ہوتی اور ان کی تشنگی انتقام کو خون کے سوا کوئی چیز بجھا نہیں سکتی۔ آج ہندوستان اس قدر مہذب ہو گیا ہے لیکن اب بھی کسی عام مسئلہ مذہبی کی مخالفت کی جائے تو ایک حشر برپا ہو جاتا ہے اور حکومتِ موجودہ اگر منتظم اور صاحب جبروت نہ ہوتی تو اس زمین پر بارہا خون کا بادل برس چکا تھا۔

عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا، خلیل بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی، جن میں ہبل خدائے اعظم تھا، یہی بت ہر قسم کے خیر و شر کے مالک تھے، پانی برساتے تھے، اولادیں دیتے تھے، معرکہ ہائے جنگ میں فتحیں دلاتے تھے، خدا یا تو سرے سے نہ تھا یا تھا تو وجودِ معطل تھا۔

دوسرا سبب اسلام کا اصل فرض اس طلسم کو دفعۃً برباد کر دینا تھا، لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت اقتدار اور عالمگیر اثر کا بھی خاتمہ تھا، اس لئے قریش نے شدت سے مخالفت کی اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اسی قدر مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے۔

قریش کا رئیس اعظم حرب بن امیہ تھا، چنانچہ حرب فجار میں وہی سپہ سالار اعظم تھا، لیکن حرب کے مرنے کے بعد

اس کا بیٹا ابوسفیان اس منصب عظیم کے حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا، اس لئے ولید بن المغیرہ نے اپنی لیاقت اور اثر سے ریاست حاصل کی، ابوجہل اس کا بھتیجا تھا اور وہ بھی قریش میں امتیاز رکھتا تھا۔

ابوسفیان گو اپنے باپ کا منصب نہ حاصل کر سکا لیکن بنو امیہ کے خاندان کا سردار وہی تھا، خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ کبیر السن ابولہب تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا۔ قبیلہ سہم میں سب سے زیادہ بااثر عاص بن وائل تھا جو نہایت دولت مند اور کثیر الاولاد تھا۔

قریش کی عنانِ حکومت انہی رؤسا کے ہاتھ میں تھی اور یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی، قریش کے اور اکابر مثلاً اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط انہی لوگوں کے زیرِ اثر تھے اور اس وجہ سے اعدائے اسلام میں ان کے نام ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ قریش کا یہ خیال تھا کہ نبوت کا منصبِ اعظم اگر کسی کو ملتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو ملتا۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف - ۳)

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو اترنا تھا تو ان دو شہروں (مکہ و طائف) میں سے کسی رئیس اعظم پر اترتا (یعنی ولید بن ربیعہ یا ابو مسعود ثقفی)

عرب میں ریاست کے لئے دولت اور اولاد سب سے پہلی اور ضروری شرط تھی، اولاد کی نسبت اکثر وحشی قوموں میں (ہندوستان میں بھی) یہ خیال رہا ہے کہ جو شخص صاحبِ اولاد نہ ہو وہ عالمِ آخرت کی برکات سے محروم رہتا ہے، ہندوؤں میں بھی یہ خیال ہے کہ اولاد کے بغیر انسان کو پوری نجات نہیں مل سکتی۔

قریش میں اوصاف مذکورہ کے لحاظ سے جو لوگ ریاست کا استحقاق رکھتے تھے وہ ولید بن المغیرۃ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل سہمی اور ابو مسعود ثقفی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اوصاف سے بالکل خالی تھے، دولت کے غبار سے آپ کا دامن پاک تھا اور اولاد ذکور سال دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہی۔

تیسرا سبب قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ ابرہۃ الاشرم (بادشاہِ حبش) جو کعبہ کے ڈھانے کو آیا تھا، عیسائی تھا، یہی وجہ تھی کہ قریش عیسائیوں کے مقابلوں میں پارسیوں کو زیادہ پسند کرتے تھے، ایران اور روم کی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان شکستہ ہوئے، چنانچہ یہ آیت اتری۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِىْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِىْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ (روم - ۱)

قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے لیکن یہ لوگ مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر غالب آجائیں گے۔ خدا ہی کو اختیار ہے پہلے بھی اور پیچھے بھی اور تب مسلمان اللہ کی مدد سے خوشی منائیں گے۔

اسلام اور نصرانیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں قبلہ بیت المقدس تھا، اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا، ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

چوتھا سبب ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی۔ قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یکدگر تھے

بنو ہاشم و بنو امیہ، عبدالمطلب نے اپنے زور اور اثر سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری کر دیا تھا، لیکن ان کے بعد اس خاندان میں کوئی صاحب اثر نہیں پیدا ہوا، ابو طالب دولت مند نہ تھے، عباس دولت مند تھے لیکن فیاض نہ تھے، ابولہب بدچلن تھا اس پر بنو امیہ کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خاندان بنو امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا، اس لئے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابوسفیان ہی نے برپا کیں، اور وہی ان لڑائیوں میں رئیس لشکر رہا۔

عقبہ بن ابی معیط جو سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا اور جس نے نماز پڑھنے کی حالت میں آپ کے دوش مبارک پر اوجھ لا کر ڈالی تھی اموی تھا۔ بنو امیہ کے بعد جس قبیلہ کو بنو ہاشم کی برابری کا دعویٰ تھا وہ بنو مخزوم تھے، ولید بن المغیرۃ اسی خاندان کا رئیس تھا، اس لئے اس قبیلہ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی ابو جہل کی ایک تقریر سے اس بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ایک دفعہ اخنس ابن شریق، ابو جہل کے پاس گیا اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ ابو جہل نے کہا ہم اور بنو عبد مناف (یعنی آل ہاشم)، ہمیشہ حریف مقابل رہے، انہوں نے مہمانداریاں کیں تو ہم نے بھی کیں، انہوں نے خوں بہا دیئے تو ہم نے بھی دیئے، انھوں نے فیاضیاں کیں تو ہم نے اُن سے بڑھ کر کیں، یہاں تک کہ جب ہم نے اُن کے کاندھے سے کاندھا ملا دیا، تو اب بنو ہاشم پیغمبری کے دعوے دار ہیں، خدا کی قسم! ہم اس پیغمبر پر کبھی ایمان نہیں لا سکتے۔

پانچواں سبب ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوتی تھیں، بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابولہب جو خاندان بنو ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھے، اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزال زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا[1]، اخنس بن شریق جو بنو زہرہ کا حلیف اور رؤسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر ارباب جاہ مختلف قسم کے اعمال شنیعہ میں گرفتار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف بُت پرستی کی برائیاں بیان کرتے تھے دوسری طرف ان بداخلاقیوں میں سخت دارو گیر کرتے تھے جس سے ان کی عظمت و اقتدار کی شہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی، قرآن مجید میں پیہم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں اور گو طریقہ بیان عام ہوتا تھا لیکن لوگ جانتے تھے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ (سورۂ قلم)

اور اس شخص کے کہنے میں نہ آ، جو بات بات میں قسم کھاتا ہے، بڑا بے ماخنہ ہے، طعن ہے چغلیاں لگاتا ہے لوگوں کو اچھے کاموں سے روکتا ہے حد سے بڑھ گیا ہے، بدہے، تند خو ہے، اور ان سب باتوں کیساتھ بجھوٹا نسب بناتا ہے، اس لئے کہ وہ مالدار اور لڑکوں والا ہے۔

كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ

وہ سن رکھے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر

[1] ابن ہشام صفحہ ۱۰۸، مطبوعہ مصر، یہ حرم میں ایک سونے کا ہرن مدت سے خزانہ میں محفوظ تھا، ابولہب نے چرا کر فروخت کر دیا، یہ واقعہ تمام تاریخوں میں مذکور ہے، ابن قتیبہ نے بھی معارف (صفحہ ۵۵ مطبوعہ مصر) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (سورۂ علق)

گھسیٹیں گے جو کہ جھوٹی اور خطا کار ہے۔

ممکن تھا کہ وعظ و پند کا نرم طریقہ اختیار کیا جاتا، لیکن مدت کی عربی نخوت، دولت و اقتدار کا فخر ریاست کا زعم، ان چیزوں کے ہوتے ہوئے جب تک ضرب نہایت سخت نہ ہوگی وہ خبر نہ ہوتے، اس لئے بڑے بڑے جبار اس طرح مخاطب کئے جاتے تھے۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا وَبَنِينَ شُهُودًا وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا (مدثر-۱)

ہم کو اور اس کو تنہا چھوڑ دو، میں نے اس کو پیدا کیا، پھر بہت سا مال دیا، بیٹے دیئے، سامان دیا، پھر چاہتا ہے کہ ہم اس کو اور دیں ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا دشمن ہے۔

یہ خطاب ولید بن مغیرہ کے ساتھ ہے جو قریش کا سرتاج تھا اور یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے ادا ہوتے تھے جس کو ظاہری جاہ و اقتدار حاصل نہ تھا، لیکن مخالفت کی جو سب سے بڑی وجہ تھی اور جس کا اثر تمام قریش بلکہ تمام عرب پر یکساں تھا یہ تھا کہ جو معبود سینکڑوں برس سے عرب کے حاجت روائے عام تھے اور جن کے آگے وہ ہر روز پیشانی رگڑتے تھے، اسلام ان کا نام و نشان مٹاتا تھا اور ان کے شان میں کہتا تھا۔

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (سورۂ انبیاء-۷)

بلاشبہ تم اور جن چیزوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو سب دوزخ کے ایندھن ہوں گے۔

قریش کے تحمل کے اسباب ان اسباب کے ساتھ جن میں سے ہر ایک قریش کو سخت مشتعل کر دینے کے لئے کافی تھا، توقع یہ تھی کہ اعلان دعوت کے ساتھ سخت خوں ریزیاں شروع ہو جائیں لیکن قریش نے تحمل سے کام لیا اور اس کے ناگزیر اسباب تھے، قریش خانہ جنگیوں میں تباہ ہو چکے تھے اور حرب فجار کے بعد اس قدر عاجز آ گئے تھے کہ لڑائی کے نام سے ڈرتے تھے، قبیلہ پرستی کی وجہ سے لڑائی صرف اتنی سی بات پر شروع ہو جاتی تھی کہ کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے، مقتول کا قبیلہ بغیر کسی تحقیق کے انتقام کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا اور جب تک بدلہ نہ لے لیا جائے یہ آگ نہیں بجھ سکتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر آمادہ ہونا قریش کے لئے نہایت آسان تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ بنو ہاشم خون کا انتقام نہ چھوڑیں گے اور پھر سلسلہ بسلسلہ تمام مکہ جنگ میں مبتلا ہو جائے گا۔ بہت سے لوگ اسلام لا چکے تھے اور قریباً کوئی قبیلہ ایسا باقی نہ تھا جس میں دو ایک شخص اسلام نہ لا چکے ہوں، اس لئے اسلام اگر جرم تھا تو صرف ایک شخص اس کا مجرم نہ تھا بلکہ سینکڑوں تھے اور سب کا استیصال کرنا ممکن نہ تھا، رؤسائے قریش میں متعدد ایسے تھے جو شریف النفس تھے، وہ بدنفسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیال میں نیک نیتی کی بنا پر مخالفت کرتے تھے، اس بنا پر وہ چاہتے تھے کہ معاملہ صلح و آشتی[1] سے طے ہو جائے۔

غرض جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان دعوت کیا اور بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کے چند معززوں نے ابو طالب سے آکر شکایت کی، ابو طالب نے نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا، لیکن چونکہ بنائے نزاع قائم تھی یعنی

[1] یہ آیت غالباً انہی لوگوں کی شان میں ہے وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی سے تو لوگوں کو منع کرتے تھے لیکن آپ کے دعویٰ نبوت سے دور بھاگتے تھے۔ (اصابہ ذکر ابی طالب بحوالہ عبدالرزاق۔ س)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ادائے فرض سے باز نہ آسکتے تھے اس لئے یہ سفارت دوبارہ ابوطالب کے پاس آئی۔ اس میں تمام رؤسائے قریش یعنی عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، ابوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے، ان لوگوں نے ابوطالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کہتا ہے ہم کو احمق ٹھہراتا ہے، اس لئے یا تو تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابوطالب نے دیکھا کہ اب حالت نازک ہو گئی ہے، قریش اب تحمل نہیں کر سکتے اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختصر لفظوں میں کہا "جانِ عم! میرے اوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری پشت و پناہ جو کچھ تھے ابوطالب تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اب ان کے پائے ثبات میں بھی لغزش ہے، آپ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا "خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دے دیں، تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا، خدا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا" آپ کی پُراثر آواز نے ابوطالب کو سخت متاثر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "جا! کوئی شخص تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا"۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدستور دعوتِ اسلام میں مصروف ہوئے۔ قریش اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ نہ کر سکے لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، نماز پڑھنے میں جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے، بدزبانیاں کرتے تھے، ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ قریش متحیر تھے کہ آپ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جانبازی کا مقصد جاہ و دولت اور نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا کر سکتا ہے، قریش نے بھی یہی خیال کیا۔ اس بنا پر عتبہ بن ربیعہ قریش کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا "محمد! کیا چاہتے ہو؟ کیا مکہ کی ریاست؟ کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ کیا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں اور اس پر بھی راضی ہیں کہ کل مکہ تمہارا زیرِ فرمان ہو جائے، لیکن ان باتوں سے باز آؤ"۔ عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا، لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ (حم السجدہ ۱)

اے محمدؐ! کہہ دے کہ میں تمہیں جیسا آدمی ہوں مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک خدا ہے بس سیدھے اسکی طرف جاؤ اور اسی سے معافی مانگو

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (حم السجدہ ۲)

کہہ دے کہ کیا تم لوگ خدا کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں یہ زمین پیدا کی اور تم خدا کے شریک قرار دیتے ہو وہی سارے جہان کا پروردگار ہے؟

عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، اس نے قریش سے جا کر کہہ دیا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے، میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آجائیں گے تو یہ تمہاری

[1] ابن ہشام صفحہ ۸۹۔ امام بخاری نے بھی یہ واقعہ تاریخ میں اختصار کے ساتھ نقل ہے۔

ہی عزت ہے ورنہ عرب ان کو خود فنا کر دے گا، لیکن قریش نے یہ رائے نامنظور کی۔

حضرت حمزہؓ اور عمرؓ کا اسلام ۶ نبوی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمام میں سے حضرت حمزہؓ کو آپ سے خاص محبت تھی، وہ آپ سے صرف دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کے کھیلے تھے، دونوں نے ثویبہ کا دودھ پیا تھا اور اس رشتہ سے بھائی بھائی تھے، وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن آپ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا مذاقِ طبیعت سپاہ گری اور شکار افگنی تھا، معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لے کر نکل جاتے، دن دن بھر شکار میں مصروف رہتے، شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے، طواف کرتے، قریش کے رؤسا صحنِ حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے حضرت حمزہؓ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے، کبھی کبھی کسی کے پاس بیٹھ جاتے، اس طریقے سے سب سے یارانہ تھا اور سب لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے تھے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخالفین جس بے رحمی سے پیش آتے تھے، بیگانوں سے بھی دیکھا نہ جا سکتا تھا ایک دن ابوجہل نے رُو در رُو آپ کے ساتھ نہایت گستاخیاں کیں، ایک کنیز دیکھ رہی تھی، حضرت حمزہؓ شکار سے آئے تو اس نے تمام ماجرا کہا، حضرت حمزہؓ غصہ سے بے تاب ہو گئے، تیر و کمان ہاتھ میں لئے حرم میں آئے اور ابوجہل سے کہا "میں مسلمان ہو گیا ہوں"۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوشِ حمایت میں انھوں نے اسلام کا اظہار تو کر دیا لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعۃً کیونکر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے بالآخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دینِ حق یہی ہے، دو ہی چار روز کے بعد حضرت عمرؓ بھی اسلام لائے۔

حضرت عمرؓ کا ستائیسواں سال تھا کہ آفتابِ رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہیں رہی تھی، چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ اسلام لائے، حضرت سعید کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہ بھی مسلمان ہو گئیں، اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیم بن عبداللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے اُن کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ قبیلہ میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے، ان کے دشمن بن گئے۔ لُبینہؓ ان کے خاندان کی کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس کو بے تحاشا مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ "دم لے لوں تو پھر ماروں گا"۔ لبینہؓ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زد و کوب سے دریغ نہیں کرتے تھے، لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اترتا نہ تھا، ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بردل نہ کر سکے، آخر مجبور ہو کر (نعوذ باللہ) خود ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا، تلوار کمر سے لگا سیدھے

[1] حضرت حمزہؓ کے اسلام کا واقعہ ۔۔۔ سب نے لکھا ہے لیکن یہ اخیر واقعہ میں نے صرف "رَوض الانف" میں دیکھا ہے، حضرت عمرؓ کا قبول اسلام میں الفاروق میں مفصل لکھ چکا ہوں اسی کو بعینہٖ یہاں نقل کر دیا ہے کہیں کہیں بعض الفاظ یا جملے بدل دیئے ہیں، حضرت عمرؓ کے اسلام کے واقعہ کی دوسری روایتیں سیرۃ النبی جلد سوم باب استجابت دعا میں مفصل درج کر دی ہیں، وہاں دیکھی جائیں۔ س۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے۔ کارکنانِ قضا نے کہا۔

ع آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ مل گئے، ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں، انہوں نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود تمہارے بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔ فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہ قرآن پڑھ رہی تھیں، اُن کی آہٹ پاکر چپ ہوگئیں اور قرآن کے اجزاء چھپا لیے، لیکن آواز اُن کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ بہن سے پوچھا یہ کیا آواز تھی؟ بولیں کچھ نہیں، انہوں نے کہا میں سن چکا ہوں، تم دونوں مرتد ہو گئے ہو، یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریبان ہوئے اور جب ان کی بہن بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی، یہاں تک کہ اُن کا جسم لہولہان ہو گیا، لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی۔ بولیں کہ عمر! جو بن آئے کرو، لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا: ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا، بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا، اُن کے جسم سے خون جاری تھا، دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی۔ فرمایا تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھ کو بھی سناؤ، فاطمہؓ نے قرآن کے اجزاء لا کر سامنے رکھ دیئے، اٹھا کر دیکھا تو یہ سورۃ تھی۔

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (حدید-۱)
زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے خدا کی تسبیح پڑھتا ہے اور خدا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے کہ:۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (حدید-۱)
خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

تو بے اختیار پکار اٹھے کہ:۔

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔
میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد خدا کے پیغمبر ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقمؓ کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا، پناہ گزین تھے۔ حضرت عمرؓ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف گئے تھے صحابہؓ کو تردد ہوا، لیکن حضرت حمزہؓ نے کہا آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔ حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کے فرمایا "کیوں عمر! کس ارادے سے آیا ہے؟" نبوت کی پُرجلال آواز نے ان کو کپکپا دیا، نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ ایمان لانے کے لئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہؓ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔[1]

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے نے اسلام کی تاریخ میں نیا دور پیدا کر دیا، اس وقت تک اگرچہ چالیس پچاس آدمی اسلام لا چکے تھے۔ عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہؓ سید الشہداء نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم مسلمان اپنے فرائض

[1] انساب الاشراف بلاذری و طبقات ابن سعد و اسد الغابہ و ابن عساکر و کامل ابن الاثیر۔

مذہبی علانیہ نہیں ادا کر سکتے تھے اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کے ساتھ دفعۃً یہ حالت بدل گئی، انہوں نے علانیہ اسلام ظاہر کیا، کافروں نے اول اول بڑی شدت کی لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز ادا کی، ابن ہشام نے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی ان الفاظ میں روایت کیا ہے۔

فلما اسلم عمر قاتل قریشا حتی صلی عند الکعبۃ وصلینا معہ۔
جب عمرؓ اسلام لائے تو قریش سے لڑے یہاں تک کہ کعبہ میں نماز پڑھی اور اس کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی پڑھی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اتفاق سے عاص بن وائل آنکلا اس نے پوچھا کیا ہنگامہ ہے؟ لوگوں نے کہا عمر مرتد ہو گئے۔ عاص بن وائل نے کہا تو کیا ہوا "میں نے عمر کو پناہ دی"۔

تعذیب مسلمین

رسوخ عزم، قوت ارادہ، شدت عمل انسان کے اصلی جوہر ہیں اور داد کے قابل ہیں، لیکن انہی اوصاف کا رُخ جب بدل جاتا ہے تو وہ سخت دلی، بے رحمی، درندہ طبعی اور سفاکی کا مہیب قالب اختیار کر لیتے ہیں۔ اسلام جب آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہؓ کو اُن کے قبیلے نے اپنے حصارِ حفاظت میں لے لیا تو قریش کا طیش و غضب ہر طرف سے سمٹ کر اُن غریبوں پر ٹوٹا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا، ان میں کچھ غلام اور کنیزیں تھیں، کچھ غریب الوطن تھے، جو دو ایک پشت سے مکہ میں آ رہے تھے اور کچھ کمزور قبیلوں کے آدمی تھے جو کسی قسم کی عظمت و اقتدار نہیں رکھتے تھے۔ قریش نے ان کو اس طرح ستانا شروع کیا کہ جور و ستم کی تاریخ میں اس کی مثال پیدا کرنا قریش کی یکتائی کی تحقیر ہے۔

یہ آسان تھا کہ مسلمانوں کے خس و خاشاک سے سرزمین عرب دفعۃً پاک کر دی جاتی لیکن قریش کا نشۂ انتقام اس سے اُتر نہیں سکتا تھا۔ مسلمان اگر اپنے مذہب پر قائم رہ کر پیوندِ خاک کر دیئے جاتے تو اس میں جس قدر قریش کی تعریف نکلتی اس سے زیادہ اُن بیکسوں کا صبر و استقلال داد طلب ہوتا۔ قریش کی شان اس وقت قائم رہ سکتی تھی جب یہ لوگ جادۂ اسلام سے پھر کر قریش کے مذہب میں آ جاتے یا شاید ان کو مسلمانوں کی سخت جانی کا امتحان لینا اور اس کی داد دینا منظور تھا۔

قریش میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا دل واقعی اس حالت پر جلتا تھا کہ ان کا مدتوں کا بنا بنایا کارخانہ درہم برہم ہوا جاتا ہے، اُن کے آباؤ اجداد کی تحقیر کی جاتی ہے، قابلِ احترام معبودوں کی عظمت مٹی جاتی ہے، یہ لوگ صرف حسرت و افسوس کر کے رہ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ چند خام طبعوں کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔ عتبہ، عاص بن وائل وغیرہ اسی قسم کے لوگ تھے، لیکن ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ کا معیار اس سے زیادہ بلند تھا۔

مسلمانوں پر ظلم کے طریقے

بہرحال قریش نے جور و ظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کئے جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی، تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ، ریتلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا توا بنا دیتی ہے، وہ ان غریبوں کو اسی توے پر لٹاتے، چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کر کے اس سے داغتے

پانی میں ڈبکیاں دیتے۔ یہ مصیبتیں اگرچہ تمام بے کس مسلمانوں پر عام تھیں، لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے، اُن کے نام یہ ہیں۔

حضرت خبابؓ بن الارت تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیئے گئے تھے، ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اس زمانہ میں اسلام لائے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقمؓ کے گھر میں موجود تھے اور صرف چھ سات شخص اسلام لا چکے تھے، قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، جب چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں۔ یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے۔ خبابؓ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سپید تھی۔[1] حضرت خبابؓ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمہ اُن کا بقایا تھا، مانگتے تو جواب ملتا جب تک محمدؐ کا انکار نہ کرو گے، ایک کوڑی نہ ملے گی، یہ کہتے کہ نہیں جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں۔[2]

حضرت بلالؓ، یہ وہی حضرت بلالؓ ہیں جو موذن کے لقب سے مشہور ہیں، حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو امیہ ان کو جلتی بالو پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں، اُن سے کہتا کہ اسلام سے باز آؤ ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا لیکن اس وقت بھی اُن کی زبان سے اَحَدٌ کا لفظ نکلتا جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالہ کیا، وہ ان کو شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک گھسیٹتے پھرتے تھے لیکن اب بھی وہی رٹ تھی اَحَدٌ اَحَدٌ۔

حضرت عمارؓ یمن کے رہنے والے تھے ان کے والد یاسرؓ مکہ میں آئے، ابو حذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے جن کا نام سمیہؓ تھا شادی کر دی تھی، عمارؓ اسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین شخص اسلام لا چکے تھے، قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ بے ہوش ہو جاتے۔ ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا۔

حضرت سمیہؓ حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں اُن کو ابوجہل نے اسلام لانے کے جرم میں برچھی ماری اور وہ ہلاک ہو گئیں۔

حضرت یاسرؓ حضرت عمارؓ کے والد تھے، یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہو گئے۔

حضرت صہیبؓ یہ رومی مشہور ہیں لیکن درحقیقت رومی نہ تھے، اُن کے والد سنان کسریٰ کی طرف سے اُبلہ کے حاکم تھے اور ان کا خاندان موصل میں آباد تھا، ایک دفعہ رومیوں نے اس نواح پر حملہ کیا اور جن لوگوں کو قید کر کے لے گئے ان میں حضرت صہیبؓ بھی تھے، یہ روم میں پلے اس لئے عربی زبان اچھی طرح بول نہ سکتے تھے، ایک عرب نے اُن کو خریدا اور مکہ میں لایا، یہاں عبداللہ بن جدعان نے اُن کو خرید کر کے آزاد کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت اسلام شروع کی تو یہ اور عمارؓ بن یاسر ایک ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یہ واقعات ابن سعد نے حضرت بلالؓ صہیبؓ کے حال میں بہ تفصیل لکھے ہیں، دیکھو کتاب مذکور، جلد ثالث تذکرۂ صحابہ جو [illegible] نے طبقات ابن سعد جلد سوم، تذکرۂ خبابؓ [2] صحیح بخاری صفحہ ۹۶ جلد ۲ س ۔

کے پاس آئے۔ آپؐ نے اسلام کی ترغیب دی اور یہ مسلمان ہو گئے، قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے تھے، جب انھوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی چاہی تو قریش نے کہا اپنا سارا مال و متاع چھوڑ جاؤ تو جا سکتے ہو، انھوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔

حضرت ابو فکیہہؓ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اور حضرت بلالؓ کے ساتھ اسلام لائے۔ امیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو اُن کے پاؤں میں رسی باندھی اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لے جائیں اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں، ایک گبریلا راہ میں جا رہا تھا، امیہ نے ان سے کہا "تیرا خدا یہی تو نہیں ہے" انھوں نے کہا "میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے" اس پر امیہ نے اس زور سے اُن کا گلا گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا، ایک دفعہ ان کے سینہ پر اتنا بھاری بوجھل پتھر رکھ دیا کہ اُن کی زبان نکل پڑی۔

حضرت لُبینہؓ، یہ بے چاری ایک کنیز تھیں، حضرت عمرؓ اس بے کس کو مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے کہ میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں، وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو خدا اس کا انتقام لے گا۔

حضرت زنیرہؓ حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں اور اس وجہ سے حضرت عمرؓ (اسلام سے پہلے) اُن کو جی کھول کر ستاتے۔ ابوجہل نے اُن کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

حضرت نہدیہؓ اور ام عبیسؓ، یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں اور اسلام لانے کے جرم میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتی تھیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے دفتر فضائل کا یہ پہلا باب ہے کہ انھوں نے ان مظلوموں میں سے اکثروں کی جان بچائی، حضرت بلالؓ، عامرؓ بن فہیرہ، لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ سب کو بھاری بھاری داموں خریدا اور آزاد کر دیا، یہ لوگ وہ تھے جن کو قریش نے نہایت جسمانی اذیتیں پہنچائیں، ان سے کم درجہ پر وہ تھے جن کو طرح طرح سے ستاتے تھے۔

(حضرت عثمانؓ جو کبیر السن اور صاحب جاہ و اعزاز تھے، جب اسلام لائے تو دوسروں نے نہیں بلکہ خود اُن کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا، حضرت ابوذرؓ جو ساتویں مسلمان ہیں جب مسلمان ہوئے اور کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا۔[1] حضرت زبیرؓ بن العوام جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا جب اسلام لائے تو اُن کے چچا اُن کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کے ناک میں دھواں دیتے تھے، حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی سعیدؓ بن زید جب اسلام لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا۔[2]

لیکن یہ تمام مظالم، یہ جلادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں، ایک مسلمان کو بھی راہِ حق سے متزلزل نہ کر سکیں۔ ایک نصرانی مورخ نے نہایت سچ لکھا ہے:۔

---

[1] ابن الاثیر ذکر تعذیب المستضعفین ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ عمارؓ اس وقت ایمان لائے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارقمؓ کے مکان میں چلے آئے تھے اور جب کہ تیس شخص سے زیادہ اسلام لا چکے تھے [2] حضرت عمرؓ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے [3] طبقات ترجمہ عثمانؓ بن عفان [4] بخاری جلد اص ۵۴۳، باب اسلام ابی ذرؓ [5] ریاض النضرۃ للمحب الطبری [6] بخاری ص ۱۰۲۳، اس وقت حضرت عمرؓ اسلام نہیں لائے تھے، ج س۔

عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خصائل نے وہ درجہ نشہ دینی کا آپ کے پیروؤں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے، جب عیسیٰ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے، اُن کا نشہ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے، برعکس اس کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آتے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا"[1]

ہجرت حبش ۵ نبوی

قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا تو رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاں نثاران اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کی ہجرت کر جائیں، حبش قریش کا قدیم تجارت گاہ تھا وہاں کے حالات پہلے سے معلوم تھے، اہل عرب حبش کے فرماں روا کو نجاشی[2] کہتے تھے اور اسکے عدل و انصاف کی عام شہرت تھی، جاں نثاران اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانہ صبر لبریز نہیں ہو سکتا تھا، لیکن مکہ میں رہ کر فرائض اسلام کا آزادی سے بجالانا ممکن نہ تھا، اس وقت حرم کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا حضرت عبد اللہؓ بن مسعود جب اسلام لائے تو انہوں نے کہا میں اس فرض کو ضرور ادا کروں گا، لوگوں نے منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے حرم میں گئے اور مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر سورۃ الرحمٰن پڑھنا شروع کی، کفار ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور ان کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کئے، اگرچہ انھوں نے جہاں تک پڑھنا تھا پڑھ کر دم لیا لیکن واپس گئے تو چہرہ پر زخم کے نشان لے کر گئے[3] حضرت ابو بکرؓ جاہ و اقتدار میں دیگر رؤسائے قریش سے کم نہ تھے لیکن آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے اور اسی بنا پر ایک بار ہجرت کے لئے آمادہ ہو گئے۔

اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی تھیں، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما سے اول اول گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ حضرت عثمانؓ بن عفان۔	مع اپنی زوجہ محترمہ (حضرت) رقیہؓ کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں۔
۲۔ (حضرت) ابو حذیفہؓ بن عتبہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام (حضرت) سہلہؓ (بنت سہیل) تھا۔	ان کا باپ عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا، لیکن چونکہ سخت کافر تھا اس لئے ان کو گھر چھوڑنا پڑا
۳۔ (حضرت) زبیرؓ بن العوام۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی اور مشہور صحابی تھے۔
۴۔ (حضرت) مصعبؓ بن عمیر۔	ہاشم کے پوتے تھے۔
۵۔ (حضرت) عبد الرحمٰنؓ بن عوف۔	مشہور صحابی اور عشرہ مبشرہ میں شمار کئے جاتے ہیں، قبیلۂ زہرہ سے تھے اور اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھالی رشتہ تھے۔

[1] اپالوجی گاڈفری میگنس (ترجمہ اردو صفحہ ۹۶) مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء [2] نجاشی حبشی لفظ نجوس کی تعریب ہے جسکے معنی حبشی میں بادشاہ کے ہیں نجاشی کا نام اصحمہ تھا، بخاری باب موت النجاشی [3] ابن ہشام طبری صفحہ ۱۱۸۸، جلد ۳، بخاری باب ہجرت مدینہ۔

۶۔ (حضرت) ابو سلمہؓ (ابن عبد الاسد مخزومی) مع اپنی زوجہ حضرت ام سلمہؓ (بنت ابی امیہ) کے۔	یہ ام سلمہؓ وہی ہیں جو ابو سلمہ کے مرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں
۷۔ (حضرت) عثمانؓ بن مظعون جمحی۔	مشہور صحابی ہیں۔
۸۔ (حضرت) عامرؓ بن ربیعہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام (حضرت) لیلیٰؓ (بنت ابی حثمہ) تھا	سابقین اولین میں ہیں، بدر میں شریک تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سفر حج میں ان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا (اصابہ)
۹۔ (حضرت) ابو سبرہؓ بن ابی رہم۔ یا[1]	ان کی ماں برہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں، یہ سابقین فی الاسلام میں ہیں، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ یہ ہجرت ثانیہ میں گئے۔
۱۰۔ (حضرت) ابو حاطبؓ بن عمرو۔	بدر میں شریک تھے، امام زہری کا بیان ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہجرت کی ہے (اصابہ)
(حضرت) سہیل بن بیضا۔	
۱۱۔ (حضرت) عبد اللہ بن مسعود۔	مشہور صحابی اور مجتہدین صحابہ میں داخل ہیں۔

ان لوگوں نے ۵ نبوی ماہ رجب میں سفر کیا، حسن اتفاق یہ کہ جب یہ لوگ بندرگاہ پر پہنچے تو دو تجارتی جہاز حبش کو جا رہے تھے، جہاز والوں نے سستے کرایہ پر ان کو بٹھا لیا، ہر شخص کو صرف پانچ درہم دینے پڑے، قریش کو خبر ہوئی تو بندرگاہ تک تعاقب میں آئے لیکن موقع نکل چکا تھا۔

عام مورخین کا خیال ہے کہ ہجرت انہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا، لیکن فہرست مہاجرین میں ہر درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، حضرت عثمانؓ بنو امیہ سے تھے جو سب سے زیادہ صاحب اقتدار خاندان تھا متعدد بزرگ مثلاً زبیرؓ اور مصعبؓ، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہیں، عبد الرحمٰنؓ بن عوف اور

[1] حبشہ کے مہاجرین اول کی تعداد اور ان کے تعین میں کسی قدر اختلاف ہے:۔

ابن اسحاق نے مردوں میں ان ہی دس آدمیوں کا نام لیا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود کے متعلق وہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ہجرت اولیٰ میں نہیں، بلکہ ہجرت ثانیہ میں تھے (فتح الباری ج ۷، ص ۱۴۳) واقدی نے مردوں میں گیارہ صاحبوں کی ہجرت کا ذکر کیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے حضرت ابو سبرہؓ اور حضرت ابو حاطبؓ دونوں کو مہاجرین میں شمار کیا ہے اور ابن اسحاق ان میں سے ایک کو تسلیم کرتے ہیں، اس سلسلے میں واقدی سے ایک بڑی فروگزاشت یہ ہوئی کہ انھوں نے گیارہ مردوں کو مہاجرین حبش بتلایا لیکن جب مہاجرین کی فہرست گنائی تو اس میں بارہ آدمیوں کا نام لیا، یعنی حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کا بھی اضافہ کیا (زرقانی علی المواہب ج اول ص ۳۱۴) حافظ ابن حجر نے واقدی کی اس فروگزاشت پر گرفت کی ہے (فتح الباری ج ۷، ص ۱۴۳) ابن سعد نے انہی تمام مہاجرین کا نام لیا ہے جن کا ذکر واقدی نے کیا ہے (ابن سعد ج اول ص ۱۳۶) ابن سید الناس نے بھی بروایت زہری بارہ آدمیوں کا ذکر کیا ہے مگر انھوں نے حضرت زبیرؓ کے بجائے حضرت سلیطؓ بن عمرو کا نام لیا ہے (عیون الاثر اول ص ۱۱۵) بعض دوسرے سیرت نگار جو بارہ مرد مہاجرین کو تسلیم کرتے ہیں وہ حضرت حاطب بن عمرو اور حضرت سہیل بن بیضا کے بجائے حضرت حاطبؓ بن حارث اور حضرت ہاشمؓ بن عمرو کا نام لیتے ہیں (زرقانی اول ص ۳۱۴) اسی طرح ہجرت کرنے والی خواتین میں بعض لوگ حضرت ام کلثوم بنت سہیل، زوجہ حضرت ابو سبرہؓ کی بیوی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ حضرت ام ایمنؓ کا اضافہ کرتے ہیں۔ (س) مگر یہ تمام تفصیل طبری میں ہے۔

ابو سبرہؓ معمولی لوگ نہ تھے، اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم بے کسوں پر محدود نہ تھا بلکہ بڑے بڑے خاندان والے بھی اُن کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ تھے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ مظلوم تھے اور جن کو انگاروں کے بستر پر سونا پڑا تھا یعنی حضرت بلالؓ، عمارؓ، یاسرؓ وغیرہ، ان لوگوں کا نام مہاجرینِ حبش کی فہرست میں نظر نہیں آتا، اس لئے یا تو ان کی بے سروسامانی اس حد تک پہنچی تھی کہ سفر کرنا بھی ناممکن تھا یا یہ کہ درد کے لذت آشنا تھے اور اس لطف کو چھوڑ نہ سکتے تھے۔

دلم زجورِ تو آسودہ است ومی نالم — کہ غیر پے نہ برد لذت خدنگ ترا

نجاشی کے بدولت مسلمان حبش میں امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے، لیکن قریش یہ خبریں سُن سُن کر پیچ و تاب کھاتے تھے، آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو، عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) اس کام کے لئے منتخب ہوئے۔ نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے لئے گراں بہا تحفے مہیا کئے گئے[1] اور نہایت سرو سامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی۔ یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے، ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے مُلک میں بھاگ آئے، کل ہم بادشاہ کے دربار میں اُن کے متعلق جو درخواست پیش کریں، آپ بھی ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہم کو حوالہ کر دیئے جائیں، درباریوں نے بھی تائید کی، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور کہا تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرست دونوں کے مخالف ہے۔

مسلمانوں نے اپنی طرف سے گفتگو کرنے کے لئے حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کو انتخاب کیا، انہوں نے اس طرح تقریر شروع کی۔

"اَیُّهَا الْمَلِكُ: ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بُت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اس اثناء میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا، جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خوں ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے، اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی میں پھر واپس آ جائیں۔"

نجاشی نے کہا جو کلام الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے کہیں سے پڑھو، حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی چند آیتیں

[1] مسند احمد ج ۱ ص ۲۰۲۔ [2] ابن ہشام نے لکھا ہے کہ مکہ کا بڑا تحفہ چمڑا تھا اور کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل مکہ شام وغیرہ کو جو مال تجارت لے جاتے تھے وہ بھی چمڑا ہوتا تھا (مسند امام ابن حنبل میں تصریح ہے کہ یہ تحفہ چمڑا ہی تھا، مسند اہل البیت)

پڑھیں، نجاشی پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، پھر کہا، خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں، یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا، تم واپس جاؤ، میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا۔

دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا، حضور! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں؟ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں، ان لوگوں کو تردد ہوا کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے ناراض ہو جائے گا، حضرت جعفرؓ نے کہا کچھ ہو، ہم کو سچ بولنا چاہیے۔

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے، نجاشی نے کہا تم لوگ عیسیٰ بن مریم کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے کہا، ہمارے پیغمبرؐ نے بتایا ہے کہ عیسیٰ خدا کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے۔" نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھا لیا اور کہا "واللہ جو تم نے کہا عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔" بطریق جو دربار میں موجود تھے نہایت برہم ہوئے، نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی، نجاشی نے اُن کے غصہ کی کچھ پرواہ نہ کی اور قریش کے سفیر بالکل ناکامیاب آئے۔[1]

اس اثنا میں کسی دشمن نے نجاشی کے [illegible] پر حملہ کیا، نجاشی اس کے مقابلہ کے لئے خود گیا، صحابہؓ نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے ایک شخص جائے اور خبر بھیجتا رہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لئے آئیں، حضرت زبیرؓ اگرچہ سب سے زیادہ کم سن تھے، لیکن انہوں نے اس خدمت کے لئے اپنے کو پیش کیا، مشک کے سہارے نیل تیر کر رزمگاہ میں پہنچے۔ ادھر صحابہؓ نجاشی کی فتح کے لئے خدا سے دُعا مانگتے تھے، چند روز کے بعد حضرت زبیرؓ واپس آئے اور خوشخبری سنائی کہ نجاشی کو خدا نے فتح دی۔[2]

[1] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۱۰ کتاب التفسیر۔ [2] مارگولیس صاحب نے ہجرت حبش کی بھی بڑی نازک اور دُور از نظر وجہ تلاش کر کے پیدا کی ہے فرماتے ہیں کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا کہ قریش سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور یہ پہلے سنا تھا کہ کعبہ کے گرانے کے لئے ابرہۃ الاشرم جو آیا تھا وہ حبش ہی کا تھا اس لئے انہوں نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کر کے اس کو مکہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تاکہ قریش کا زور ٹوٹ جائے، اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کر کے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہو جائے گا محمد کو کیا ہاتھ آئے گا، اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے۔" یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔

صاحب موصوف کو حضرت جعفرؓ کی تقریر و مکالمت میں اس بنا پر شک ہے کہ نجاشی عربی زبان سے ناواقف تھا، حالانکہ اس زمانہ میں (اولاً تو) عربی زبان عام طور سے حبش میں بے تکلف لوگ سمجھ سکتے تھے اگر یہ دونوں زبانیں باہم نہایت قریب ہیں ثانیاً، درباروں میں ترجمان ہوتے تھے جیسا کہ ابو سفیان اور قیصر روم کے باہمی مکالمہ میں مذکور ہے، بخاری باب بدء الوحی تن۔

[3] یہ تمام واقعات مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۰۲ میں مذکور ہیں، ابن ہشام نے بھی تفصیل سے لکھے ہیں، لیکن طبری اور ابن سعد نے حضرت جعفرؓ اور نجاشی کی تقریر کا ذکر نہیں کیا ہے، امام ابن حنبل اور ابن ہشام کا سلسلہ روایت یہ ہے: محمد بن اسحاق، زہری، ابوبکر بن عبدالرحمن بن الحرث بن ہشام مخزومی، ام سلمہؓ یہ سب رواۃ ثقہ ہیں اور سب سے اخیر راوی حضرت ام سلمہؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ اور خود اس واقعہ میں شریک تھیں وہ اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں نہیں آئی تھیں، بلکہ اپنے پہلے شوہر

حبش میں کم و بیش ۸۳ مسلمان ہجرت کر کے گئے، چند روز آرام سے گزرنے پائے تھے کہ یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر اکثر صحابہؓ نے مکہ معظمہ کا رخ کیا، لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے اس لئے بعض لوگ واپس چلے گئے اور اکثر چھپ چھپ کر مکہ میں آ گئے۔

یہ روایت طبری اور اکثر تاریخوں میں مذکور ہے اور ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن ان کتابوں میں اس خبر کے مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی، کفار بھی موجود تھے، جب آپؐ نے یہ آیت پڑھی،
وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى. تو شیطان نے آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے۔

تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی۔

(یعنی یہ بت) معظم و محترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپؐ کی متابعت کی (اس روایت کا یہ آخری حصہ کہ چند کافروں کے سوا تمام جن و انس نے حضورؐ کے ساتھ ایک دفعہ سجدہ کیا، صحیح ہے، جیسا کہ صحیح بخاری باب میں (قول فاسجدوا للہ واعبدوا) مذکور ہے، مگر باقی حصہ بے ہودہ اور ناقابل ذکر ہے اور اکثر کبار محدثین مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نوویؒ نے اس کو باطل اور موضوع لکھا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بسند نقل کیا ہے۔ ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن اسحاق موسیٰ بن عقبہ، ابومعشر شہرت عام رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمالِ فنِ حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے اس روایت کی صحت پر اصرار ہے، چنانچہ لکھتے ہیں۔

وقد ذکرنا ان ثلاثة اسانید منہا علیٰ شرط الصحیح وھی مراسیل یحتج بمثلہا من یحتج بالمراسیل۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس روایت کی تین سندیں صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور یہ روایتیں مرسل ہیں اور ان سے وہ لوگ استدلال کر سکتے ہیں جو مرسل روایتوں کے قائل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کفار کی عادت تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تلاوت کرتے تو شور مچاتے اور اپنی طرف سے فقرے ملا دیتے، قرآن مجید کی آیت ذیل میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۔ (حم السجدہ)

اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں گڑبڑ کر دو شاید تم غالب آؤ۔

قریش کا معمول تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تو یہ فقرے کہتے جاتے تھے[2]

واللات والعزیٰ ومناة الثالثة الاخریٰ فانھن الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی۔

لات اور عزیٰ اور تیسرے بت منات کی قسم یہ بلند و بزرگ ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ابوسلمہؓ بن الاسد کے ساتھ حبش میں ہجرت کر کے گئی تھیں، مورخ یعقوبی نے بھی بتفصیل یہ واقعہ لکھا ہے۔ [1] کتاب التفسیر سورۂ نجم ص، [2] دیکھو زرقانی بر مواہب لدنیہ و شفائے قاضی عیاض و عینی شرح بخاری تفسیر سورۂ نجم و نور النبراس علامہ نووی کے یہ الفاظ ہیں لا یصح فیہ شئی لا من جھة النقل ولا من جھة العقل اور علامہ عینی لکھتے ہیں فلا صحة لہ نقلاً ولا عقلاً دیکھو مواہب لدنیہ اور زرقانی واقعہ ہجرت حبشہ [3] زرقانی بر مواہب ج اول صفحہ ۳۰۰ [4] معجم البلدان لفظ عزیٰ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورۂ والنجم کی وہ آیتیں پڑھیں تو کسی شیطان (کافر) نے یہی فقرے آپؐ کی آواز میں ملا کر پڑھ دیئے ہوں گے، دور کے لوگوں کو (کفار میں سے) شبہ ہوا ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے وہ الفاظ ادا کئے، اس واقعہ کا چرچا جب مسلمانوں میں ہوا ہوگا تو لوگوں نے کہا ہوگا کہ کسی شیطان نے آپؐ کی طرف سے وہ فقرے کہہ دیئے ہوں گے، اس واقعہ نے روایتوں میں صورت بدل بدل کر یہ صورت اختیار کر لی کہ شیطان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے اور چونکہ عام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان دوسرے شخص کی زبان سے بول سکتا ہے، اس لئے راویوں نے اس روایت کو تسلیم کر لیا، یہ صرف قیاس نہیں بلکہ اگلے محققین نے بھی تصریح کی ہے۔ مواہب میں ہے۔

قیل انہ لما وصل الیٰ قولہ ومناة الثالثة الاخریٰ خشی المشرکون ان یاتی بعدھا بشیء یذم الھتھم فبادروا الیٰ ذلک الکلام فخلطوا فی تلاوة النبی صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ عادتھم فی قولھم لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ او المراد بالشیطان شیطان الانس۔

بعض لوگوں نے کہا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت پہنچے ومناة الثالثة الاخریٰ تو مشرکوں کو یہ ڈر پیدا ہوا کہ اب ان کے معبودوں کی کچھ برائی کا بیان ہوگا اس بنا پر انہوں نے جھٹ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت میں یہ فقرے غلط کر کے پڑھ دیئے جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ کہتے کہ قرآن پر کان نہ لگاؤ اور اس میں گڑبڑ مچا دو یا شیطان سے شیطان آدمی مراد ہے۔

جو لوگ حبش سے واپس آ گئے تھے، اہل مکہ نے اب ان کو اور زیادہ ستانا شروع کیا اور اس قدر اذیت دی کہ وہ دوبارہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، لیکن اب کی ہجرت کچھ آسان نہ تھی، کفار نے سخت مزاحمت کی تاہم جس طرح ہو سکا بہت سے صحابہ جن کی تعداد تقریباً سو تک پہنچتی ہے مکہ سے نکل گئے اور حبش میں اقامت اختیار کی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تو کچھ لوگ فوراً واپس چلے آئے اور جو لوگ رہ گئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ھ میں اُن کو بلا لیا۔[1]

کفار کی ایذا و تعدی اب کمزوروں اور بے کسوں پر محدود نہ تھی حضرت ابوبکرؓ کا قبیلہ معزز اور طاقتور تھا اُن کے یاور اور انصار بھی کم نہ تھے، تاہم وہ بھی کفار کے ظلم سے تنگ آ گئے اور بالآخر حبش کی ہجرت کا ارادہ کیا، برک الغماد جو مکہ معظمہ سے یمن کی سمت پانچ دن کی راہ ہے، وہاں تک پہنچے تھے کہ ابن الدغنہ سے ملاقات ہو گئی جو قبیلہ قارہ کا رئیس تھا، اس نے پوچھا کہاں؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا "میری قوم مجھ کو رہنے نہیں دیتی، چاہتا ہوں کہ کہیں الگ جا کر خدا کی عبادت کروں"، ابن الدغنہ نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا کہ تم جیسا شخص مکہ سے نکل جائے میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں۔ تو حضرت ابوبکرؓ اس کے ساتھ واپس آئے، ابن الدغنہ مکہ پہنچ کر تمام سرداران قریش سے ملا اور کہا کہ "تم ایسے شخص کو نکالتے ہو جو مہمان نواز ہے، مفلسوں کا مددگار ہے، رشتہ داروں کو پالتا ہے، مصیبتوں میں کام آتا ہے"۔ قریش نے کہا لیکن شرط یہ ہے کہ ابوبکر نمازوں میں چپکے جو چاہیں پڑھیں، آواز سے قرآن پڑھتے ہیں تو

[1] یہ تمام تفصیل طبقات ابن سعد میں ہے، بعض مورخوں نے اس ہجرت ثانیہ کا ذکر نہیں کیا اور بعض نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے [2] زرقانی بر مواہب جلد اول ص ۳۰۰ ذکر ہجرت ثانیہ حبش۔

ہماری عورتوں اور بچوں پر اثر پڑتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے چند روز یہ پابندی اختیار کی لیکن آخر انھوں نے گھر کے پاس ایک مسجد بنالی اور اس میں خضوع و خشوع کے ساتھ بآواز قرآن پڑھتے تھے، وہ نہایت رقیق القلب تھے قرآن پڑھتے تو بے اختیار روتے، عورتیں اور بچے ان کو دیکھتے اور متاثر ہوتے، قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی، اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ اب میں تمہاری حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا، حضرت ابوبکرؓ نے کہا، مجھ کو خدا کی حفاظت بس ہے، میں تمہارے جوار سے استعفیٰ دیتا ہوں[1]۔

محرم ۷ نبوی، شعب ابوطالب میں محصور ہونا

قریش دیکھتے تھے کہ اس روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے، عمرؓ اور حمزہؓ جیسے لوگ ایمان لاچکے، نجاشی نے مسلمانوں کو پناہ دی، سفرا بے نیل مرام واپس آئے، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس لئے اب یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے، چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ کوئی شخص نہ خاندان بنی ہاشم سے قربت کرے گا نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا نہ ان سے ملے گا نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا، جب تک وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لئے حوالہ نہ کر دیں[2]۔ یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا اور در کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔

ابوطالب مجبور ہو کر تمام خاندان ہاشم کے ساتھ شعب ابوطالب میں پناہ گزین ہوئے، تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی، یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، حدیثوں میں جو صحابہؓ کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کی پتیاں کھا کھا کر بسر کرتے تھے یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے، چنانچہ سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے، حضرت سعد وقاصؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آگیا، میں نے اس کو پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی، قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے، لیکن بعض رحم دلوں کو ترس بھی آتا تھا، ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھا، تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے، راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا، اتفاق سے ابوالبختری کہیں سے آگیا، وہ اگرچہ کافر تھا لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کیلئے بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے۔

مسلسل تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام آل ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں، بالآخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود انھی کی طرف سے اس معاہدہ کے توڑنے کی تحریک ہوئی، ہشام عامری خاندان بنو ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا، وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا، ایک دفعہ وہ زہیر کے پاس جو عبدالمطلب کے نواسے تھے گیا اور کہا کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو، ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ

---

[1] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب ہجرت مدینہ میں ہے [2] اس معاہدہ کا ذکر طبری نے اور ابن سعد وغیرہ نے تفصیل سے کیا ہے لیکن یہ الفاظ کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لئے حوالہ کر دیں صرف مواہب لدنیہ میں مذکور ہیں [illegible] روض الانف

تک نصیب نہ ہو؟ زہیر نے کہا، کیا کروں تنہا ہوں، ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں۔ ہشام نے کہا میں موجود ہوں۔ دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے اور ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا، دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے۔ زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا، اے اہل مکہ! یہ کیا انصاف ہے، ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو، خدا کی قسم! جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا۔ ابوجہل برابر سے بولا۔ ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے، غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی۔ مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابوالبختری، زہیر سب ہتھیار باندھ باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درہ سے نکال لائے[1]۔ بقول ابن سعد یہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے۔ اسی زمانہ میں معراج واقع ہوئی جس کی تفصیل تیسرے حصہ میں آئے گی اسی زمانے میں نماز پنجگانہ فرض ہوئی۔

۱۰ نبوی، حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اب شعب ابی طالب سے نکلے تھے اور چند روز قریش کے جور و ظلم سے امان ملی تھی کہ ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوگیا۔

ابوطالب کی وفات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے، ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ پہلے سے موجود تھے، آپ نے فرمایا مرتے مرتے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔ ابوجہل اور ابن ابی امیہ نے کہا۔ ابوطالب! کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے۔ بالآخر ابوطالب نے کہا میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے کہا۔ میں وہ کلمہ کہہ دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا۔ آپ نے فرمایا "میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کروں گا جب تک کہ خدا مجھ کو اس سے منع نہ کر دے[2]"۔

یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ مرتے وقت ابوطالب کے ہونٹ ہل رہے تھے حضرت عباسؓ نے (جو اس وقت تک کافر تھے) کان لگا کر سنا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم نے جس کلمہ کے لئے کہا تھا، ابوطالب وہی کہہ رہے ہیں[3]، اس بنا پر ابوطالب کے اسلام کے متعلق اختلاف ہے لیکن چونکہ بخاری کی روایت عموماً صحیح مانی جاتی ہے، اس لئے محدثین زیادہ تر ان کے کفر ہی کے قائل ہیں، لیکن محدثانہ حیثیت سے بخاری کی یہ روایت چنداں قابل حجت نہیں کہ اخیر راوی مسیب ہیں جو فتح مکہ میں اسلام لائے اور ابوطالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے اسی بنا پر علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ روایت مرسل ہے[4]۔ ابن اسحاق کے سلسلہ روایت میں عباس بن عبداللہ بن معبد اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں، یہ دونوں ثقہ ہیں، لیکن بیچ کا ایک راوی یہاں بھی رہ گیا ہے

---

[1] یہ تفصیل ابن ہشام، طبری وغیرہ میں مذکور ہے اخیر واقعہ صرف ابن سعد نے بیان کیا ہے [2] صحیح بخاری باب الجنائز اور مسلم، ابوطالب کا اخیر فقرہ مسلم میں ہے بخاری میں نہیں [3] ابن ہشام مطبوعہ مصر صفحہ ۱۴۶ [4] عینی کتاب الجنائز ج ۴ صفحہ ۲۰۲۔

اس بنا پر دونوں روایتوں کے درجۂ استناد میں چنداں فرق نہیں۔

ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو جاں نثاریاں کیں اس سے کون انکار کر سکتا ہے وہ اپنے جگر گوشوں تک کو آپ پر نثار کرتے تھے، آپ کی محبت میں تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا، آپ کی خاطر محصور ہوئے، فاقے اٹھائے، شہر سے نکالے گئے، تین تین برس تک آب و دانہ بند رہا، کیا یہ محبت، یہ جوش، یہ جاں نثاریاں سب ضائع جائیں گی؟۔

ابوطالب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ۳۵ برس عمر میں بڑے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے نہایت محبت تھی، ایک دفعہ وہ بیمار پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لئے گئے تو انھوں نے کہا بھتیجے! جس خدا نے تجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اس سے دعا نہیں مانگتا، کہ مجھ کو اچھا کر دے۔ آپ نے دعا کی اور وہ اچھے ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "خدا تیرا کہنا مانتا ہے"۔ آپ نے فرمایا کہ "آپ بھی اگر خدا کا کہنا مانیں تو وہ بھی آپ کا کہنا مانے"۔

ابوطالب کی وفات کے چند ہی روز بعد حضرت خدیجہؓ نے بھی وفات پائی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انھوں نے ابوطالب سے پہلے انتقال کیا۔ اب آپ کے مددگار اور غمگسار دونوں اٹھ گئے۔ صحابہؓ خود اپنی حالت میں مبتلا تھے۔ یہی زمانہ ہے جو اسلام کا سخت ترین زمانہ ہے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سال کو عام الحزن (سال غم) فرمایا کرتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے رمضان سنہ ۱۰ نبوی میں وفات کی، ان کی عمر ۶۵ برس کی تھی، مقام حجون میں دفن کی گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی قبر میں اترے اس وقت تک نماز جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی۔

ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کے اٹھ جانے کے بعد قریش کو کس کا پاس تھا۔ اب وہ نہایت بے رحمی اور بے باکی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستاتے تھے۔ ایک دفعہ آپ راہ میں جا رہے تھے، ایک شقی نے آکر فرق مبارک پر خاک ڈال دی، اسی حالت میں آپ گھر میں تشریف لائے۔ آپ کی صاحبزادی نے دیکھا تو پانی لے کر آئیں۔ آپ کا سر دھوتی تھیں اور جوش محبت سے روتی جاتی تھیں۔ آپ نے فرمایا "جان پدر! رو نہیں خدا تیرے باپ کو بچا لے گا"[۳]

---

[۱] مصنف کے اس نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ بخاری کی روایت کے آخری راوی حضرت مسیبؓ ہیں جو صحابی ہیں، ظاہر ہے کہ صحابی کی روایت کسی صحابی ہی سے ہوگی اسی لئے مراسیل صحابہ حجت ہیں اور ابن [illegible] کی روایت منقطع ہے اور مجہول راوی صحابی نہیں ہے، خود ابن اسحٰق بھی استناد کا اعلیٰ درجہ نہیں رکھتے اس لئے دونوں روایتوں کو یکساں نہیں قرار دیا جا سکتا۔ علاوہ بریں حضرت [illegible] کی اس روایت کی تائید میں خود حضرت عباسؓ کی وہ روایت ہے جو اسی مسیب والی روایت سے اوپر صحیح بخاری میں موجود ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت عباسؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کے چچا (ابوطالب) کو آپ سے کیا فائدہ پہنچا کہ وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کے لئے آپ کے دشمنوں سے برسر پرخاش رہتے تھے۔ فرمایا، وہ دوزخ کی آگ میں صرف ٹخنے تک ہیں مگر اس کا اثر بھی دماغ تک پہنچ جاتا ہے، اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ خود حضرت عباسؓ کے علم میں تھا کہ ان کا خاتمہ توحید کے اقرار پر نہیں ہوا، اسی مضمون کی روایت حضرت ابو سعید خدریؓ سے بھی ہے جو صحیح بخاری باب قصۂ ابی طالب میں اسی موضع پر موجود ہے۔ (س) [۲] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر ابوطالب [۳] مواہب لدنیہ [۴] یہ تفصیل ابن سعد میں ہے [۵] طبری اور ابن ہشام ذکر وفات حضرت خدیجہؓ۔

اہل مکہ سے تو قطعی ناامیدی تھی، اس لئے آپ نے ارادہ فرمایا کہ طائف تشریف لے جائیں اور وہاں دعوت اسلام فرمائیں۔ طائف میں بڑے بڑے امراء اور ارباب اثر رہتے تھے، ان میں عمیر کا خاندان رئیس القبائل تھا۔ یہ تین بھائی تھے، عبدیالیل، مسعود، حبیب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے اور اسلام کی دعوت دی، ان تینوں نے جو جواب دیئے وہ نہایت عبرت انگیز تھے۔ ایک نے کہا "اگر تجھ کو خدا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو کعبہ کا پردہ چاک کر رہا ہے"۔ دوسرے نے کہا "کیا خدا کو تیرے سوا اور کوئی نہیں ملتا تھا"۔ تیسرے نے کہا "میں بہرحال تجھ سے بات نہیں کر سکتا تو اگر سچا ہے تو تجھ سے گفتگو کرنا خلاف ادب ہے اور جھوٹا ہے تو گفتگو کے قابل نہیں"۔

ان بدبختوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، طائف کے بازاریوں کو ابھار دیا کہ آپ کی ہنسی اڑائیں، شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ یہ مجمع دو رویہ صف باندھ کر کھڑا ہوا۔ جب آپ ادھر سے گزرے تو آپ کے پاؤں پر پتھر مارنے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ آپ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ جب آپ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے تھے۔ جب آپ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالیاں بجاتے جاتے۔ آخر آپ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں میں پناہ لی۔ یہ باغ عتبہ بن ربیعہ کا تھا جو باوجود کفر کے شریف الطبع اور نیک نفس تھا اس نے آپ کو اس حالت میں دیکھا تو اپنے غلام کے ہاتھ جس کا نام عداس تھا، انگور کا خوشہ ایک کشتی میں رکھ کر بھیجا۔ اس سفر میں حضرت زید بن حارثہ بھی ساتھ تھے[۱]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف سے پھر کر چند روز نخلہ میں قیام کیا، پھر حرا میں تشریف لائے اور مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھ کو اپنی حمایت میں لے سکتے ہو، عرب کا شعار تھا کہ جب کوئی ان سے طالب حمایت ہوتا تو گو دشمن ہوتا انکار نہیں کر سکتے تھے۔ مطعم نے یہ درخواست منظور کی، بیٹوں کو بلا کر کہا کہ ہتھیار لگا کر حرم میں جاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تشریف لائے۔ مطعم اونٹ پر سوار ساتھ تھا حرم کے پاس آیا تو پکارا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں آئے، نماز ادا کی اور دولت خانہ کو واپس گئے مطعم اور اس کے بیٹے آپ کو تلواروں کے سایہ میں لائے[۲]۔

مطعم نے کفر کی حالت میں غزوۂ بدر سے پہلے وفات کی۔ حضرت حسانؓ جو دربار رسالت کے شاعر تھے انھوں نے

---

[۱] یہ پوری تفصیل مواہب لدنیہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ اور طبری و ابن ہشام میں ہے [۲] کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف نگاہوں کو کس طرح مختلف نظر آتا ہے، مارگولیس نے (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کو سوء تدبیر میں داخل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ طائف مکہ سے بالکل قریب اور ان کے زیر اثر تھا اور وہاں رؤسائے مکہ کے باغ تھے جن کی وجہ سے ان کی آمد و رفت رہتی تھی، اس لئے جب مکہ کے تمام رؤسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھے تو طائف کے لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی! لیکن سر ولیم میور صاحب کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زور اعتقاد اور اعتماد علی النفس تھا کہ باوجود تمام ناکامیوں کے وہ تنہا ایک مخالف شہر میں آگئے اور تبلیغ اسلام کا فرض ادا کیا۔ ع والفضل ما شهدت به الاعداء [۳] ابن سعد صفحہ ۱۴۰ کسی قدر تفصیل مواہب لدنیہ سے اضافہ کی گئی ہے جو ابن اسحاق کی روایت ہے تعجب ہے کہ ابن ہشام نے یہ حالات قلم انداز کئے ہیں۔

مرثیہ لکھا، زرقانی نے یہ مرثیہ بدر میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں، معلوم کا یہ کام بے شبہ ملامت کا مستحق تھا لیکن آج کل کے مسلمان حضرت حسانؓ اور زرقانی سے زیادہ شیفتۂ اسلام ہیں، اس لئے معلوم نہیں حضرت حسانؓ کا یہ فعل آج بھی پسند کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔

قبائل کا دورہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا جب حج کا زمانہ آتا اور عرب کے قبائل ہر طرف سے آکر مکہ کے آس پاس اترتے تو آپ ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور تبلیغ اسلام فرماتے، عرب میں مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے جن میں دور دور کے قبائل آتے تھے، آپ ان میلوں میں جاتے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے۔

ان میلوں میں سے عکاظ جو اہل عرب کا قومی اور علمی دنگل تھا اور مجنہ اور ذوالمجاز کا نام مورخین نے خاص طور پر لیا ہے۔ قبائل عرب میں سے بنو عامر، محارب، فزارہ، غسان، مرۃ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نصر، کندہ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ مشہور قبائل ہیں، ان سب قبائل کے پاس آپ تشریف لے گئے، لیکن ابولہب ہر جگہ ساتھ ساتھ جاتا، اور جب آپ کسی مجمع میں تقریر کرتے تو برابر سے کہتا کہ "دین سے پھر گیا ہے اور جھوٹ کہتا ہے"۔

بنی حنیفہ یمامہ میں آباد تھے، ان لوگوں نے نہایت تلخی کے ساتھ جواب دیا مسیلمہ کذاب جس نے آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کیا، اسی قبیلہ کا رئیس تھا۔

قبیلہ بنو ذہل بن شیبان کے پاس جب آپ گئے تو حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مفروق سے کہا تم نے کسی پیغمبر کا تذکرہ سنا ہے، وہ یہی ہیں۔ مفروق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رخ کر کے کہا "برادر قریش! تم کیا تلقین کرتے ہو؟" آپ نے فرمایا۔ خدا ایک ہے اور میں اس کا پیغمبر ہوں اور یہ آیتیں پڑھیں۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ (انعام آیت ۱۵۱)

کہہ دو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ خدا نے کیا چیزیں حرام کی ہیں یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو والدین کا حق خدمت بجا لاؤ اور اپنے بچوں کو افلاس کے خیال سے قتل نہ کرو، ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیں گے، فحش باتوں کے پاس نہ جاؤ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور آدمی کی جان جس کو خدا نے حرام کیا ہے ناحق ہلاک نہ کرو۔

اس قبیلہ کے رؤسا مفروق، مثنی اور ہانی بن قبیصہ تھے اور وہ سب اس موقع پر موجود تھے، ان لوگوں نے کلام کی تحسین کی، لیکن کہا کہ مدتوں کا خاندانی دین دفعتاً چھوڑ دینا زود اعتقادی ہے اس کے علاوہ ہم کسریٰ کے زیر اثر ہیں اور معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم اور کسی کے اثر میں نہ آئیں گے۔ آپ نے ان کی اس راست گوئی کی تحسین کی اور فرمایا کہ خدا اپنے دین کی آپ مدد کرے گا۔

قبیلہ بنو عامر کے پاس گئے تو ایک شخص نے جس کا نام (بحیرہ بن) فراس تھا، آپ کی تقریر سن کر کہا۔ یہ شخص مجھ

لہ زرقانی ج ۱ ص ۱۶ سه ابن سعد نے ان تمام قبائل کا ذکر کیا ہے سه مستدرک حاکم جلد اول ص ۱۵، حیدرآباد سه ابن ہشام سه روض الانف بحوالہ قاسم بن ثابت۔

کو ہاتھ آجائے تو میں تمام عرب کو مسخر کر لوں۔ پھر آپ سے پوچھا کہ اگر ہم تمہارا ساتھ دیں اور تم اپنے مخالفوں پر غالب آجاؤ تو تمہارے بعد ریاست ہم کو ملے گی؟ آپ نے فرمایا سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے کہا، ہم اپنا سینہ عرب کی آماجگاہ بنائیں اور حکومت دوسروں کے ہاتھ آئے، ہم کو یہ غرض نہیں لے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی

اسباب مذکورۂ بالا کی بنا پر قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی اور چاہا کہ آپ کو اس قدر ستائیں کہ آپ مجبور ہو کر تبلیغ اسلام سے دستبردار ہو جائیں، سوء اتفاق یہ کہ جو اکابر آپ کے ہمسایہ تھے یعنی ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، منبہ بن حجاج، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن ابی العاص، سب قریش کے سرآوردہ رؤسا تھے اور یہی سب سے بڑھ کر آپ کے دشمن تھے، یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپ کی گردن پر اوجھڑی لا کر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچتے کہ گردن مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں۔ آپ کی روحانی قوت اثر کو دیکھ کر لوگ جادوگر کہتے، دعوائے نبوت کو سن کر مجنون کہتے۔ باہر نکلتے تو شریر لڑکے پیچھے پیچھے غول باندھ کر چلتے۔ نماز جماعت میں قرآن زور سے پڑھتے تو قرآن، قرآن کے لانے والے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کے اتارنے والے (خدا) کو گالیاں دیتے۔

ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، رؤسائے قریش بھی موجود تھے، ابوجہل نے کہا کاش! اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدہ میں جاتے تو ان کی گردن پر ڈال دیتا، عقبہ نے کہا، یہ خدمت میں انجام دیتا ہوں، چنانچہ اوجھ لا کر آپ کی گردن پر ڈال دی، قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے، کسی نے جا کر حضرت فاطمہؓ کو خبر کی۔ وہ اگرچہ اس وقت صرف پانچ چھ برس کی تھیں، لیکن جوش محبت سے دوڑی آئیں اور اوجھ ہٹا کر عقبہ کو برا بھلا کہا اور بددعائیں دیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کہیں کسی مجمع عام میں دعوت اسلام کا وعظ فرماتے تو ابولہب جو آپ کے ساتھ ساتھ رہتا برابر سے کہتا جاتا کہ یہ جھوٹ کہتا ہے۔ ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب کہ میں اسلام نہیں لایا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بازار ذوالمجاز میں گئے اور گھس کر لوگوں سے کہا لا الہ الا اللہ کہو۔ ابوجہل آپ پر خاک پھینکتا جاتا تھا اور کہتا کہ اس کے فریب میں نہ آنا، یہ چاہتا ہے کہ تم لات و عزیٰ کی پرستش چھوڑ دو۔ طائف میں کفار نے آپ کو جو اذیتیں پہنچائیں، ان کا بیان پیچھے گزر چکا۔

ایک دفعہ آپ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ نے آپ کی گردن میں چادر لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچی اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آگئے اور آپ کا شانہ پکڑ کر عقبہ کے ہاتھ سے چھڑایا اور کہا کہ اس شخص کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے۔

جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں نہایت سرگرم تھے اور رات دن اسی شغل میں رہتے تھے ان

لہ طبری ج ۳ ص ۱۲۰۵ سه ابن سعد ج ۱ ص ۱۳۴ سه مسند امام حنبل ج ۴ سه صحیح بخاری ص ۹۸۶ سه صحیح بخاری باب الطہارۃ والصلوۃ والجزیۃ والجہاد و صحیح مسلم و زرقانی ج ۱ ص ۲۹۰ سه مسند امام حنبل ج ۴ ص ۳۴۱ سه صحیح بخاری باب مالقی صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ بمکہ۔

کے نام جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں لکھے ہیں حسب ذیل ہیں۔

ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، حارث بن قیس بن عدی، ولید بن المغیرہ، امیۃ، ابی بن خلف ابو قیس بن فاکہ بن المغیرہ، عاص بن وائل، نضر بن حارث، منبہ بن الحجاج، زہیر بن ابی امیۃ، سائب بن صیفی، اسود بن عبد الاسد، عاص بن سعید بن العاص، عاص بن ہاشم، عقبہ بن ابی معیط، ابن الاصدی، ہذلی، حکم بن ابی العاص عدی بن حمراء۔

یہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ اور اُن میں سے اکثر صاحب جاہ و [illegible] تھے۔ یہ جو کچھ ہوا، گو نہایت درد انگیز اور حسرت خیز تھا لیکن تعجب انگیز نہ تھا۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں برغبت سُن لی گئی ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو سینکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور وحشت کا سامنا رہا۔ یونان دنیا کی شائستگی کا معلم اول ہے، تاہم اسی حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو دار و رسن کا منظر پیش آیا۔ اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلۂ واقعات کی غیر معمولی کڑی نہ تھی لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا۔

سقراط (زہر کا) پیالہ پی کر فنا ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے مخالفت سے تنگ آ کر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دنیا کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام تیس چالیس شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بروایت نصاریٰ سولی پر چڑھ گئے۔ لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ان سب سے بالاتر تھا، حضرت خبابؓ بن الارت نے جب قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے؟ تو آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور فرمایا کہ "تم سے پہلے وہ لوگ گزرے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تھے، تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے، خدا اس کام کو پورا کرے گا، یہاں تک کہ شتر سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔"

★

ع حضرت مسیح کو سولی دینے کا قصہ موجودہ چاروں انجیلوں میں موجود ہے لیکن قرآن کریم نے اس کی بڑی سختی سے تردید کی ہے اور کہا ہے کہ درحقیقت یہ غلط فہمی ہے ورنہ حضرت عیسٰی علیہ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے۔ انسانی معلومات کی ترقی کے ساتھ قرآن کریم کی صداقت خود بخود واضح ہوتی جا رہی ہے چند سو سال پہلے انجیل برنا باس کا نسخہ دریافت ہوا تھا اس میں برنا باس نے نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی ہے کہ حضرت عیسٰی کو سولی نہیں دی گئی تھی بلکہ ان کی جگہ یہودا اسکریوتی مصلوب ہوا تھا۔ حال ہی میں انجیل کا ایک اور نسخہ دریافت ہوا ہے جو پطرس حواری کی طرف منسوب ہے اس میں بالکل صاف الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دینے سے کچھ پہلے آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔ (ملخص حاشیہ بائبل سے قرآن تک کا مقدمہ ص ۲۶ و ص ۴۹) منجانب مصحح محمد محی الدین سواتی۔

لہ صحیح بخاری، باب مالقی النبی و اصحابہ من المشرکین، ذکر ایام جاہلیۃ۔

مدینہ منورہ اور انصار

آفتاب کی روشنی دُور پہنچ کر تیز ہو جاتی ہے۔ شمیم گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بنتی ہے۔ آفتاب اسلام طلوع مکہ میں ہوا لیکن کرنیں مدینہ کے افق پر چمکیں، مدینہ کا اصلی نام یثرب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہاں آ کر قیام کیا تو اس کا نام مدینۃ النبی یعنی "پیغمبر کا شہر" پڑ گیا اور پھر مختصر ہو کر مدینہ مشہور ہو گیا۔ یہ شہر مدتوں سے آباد ہے، قدیم زمانہ میں یہودی آ کر یہاں آباد ہوئے، ان کی نسلیں کثرت سے پھیلیں اور مدینہ کے اطراف اُن کے قبضہ میں آ گئے۔ انھوں نے مدینہ اور اس کے حوالی میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے تھے اور ان میں سکونت رکھتے تھے (یہود کے متعلق زائد تحقیق آگے آئے گی)

انصار اصل میں یمن کے رہنے والے اور قحطان کے خاندان سے تھے، یمن میں جب مشہور سیلاب آیا جس کو "سیل عرم" کہتے ہیں، یہ لوگ یمن سے نکل کر مدینہ میں آباد ہوئے۔ یہ دو بھائی تھے اوس اور خزرج۔ تمام انصار ان ہی دو کے خاندان سے ہیں لہ۔ یہ خاندان جب یثرب میں آیا تو یہود نہایت اقتدار اور اثر رکھتے تھے۔ آس پاس کے مقامات اُن کے قبضہ میں تھے، اور دولت و مال سے مالا مال تھے۔ چونکہ آل و اولاد کی کثرت سے بیس اکیس قبیلے بن گئے تھے اس لئے دور دور تک بستیاں بسالی تھیں۔ انصار کچھ زمانہ تک اُن سے الگ رہے لیکن اُن کا زور اور اثر دیکھ کر بالآخر اُن کے حلیف لہ بن گئے۔ ایک مدت تک یہ حالت قائم رہی۔ لیکن اب انصار کا خاندان پھیلتا جاتا تھا اور اقتدار حاصل کرتا جاتا تھا۔ یہود نے پیش بینی کے لحاظ سے ان سے معاہدہ توڑ دیا۔

یہودیوں میں ایک رئیس فطیون پیدا ہوا جو نہایت عیاش اور بدکار تھا، اس نے یہ حکم دیا کہ جو دوشیزہ لڑکی بیاہی جائے پہلے اس کے شبستان عیش میں آئے۔ یہود نے اس کو گوارا کر لیا تھا، لیکن جب انصار کی نوبت آئی تو انھوں نے سرتابی کی۔ اس زمانہ میں انصار کا سردار ایک شخص مالک بن عجلان تھا۔ اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گزری۔ مالک کو غیرت آئی اٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی۔ اس نے کہا "ہاں! لیکن کل جو کچھ ہوگا اس سے بھی بڑھ کر ہے" دوسرے دن حسب دستور جب مالک کی بہن دُلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانے کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ گیا اور فطیون کو قتل کر کے شام کو بھاگ گیا۔ یہاں غسانیوں کی حکومت تھی اور ابو جبلہ حکمران تھا۔ اس نے یہ حالات سُنے تو ایک فوج گراں لے کر آیا اور اوس اور خزرج کے رؤسا کو بلا کر ان کو خلعت اور صلے دیئے۔ پھر رؤسائے یہود کی دعوت کی اور ایک ایک کو دھوکے سے قتل کرا دیا، یہود کا زور اب ٹوٹ گیا اور انصار نے نئے سرے

لہ انصار کے نسب اور مدینہ میں آباد ہونے کی پوری تفصیل وفاء الوفاء جلد اول صفحہ ۱۱۶ تا ۱۲۰ میں مذکور ہے۔ لہ جو قبیلے آپس میں ایک دوسرے کی اعانت و شرکت کا (بحلف) معاہدہ کرتے تھے وہ باہم حلیف کہلاتے تھے۔

سے قوت حاصل کی۔

انصار نے مدینہ اور حوالی مدینہ میں کثرت سے چھوٹے چھوٹے قلعے بنالیے۔ اوس اور خزرج ایک مدت تک باہم متحد رہے، لیکن پھر عرب کی فطرت کے موافق خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں اور سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں، سب سے اخیر لڑائی میں جس کو بعاث کہتے ہیں ایسے زور کا معرکہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے تمام نامور لڑ لڑ کر مرگئے۔ انصار اب اس قدر ضعیف ہوگئے کہ انھوں نے قریش کے پاس سفارت بھیجی کہ ہم کو حلیف بنالیجئے لیکن ابوجہل نے معاملہ درہم برہم کردیا۔

انصار گو بُت پرست تھے تاہم چونکہ یہود سے میل جول تھا اس لئے نبوت اور کتبِ آسمانی سے گوش آشنا تھے۔ یہود سے گو انصار اکثر رقابت رکھتے تھے، لیکن اُن کے علمی فضل وکمال کے معترف تھے۔ یہود نے مدینہ میں جو علمی مدارس قائم کئے تھے اور جن کو بیت المدراس کہتے تھے (بخاری وغیرہ میں نام مذکور ہے) ان میں تورات کی تعلیم ہوتی تھی۔ انصار جاہل تھے اس لئے ان پر یہود کے علمی تفوق کا خواہ مخواہ اثر پڑتا تھا، یہاں تک کہ انصار میں سے جس کے اولاد زندہ نہ رہتی تھی، وہ منت مانتا تھا کہ بچہ زندہ رہے گا تو یہودی بنا دیا جائے گا۔[1] یہودی عموماً یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک پیغمبر ابھی اور آنے والا ہے۔ اس بناء پر انصار بھی ایک پیغمبرِ موعود کے نام سے آشنا تھے۔

انصار میں ایک شخص سوید بن صامت جو شاعری اور جنگ آوری میں ممتاز تھا اس کو امثالِ لقمان کا نسخہ ہاتھ آگیا تھا۔ جس کو وہ کتابِ آسمانی سمجھتا تھا۔ وہ ایک دفعہ حج کو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حالات سُنے تو خود اس کے پاس تشریف لے گئے۔ اُس نے امثالِ لقمان پڑھ کر سنایا۔ آپ نے فرمایا "میرے پاس اس سے بھی بہتر چیز ہے۔" یہ کہہ کر قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں۔ سوید نے تحسین کی۔ اگرچہ وہ مدینہ واپس آکر جنگ بعاث میں مارا گیا لیکن اسلام کا معتقد ہوچکا تھا۔[2]

سوید شجاعت اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا تھا ایسے شخص کو اہلِ عرب "کامل" کہتے تھے اور اسی بنا پر سوید اسی لقب سے پکارا جاتا تھا۔[3] سوید کے میلانِ اسلام کا اثر انصار پر پڑ چکا تھا۔

اوس اور خزرج کے معرکوں میں اوس کو جب شکست ہوئی تو اوس کے عمائد قریش کے پاس گئے کہ خزرج کے مقابلہ میں اُن کو حلیف بنائیں۔ اس سفارت میں ایاس بن معاذ بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کا آنا معلوم ہوا تو آپ اُن کے پاس تشریف لے گئے اور قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ اوس نے ساتھیوں سے

---

[1] وفاء الوفا۔ یہ واقعہ مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے اور وفاء الوفا میں یہ تمام روایتیں مذکور ہیں اور بخاری ج ۲ صفحہ ۱۰۲۰ کتاب الاکراہ باب فی بیع المکرہ ونحوہ فی الحق وغیرہ، نیز کتب تفسیر میں لا اکراہ فی الدین کی تفسیر دیکھو۔ [2] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۱۴۷۔

[3] سوید کا ذکر ابن ہشام میں ہے لیکن روض الانف میں زیادہ تفصیل ہے، اصابہ میں بھی اس کا حال ہے لیکن نسب میں اختلاف ہے امثال لقمان کا ذکر نہیں ہے۔ طبری میں بھی سوید کا پورا واقعہ مع اس کے اشعار کے مذکور ہے (ج ۲ ص ۲۰۷)

کہا "خدا کی قسم! تم جس غرض کے لئے آئے ہو یہ کام اُس سے بھی بہتر ہے۔" لیکن قافلہ کے سالار یعنی ابوالحیس نے کنکریاں اٹھا کر اُن کے منہ پر ماریں اور کہا کہ ہم اس کام کے لئے نہیں آئے۔ اس کے بعد بعاث کا معرکہ پیش آگیا اور ایاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے انتقال کرگئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ مرتے وقت ایاس کی زبان پر تکبیر جاری تھی۔[1]

انصار کے اسلام لانے کی ابتدا سنہ ۱۱ نبوی

جیسا کہ اوپر گزرچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا حج کے زمانہ میں رؤسائے قبائل کے پاس جاکر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے۔ اس سال رجب سنہ ۱۱ نبوی میں بھی آپ متعدد قبائل کے پاس تشریف لے گئے، عقبہ کے پاس جہاں اب مسجد العقبہ ہے خزرج کے چند اشخاص آپ کو نظر آئے، آپ نے اُن سے نام ونسب پوچھا، انھوں نے کہا خزرج۔ آپ نے دعوتِ اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتیں سُنائیں۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا "دیکھو یہود ہم سے اس اولیت میں بازی نہ لے جائیں۔" یہ کہہ کر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا۔ یہ چھ شخص تھے جن کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

---

[1] طبری و اصابہ میں یہ واقعہ تفصیلاً مذکور ہے۔ اصابہ میں لکھا ہے کہ ایاس کا حال امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۱۴۷)۔ [2] مدینہ منورہ کے یہ حضرات جو پہلے پہل اسلام لائے۔ بعض مصنفین سیرت نے ان کے اس قبولِ اسلام کے واقعہ کا تذکرہ بیعت عقبہ اولیٰ کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ عنوان کتب سیرت کے ناظرین کے لئے اس وقت پریشانی کا موجب بن جاتا ہے جب وہ دوسری کتابوں (مثلاً مستدرک حاکم ج ۲ صفحہ ۶۲۴، ابن کثیر علی حاشیہ فتح البیان ج ۹ صفحہ ۲۲۴) میں دیکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں بارہ آدمی تھے، اسی اختلاف روایت کے سبب سے بعض مصنفین سیرت بیعت عقبہ ثانیہ میں بارہ آدمی اور بعض ۷۳ آدمی بتلاتے ہیں، حالانکہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع شروع میں اسلام لائے، ان کے واقعہ قبولِ اسلام کا عنوان بیعت عقبہ اولیٰ نہیں بلکہ ابتدائے اسلام انصار ہونا چاہیے اور دوسرے سال جب کہ گیارہ یا بارہ آدمی حاضر خدمت ہوئے ہیں یہ بیعت عقبہ اولیٰ تھی۔ حضرت عبادۃ بن الصامت نے تصریح فرمایا ہے کہ "کنا اثنی عشر فی العقبة الاولی من العام المقبل"۔ اس روایت میں حضرت عبادۃ العام المقبل میں بیعت عقبہ اولیٰ کا ہونا فرماتے ہیں اور اس میں گیارہ آدمیوں کے ہونے کی تصریح فرماتے ہیں، اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس سے پہلے جو لوگ آکر اسلام قبول کرچکے تھے اس کا تعلق بیعت عقبہ اولیٰ سے نہیں ہے۔

جب لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام بیعت عقبہ اولیٰ رکھا ہے وہ تین بیعت عقبہ کا [illegible] دیتے ہیں یعنی ایک یہ بیعت عقبہ اولیٰ، دوسری وہ بیعت عقبہ جس میں گیارہ یا بارہ آدمی اسلام لائے اور تیسری وہ بیعت عقبہ جس میں ۷۰ افراد مشرف با اسلام ہوئے اور دونوں واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم میں پیش آئے اور جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کو صرف ابتدائے اسلام انصار کے عنوان سے ذکر کیا ہے انھوں نے گیارہ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور ۷۰ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے (ماخوذ از تاریخ خمیس اول صفحہ ۳۰۶، ۳۱۶، ۳۱۷ و زرقانی)

[3] سیرت حلبیہ [4] مستدرک ج ۲ صفحہ ۲۰۰ نیز زرقانی

نام	کیفیت
۱۔ ابوالہیثم بن تیہان۔	(صحابہ میں سب سے پہلے ان ہی نے ۲۰ھ میں وفات پائی)
۲۔ ابوامامہ اسعد بن زُرارہ	(بدر میں وفات پائی)
۳۔ عوف بن حارث	
۴۔ رافع بن مالک بن عجلان	اس وقت تک جس قدر قرآن اتر چکا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عنایت فرمایا، جنگ احد میں شہید ہوئے۔
۵۔ قطبہ بن عامر بن حدیدہ	(تینوں عقبات میں شریک رہے)
۶۔ جابر بن عبداللہ (بن ریاب)	(یہ مشہور صحابی حضرت جابر بن عبداللہ بن عمرو کے علاوہ تھا) بدر وغیرہ میں شریک تھے۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ ۱۲ نبوی

دوسرے سال بارہ شخص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی۔ اس کے ساتھ اس بات کی بھی خواہش کی کہ احکامِ اسلام کے سکھانے کے لئے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ مصعبؓ ہاشم بن عبدمناف کے پوتے اور سابقینِ اسلام میں سے تھے، غزوۂ بدر میں لشکر کی علمبرداری کا منصب انہی کو ملا تھا۔ وہ مدینہ میں آ کر اسعد بن زرارہ کے مکان پر ٹھہرے جو مدینہ کے نہایت معزز رئیس تھے۔ روزانہ معمول تھا کہ انصار کے ایک ایک گھر کا دورہ کرتے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے، روزانہ ایک دو نئے آدمی اسلام قبول کرتے۔ رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا۔ صرف خطمہ، وائل، واقف کے چند گھرانے باقی رہ گئے۔ ابن سعد نے طبقات میں یہ واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔

قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ تھے، قبیلہ پر ان کا یہ اثر تھا کہ ہر کام میں ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ مصعبؓ نے جب اُن کے پاس جا کر اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے پہلے نفرت ظاہر کی، لیکن جب مصعبؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو پھر موم تھا۔ ان کا اسلام لانا تمام قبیلۂ اوس کا اسلام قبول کر لینا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) علی المواہب ج ۱ ص ۳۶۲، ص ۳۶۷) س

۱؎ یہ واقعات تمام تاریخوں میں مذکور ہیں، ہم نے زرقانی کو پیش نظر رکھا ہے، کیونکہ اس نے تمام مختلف روایتیں جمع کر دی ہیں۔ ان کو در کی تعداد بعضوں نے آٹھ بیان کی ہے اسعدؓ بن زرارہ اور ابوالہیثم کا پہلے سے موجود ہونا ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے، دیکھو کتاب مذکور جزء ثالث (انصار بدریین) صفحہ ۲۲

واقدی کا بیان ہے کہ اسعدؓ بن زرارہ اس واقعہ سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے (بعضوں نے ابوالہیثم بن تیہان کی جگہ عقبہ بن عامر بن نابی کا نام لیا ہے اور بعض نے جابر بن ریاب کے بجائے عبادہ بن صامت کو جگہ دی ہے)۔ س

بیعتِ عقبہ ثانیہ ۱۳ نبوی

اگلے سال بہترؔ شخص حج کے زمانہ میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے جو بت پرست تھے، چھپ کر بمقام منیٰ (عقبہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی اس موقع پر حضرت عباسؓ بھی جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، انھوں نے انصار سے خطاب کر کے کہا گروہ خزرج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں، دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے۔ اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں، اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر ورنہ ابھی سے جواب دیدو۔

حضرت براءؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے کہا "ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں" وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابوالہیثمؓ نے بات کاٹ کر کہا، یارسول اللہ! ہم سے اور یہود سے تعلقات ہیں۔ بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے، ایسا تو نہ ہو کہ جب آپ کو قوت اور اقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے جائیں۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا "نہیں تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے اور میں تمہارا ہوں"۔

آپؐ نے اس گروہ میں سے بارہ شخص نقیب انتخاب کئے، جن کے نام خود انصار نے پیش کئے تھے، اُن میں نو خزرج کے اور تین اوس کے تھے، ان کے نام حسب روایت ابن سعد حسب ذیل ہیں:۔

نام	کیفیت
۱۔ اُسیدؓ بن حضیر	جنگِ بعاث میں انہی کے باپ اوس کے سردار تھے۔
۲۔ ابوالہیثمؓ بن تیہان	
۳۔ سعدؓ بن خیثمہ	جنگِ بدر میں شہید ہوئے۔
۴۔ اسعدؓ بن زرارہ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے یہ امام نماز تھے۔
۵۔ سعدؓ بن الربیع	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔
۶۔ عبداللہؓ بن رواحہ	مشہور شاعر ہیں، جنگِ موتہ میں شہید ہوئے۔
۷۔ سعدؓ بن عبادہ	معزز اور مشہور صحابی ہیں، سقیفۂ بنی ساعدہ میں ان ہی نے پہلے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔
۸۔ منذرؓ بن عمرو	بیر معونہ میں شہید ہوئے۔
۹۔ براءؓ بن معرور	بیعت عقبہ میں انہی نے انصار کی طرف سے تقریر کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔
۱۰۔ عبداللہؓ بن عمرو	جنگِ احد میں شہید ہوئے۔
۱۱۔ عبادہؓ بن الصامت	مشہور صحابی ہیں اُن سے اکثر حدیثیں مروی ہیں۔
۱۲۔ رافعؓ بن مالک	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں پر انصار سے بیعت لی یہ تھیں۔ شرک، چوری، زنا، قتل اولاد اور افتراء کے مرتکب نہ ہوں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے جو اچھی بات کہیں گے، اس سے

سے بے وفائی نہ کریں گے۔

جب انصار بیعت کر رہے تھے تو سعدؓ بن زرارہ نے کھڑے ہو کر کہا بھائیو! یہ بھی خبر ہے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب وعجم اور جن وانس سے جنگ ہے۔

سب نے کہا۔ ہاں ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں۔

بارہ شخص جو نقیب انتخاب کئے گئے رئیس القبائل تھے، اُن کا اسلام قبول کرنا تمام انصار کا اسلام قبول کرنا تھا۔ صبح کو اس بیعت کی اُڑتی سی خبر پھیلی، قریش انصار کے پاس آئے اور شکایت کی، انصار کے ساتھ جو بُت پرست تھے ان کو اس بات کی خبر نہ تھی انہوں نے تکذیب کی کہ ایسا ہوتا تو ہم سے کیونکر چھپ سکتا تھا۔

مدینہ میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں، قریش کو معلوم ہوا تو انہوں نے روک ٹوک شروع کی لیکن چوری چھپے لوگوں نے ہجرت شروع کر دی رفتہ رفتہ اکثر صحابہ چلے گئے۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے۔ جو لوگ مفلسی سے مجبور تھے وہ مدت تک نہ جاسکے۔

یہ آیت اُن ہی کی شان میں ہے۔

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (نساء-۱۰)	کمزور مرد، عورتیں اور بچے جو یہ کہتے ہیں، کہ اے خدا! ہم کو اس شہر سے نکال کہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔

★

لہ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ یہ عقبہ اولی کی شرائط ہیں، اخیر بیعت اس بات پر لی گئی تھی کہ انصار آپؐ کی جان کی حفاظت کریں گے۔

سلسلہ

ہجرت

(اس وقت جبکہ دعوتِ حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سُنائی دے رہی تھیں، حافظِ عالم نے مسلمانوں کو دارالامان مدینہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا لیکن خود وجودِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جوان ستم گاروں کا حقیقی ہدف تھا اپنے لئے حکمِ خدا کا منتظر تھا۔ مکہ کے باہر اطراف میں جو صاحبِ اثر مسلمان ہو چکے تھے وہ جاں نثار اپنی حفاظت کی خدمت پیش کرتے تھے۔ قبیلہ دوس ایک محفوظ قلعہ کا مالک تھا، اس کے رئیس طفیل بن عمرو نے اپنا قلعہ پیش کیا کہ آپ یہاں ہجرت کر آئیں، لیکن آپ نے انکار فرمایا، اسی طرح بنی ہمدان کے ایک شخص نے بھی یہی خواہش کی تھی، بعد کو اس نے کہا کہ وہ اپنے اہل قبیلہ کو مطلع کر کے آئندہ سال آئے گا۔ لیکن کارساز قضا و قدر نے یہ شرف صرف انصار کے لئے مخصوص کیا تھا۔ چنانچہ قبل ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ دارالہجرۃ ایک پُر باغ و بہار مقام ہے، خیال تھا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہو گا لیکن وہ شہر مدینہ نکلا)

نبوت کا تیرھواں سال شروع ہوا اور اکثر صحابہ مدینہ پہنچ چکے تو وحی الٰہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا۔ یہ داستان نہایت پُر اثر ہے اور اسی وجہ سے امام بخاریؒ نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے اور حضرت عائشہؓ کی زبانی لکھا ہے، حضرت عائشہؓ گو اس وقت سات آٹھ برس کی تھیں لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا بیان ہے کہ انہی سے سُن کر کہا ہو گا اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینہ جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے، اس بنا پر انہوں نے دارالندوہ میں جو دارالشوریٰ تھا اجلاس عام کیا۔ ہر قبیلہ کے رؤسا یعنی عتبہ، ابوسفیان، جبیر بن مطعم، نضر بن حارث بن کلدہ، ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب، حکیم بن حزام، ابوجہل، نبیہ ومنبہ، امیہ بن خلف وغیرہ وغیرہ یہ سب شریک تھے، لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں، ایک نے کہا محمد کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے۔ دوسرے نے کہا جلاوطن کر دینا کافی ہے۔ ابوجہل نے کہا، ہر قبیلہ سے ایک شخص انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے، اس صورت میں ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا۔ اور آل ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے، اس اخیر رائے پر اتفاق ہو گیا اور جھٹ پٹے سے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ مبارک کا محاصرہ کر لیا۔ اہل عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لئے باہر ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

لہ صحیح مسلم ج ۲ ص ۵۵ باب الدلیل علی ان قاتل نفسہ لایکفر۔ تہ مستدرک ج ۲ ص ۶۱۳ و زرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۳۵۹۔

تہ صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی، تاہم آپؐ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال و اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا، آپؐ ہی کے پاس لا کر رکھتا تھا، اس وقت بھی آپؐ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں۔ آپؐ کو قریش کے ارادہ کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی اس بنا پر حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا کہ مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے، میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا، تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا۔ یہ سخت خطرہ کا موقع تھا، حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپؐ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بسترِ خواب قتل گاہ کی زمین ہے، لیکن فاتح خیبر کے لئے قتل گاہ فرشِ گل تھا۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے گھر پر گئے، دستور کے موافق دروازہ پر دستک دی۔ اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا۔ کچھ مشورہ کرنا ہے سب کو ہٹا دو۔ بولے کہ یہاں آپ کی حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے (اس وقت حضرت عائشہؓ سے شادی ہو چکی تھی)، آپؐ نے فرمایا، مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے، حضرت ابوبکرؓ نے نہایت بے تابی سے کہا میرا باپ آپ پر فدا ہو، کیا مجھ کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہوگا، ارشاد ہوا "ہاں" حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کے لئے چار مہینہ سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں، عرض کی کہ ان میں سے ایک آپؐ پسند فرمائیں، محسنِ عالم کو کسی کا احسان گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ ارشاد ہوا "اچھا مگر بہ قیمت"۔ حضرت ابوبکرؓ نے مجبوراً قبول کیا۔ حضرت عائشہؓ اس وقت کم سن تھیں، ان کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ نے جو حضرت عبداللہؓ بن زبیر کی ماں تھیں، سفر کا سامان کیا، دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا، نطاق، جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی تھیں پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا۔ یہ وہ شرف تھا جس کی بنا پر آج تک ان کو ذات النطاقین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔[1]

کفار نے جب آپؐ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا "مکہ! تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔" حضرت ابوبکرؓ سے پہلے سے قرارداد ہو چکی تھی، دونوں صاحب پہلے جبلِ ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے، یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہِ خلائق ہے۔[2]

حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں۔ جو کچھ خبر ملتی شام کو آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے، حضرت ابوبکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا اور آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ ان کا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی، لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو حضرت اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرت [illegible] [2] صحیح بخاری باب الہجرت [illegible] یہ غار مکہ سے تین میل داہنی جانب ہے، پہاڑ کی چوٹی قریباً ایک میل بلند ہے، سمندر یہاں سے دکھائی دیتا ہے۔ دیکھو زرقانی ج ۱ صفحہ ۳۴۱ [illegible]

تھیں۔ اسی طرح تین راتیں غار میں گزریں۔[1]

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت علیؓ تھے۔ ظالموں نے آپ کو پکڑا اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آ گئے۔ آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ غمزدہ ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے۔ آپؐ نے فرمایا۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (توبہ) گھبراؤ نہیں خدا ہمارے ساتھ ہے۔

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آ گئے تو خدا نے حکم دیا۔ دفعۃً ببول کا درخت اُگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپا لیا، ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیئے۔ حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو مواہب لدنیہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے اور زرقانی نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں، لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں۔ اس روایت کا اصلی راوی عون بن عمرو ہے۔ اس کی نسبت امام فن رجال یحییٰ بن معین کا قول ہے۔ لاشیٔ۔ یعنی ہیچ ہے، امام بخاری نے کہا ہے کہ وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے وہ مجہول الحال ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال نقل کئے ہیں اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے۔

بہرحال چوتھے دن آپؐ غار سے نکلے، عبداللہ بن اریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا، رہنمائی کے لئے اُجرت پر مقرر کر لیا گیا، وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا، ایک رات دن برابر چلے گئے۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سایہ میں آرام فرمالیں، چاروں طرف نظر ڈالی، ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اُتر کر زمین جھاڑی، پھر اپنی چادر بچھا دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آرام فرمایا تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں۔ پاس ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا، اس سے کہا ایک بکری کا تھن گرد و غبار سے صاف کر دے، پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دُودھ دوہایا۔ برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے، دودھ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا۔ آپؐ نے پی کر فرمایا کہ کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا۔ آفتاب اب ڈھل چکا تھا، اس لئے آپؐ وہاں سے روانہ ہوئے۔[2]

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو ایک

---

[1] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب الہجرۃ میں ہے، باب مناقب المہاجرین میں بعض مزید حالات ہیں وہ بھی ہم نے شامل کر لئے ہیں نہ تاریخ [illegible] ۲ ص ۲۲۴)۔ [illegible] سیرت النبی ج ۳ ص ۳۴ میں ضمنی مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت۔ ان روایات پر مفصل تنقید کی گئی ہے۔ [2] یہ پوری تفصیل حرف بہ حرف صحیح بخاری باب مناقب المہاجرین میں ہے۔ ہم نے تمام جزئیات اس لئے نقل کیں کہ اس سے حضرت ابوبکرؓ کی صفائی پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

خون بہا کے برابر (یعنی سو اونٹ) انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن جعشم نے سُنا تو انعام کے لالچ میں نکلا۔ عین اس حالت میں کہ آپ روانہ ہو رہے تھے، اُس نے آپ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا، لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی وہ گر پڑا۔ ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ جواب میں "نہیں" نکلا، لیکن سو اونٹوں کا گرانمایہ معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی۔ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا۔ اب کی گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر فال دیکھی۔ اب بھی وہی جواب تھا، لیکن مکرر تجربہ نے اس کی ہمت پست کر دی، اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامرؓ بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمانِ امن لکھ دیا۔[1]

حسنِ اتفاق یہ کہ حضرت زبیرؓ شام سے تجارت کا مال لے کر آ رہے تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کئے جو اس بے سروسامانی میں غنیمت تھے۔[2]

ابن سعد نے طبقات میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں گنائی ہیں، اگرچہ عرب کے نقشوں میں آج ان کا نشان نہیں ملتا، تاہم عقیدت مند صرف نام سے لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ خرار، ثنیۃ المرہ، لقف، مدلجۃ، مرج حدائد، اذاخر، رابغ (یہ مقام آج بھی حجاج کے رستہ میں آتا ہے، یہاں آپ نے مغرب کی نماز پڑھی) ذاسلم، عثانیہ، قاحہ، عرج، جدوات، رکوبہ، عقیق، حجاتہ۔

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی، تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا، معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے تھے "پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آ رہے ہیں"۔ لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے جاتے۔ ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ اے اہل عرب! لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آ گیا۔ تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اُٹھا، انصار ہتھیار سج سج کر بے تابانہ گھروں سے باہر نکل آئے۔

مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر جو بالائی آبادی ہے اُس کو عالیہ اور قبا کہتے ہیں، یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے، ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا اور کلثوم بن الہدم خاندان کے افسر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوشِ مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ یہ فخر اُن کی قسمت میں تھا کہ میزبانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کی مہمانی قبول کی۔ انصار ہر طرف سے جوق در جوق آتے اور جوشِ عقیدت کے سلام عرض کرتے۔

اکثر اکابر صحابہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مدینہ میں آ چکے تھے، وہ بھی انہی کے گھر میں اترے تھے

---

[1] سراقہ بعد میں اسلام لائے اور جب ایران فتح ہوا اور کسریٰ کے زیورات لوٹ میں آئے تو حضرت عمرؓ نے انہی کو وہ زیورات پہنا کر عالم کی نیرنگی کا تماشا دیکھا۔ [2] صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریشانی میں بھی دوات قلم ساتھ رہتا تھا۔ [3] صحیح بخاری صفحہ ۵ طبقات ابن سعد سیرت نبوی صفحہ ۱۵۵۔

چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ، مقدادؓ، خبابؓ، سہیلؓ، صفوانؓ، عیاضؓ، عبداللہ ابن مخرمہؓ، وہب بن سعد، معمرؓ بن ابی سرح، عمیرؓ بن عوف، اب تک انہی کے مہمان تھے۔ جناب امیرؓ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روانہ ہونے کے تین دن بعد مکہ سے چلے تھے وہ بھی آ گئے اور یہیں ٹھہرے۔ تمام مورخین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف چار دن قیام فرمایا لیکن صحیح بخاری میں چودہ دن ہے اور یہی قرین قیاس ہے یہاں آپ کا پہلا کام مسجد کا تعمیر کرانا تھا۔ حضرت کلثومؓ کی ایک افتادہ زمین تھی جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں، یہیں دستِ مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی۔ یہی مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ہے:۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۔ (توبہ۔۱۳)	وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے رہو اس میں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی بہت پسند ہے اور خدا صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپ خود بھی کام کرتے تھے۔ بھاری بھاری پتھروں کے اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا تھا، عقیدت مند آتے اور عرض کرتے۔ ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ چھوڑ دیں ہم اٹھا لیں گے، آپ اس کی درخواست قبول فرماتے، لیکن پھر اسی وزن کا دوسرا پتھر اٹھا لیتے۔[1]

حضرت عبداللہؓ بن رواحۃ شاعر تھے وہ بھی مزدوروں کے ساتھ شریک تھے اور جس طرح مزدور کام کرنے کے وقت تھکن مٹانے کو گاتے جاتے ہیں، وہ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے۔

اَفْلَحَ مَنْ يُّعَالِجُ الْمَسَاجِدَا	وہ کامیاب ہے جو مسجد تعمیر کرتا ہے۔
وَيَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ قَائِمًا وَّ قَاعِدًا	اور اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے۔
وَلَا يَبِيْتُ اللَّيْلَ عَنْهُ رَاقِدًا	اور رات کو جاگتا رہتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جاتے تھے۔[2]

قُبا میں اسلام کا داخلہ اسلام کے دورِ خاص کی ابتدا ہے اس لئے مورخین نے اس تاریخ کو زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔ اکثر مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ آٹھ ربیع الاول ۱۳ نبوی (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) تھی (محمد بن موسیٰ خوارزمی نے لکھا ہے کہ جمعرات کا دن اور فارسی ماہ تیر کی چوتھی تاریخ اور رومی ماہ ایلول ۹۳۳ اسکندری کی دسویں تاریخ تھی۔[3] مورخ یعقوبی نے ہیئت دانوں سے یہ زائچہ نقل کیا ہے۔

---

[1] ابن سعد تذکرہ کلثوم بن ہدم۔ [2] وفاء الوفا۔ بحوالہ طبرانی کبیر (ج ۱ ص ۱۸۰) [3] وفاء الوفا۔ بحوالہ ابن خیثمہ ج ۱ ص ۱۸۱ مصر۔
[4] عینی شرح بخاری جلد دوم صفحہ ۳۵۴ (عینی مطبوعہ قسطنطنیہ میں مطبع کی غلطی سے ۹۲۳ سہواً لکھا گیا ہے اس کو تسعمائۃ پڑھنا چاہیے، رومی ماہ ایلول کی دسویں کی بجائے جدید طریقہ حساب سے بیسویں ثابت ہوتی ہے، خوارزمی نے جمعہ کا دن بتایا ہے لیکن جدید حساب سے دوشنبہ کا دن آتا ہے۔

آفتاب	برج سرطان میں	۲۳ درجہ ۶ دقیقہ پر
زحل	برج اسد میں	۲ درجہ
مشتری	برج حوت میں	۶ درجہ
زہرہ	برج اسد میں	۱۳ درجہ
عطارد	برج اسد میں	۱۵ درجہ

چودہ دن کے بعد (جمعہ کو) آپؐ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے، راہ میں بنی سالم کے محلہ میں نماز کا وقت آگیا، جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی، نماز سے پہلے خطبہ دیا، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی نماز جمعہ اور سب سے پہلا خطبۂ نماز تھا، لوگوں کو جب تشریف آوری کی خبر معلوم ہوئی تو ہر طرف سے لوگ جوشِ مسرت سے پیش قدمی کے لئے دوڑے، آپ کے ننہالی رشتہ دار بنو نجار ہتھیار سج سج کر آئے۔ قبا سے مدینہ تک دو رویہ جاں نثاران کی صفیں تھیں، راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے، ہر قبیلہ سامنے آکر عرض کرتا حضور یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے، آپ منت کا اظہار فرماتے اور دعائے خیر دیتے، شہر قریب آگیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا۔ چاند نکل آیا ہے۔	مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ۔ کوہ وداع کی گھاٹیوں سے۔
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا۔ ہم پر خدا کا شکر واجب ہے۔	مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ۔ جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں۔

معصوم لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی تھیں۔

نَحْنُ جَوَارٍ مِّنْ بَنِي النَّجَّارِ	ہم خاندان نجار کی لڑکیاں ہیں۔
يَا حَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِّنْ جَارٍ	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اچھا ہمسایہ ہے۔

آپ نے ان لڑکیوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا، کیا تم مجھ کو چاہتی ہو؟ بولیں "ہاں" فرمایا کہ میں بھی تم کو چاہتا ہوں۔

جہاں اب مسجد نبوی ہے اس سے متصل حضرت ابوایوب انصاریؓ کا گھر تھا کوکبۂ نبوی یہاں پہنچا، سخت کشمکش تھی کہ آپ کی میزبانی کا شرف، کس کو حاصل ہو؟ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت حضرت ابوایوبؓ کے حصہ میں آئی

لہ خوارزمی کے حساب کے مطابق روزِ ورود (جمعرات ۸) لیا جائے تو ۱۴ دن کے بعد جمعہ ہوگا۔ لہ یہ واقعہ بخاری کے متعدد ابواب مسجد، ہجرت وغیرہ میں مذکور ہے لہ وفا۔ الوفا۔ جلد اول صفحہ ۱۸۰ ان پہلے اشعار کے متعلق زرقانی میں نہایت محققانہ محدثانہ بحث کی ہے اور ابن قیم کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ ثنیۃ الوداع شام کی طرف ہے نہ کہ مکہ کی طرف۔ مواہب میں لکھا ہے کہ یہ اشعار طوانی نے شیخین کی شرط پر روایت کئے ہیں، بخاری میں بھی یہ اشعار منقول ہیں مگر غزوہ تبوک کے موقع پر، لیکن ان دونوں روایتوں میں کچھ تناقض نہیں ممکن ہے دونوں موقعوں پر یہ اشعار پڑھے گئے ہوں۔ لہ ابوایوبؓ کا نام خالد ہے، اصابہ فی احوال الصحابہ میں اسی نام سے ان کا ذکر کیا ہے اور وہیں یہ واقعہ لکھا ہے، اکثر سیر اور تواریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ چونکہ ہر شخص اپنے گھر میں اتارنے کی درخواست کرتا تھا، آپ نے فرمایا کہ میری ناقہ کو چھوڑ دو وہ خدا کی طرف سے مامور ہے، چنانچہ ناقہ حضرت ابوایوبؓ کے گھر کے سامنے جا کر بیٹھ

حضرت ابوایوبؓ کا مکان دو منزلہ تھا، انھوں نے بالائی منزل پیش کی، لیکن آپ نے زائرین کی آسانی کے لئے نیچے کا حصہ پسند فرمایا، ابوایوبؓ دونوں وقت آپ کی خدمت میں کھانا بھیجتے اور آپ جو چھوڑ دیتے ابوایوبؓ اور اُن کی زوجہ کے حصہ میں آتا، کھانے میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کا نشان پڑا ہوتا، ابوایوبؓ تبرکاً وہیں انگلیاں ڈالتے۔

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا، اندیشہ ہوا کہ پانی نیچے جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو، گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا، حضرت ابوایوبؓ نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات مہینے تک یہیں قیام فرمایا، اس اثنا میں جب مسجد نبویؐ اور آس پاس کے حجرے تیار ہو گئے تو آپؐ نے نقل مکان فرمایا، تفصیل آگے آتی ہے۔

مدینہ میں آکر آپ نے حضرت زیدؓ (اور اپنے غلام ابو رافع) کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دے کر بھیجا کہ مکہ جا کر صاحبزادیوں اور حرم نبویؐ کو لے آئیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہؓ کو لکھا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر چلے آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں سے حضرت رقیہؓ حضرت عثمانؓ کے ساتھ حبش میں تھیں، حضرت زینبؓ کو ان کے شوہر نے آنے نہ دیا، زیدؓ صرف حضرت فاطمہ زہراؓ اور حضرت ام کلثومؓ (اور حضرت سودہؓ زوجہ محترم نبوی) کو لے کر آئے، حضرت عائشہؓ اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ آئیں۔

مسجد نبویؐ اور ازواج مطہراتؓ کے حجروں کی تعمیر

مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلا کام ایک خانۂ خدا کی تعمیر تھی، اب تک یہ معمول تھا کہ مویشی خانہ میں (یا جہاں موقع ملتا تھا) آپ نماز پڑھا کرتے تھے۔ دولت کدہ کے قریب خاندان نجار کی زمین تھی جس پر کچھ قبریں تھیں، کچھ کھجور کے درخت تھے، آپ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا "میں یہ زمین بقیمت لینا چاہتا ہوں"، وہ بولے کہ ہم قیمت لیں گے، لیکن آپ سے نہیں بلکہ خدا سے۔ چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی، آپ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا، ان یتیم بچوں نے بھی اپنی کائنات نذر کرنی چاہی لیکن آپ نے گوارا نہ کیا، حضرت ابوایوبؓ نے قیمت ادا کی۔ قبریں اکھڑوا کر زمین ہموار کر دی گئی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، شہنشاہِ دو عالم پھر مزدوروں کے لباس میں تھے، صحابہ پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُن کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) گیا، اس لئے آپ نے انہی کے گھر پر قیام فرمایا لیکن صحیح مسلم باب الہجرۃ میں ہے کہ جب لوگوں میں آپ کی میزبانی کے متعلق جھگڑا ہوا تو آپ نے کہا میں بنو نجار کے ہاں اتروں گا جو عبدالمطلب کے ماموں تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمداً ایسا کیا تھا، حضرت ابوایوبؓ اسی خاندان سے تھے۔ امام بخاری نے تاریخ صغیر میں تصریح کی ہے کہ ابوایوبؓ کے گھر اترنا اسی قرابت کی وجہ سے تھا۔ لہ اصابہ ذکر ابوایوبؓ اور زرقانی بحوالہ قاضی ابو یوسف، حاکم دوفاء الوفا۔ لہ ابن سعد جزء نساء صفحہ ۴۲

لہ ابوداود باب بناء المسجد۔

ساتھ آواز ملاتے اور فرماتے۔[1]

اللھم لا خیر الا خیر الاخرۃ	اے خدا! کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے۔
فاغفر الانصار والمھاجرۃ	اے خدا مہاجرین اور انصار کو بخش دے۔

یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی، یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، برگ خرما کا چھپر کھجور کے ستون تھے، قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا، لیکن جب قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہو گیا تو شمالی جانب ایک نیا دروازہ قائم کر دیا گیا، فرش چونکہ بالکل خام تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی، ایک دفعہ صحابہ نماز کے لئے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی نشست گاہ پر بچھا لیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوا دیا۔

مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقف چبوترہ تھا جو صفہ کہلاتا تھا، یہ ان لوگوں کے لئے تھا جو اسلام لاتے تھے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے۔

مسجد نبوی جب تعمیر ہو چکی تو مسجد سے متصل ہی آپ نے ازواج مطہراتؓ کے لئے مکان بنوائے اس وقت تک حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ عقد نکاح میں آ چکی تھیں، اس لئے دو ہی حجرے بنے جب اور ازواج آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے۔ یہ مکانات کچی اینٹوں کے تھے، ان میں سے پانچ کھجور کی ٹٹیوں سے بنے تھے، جو حجرے اینٹوں کے تھے، ان کے اندرونی حجرے بھی ٹٹیوں کے تھے، ترتیب یہ تھی کہ حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت زینبؓ بنت جحش کے مکانات شامی جانب تھے اور حضرت عائشہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت سودہؓ مقابل جانب تھیں۔ یہ مکانات مسجد سے اس قدر متصل تھے کہ جب آپ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے تو مسجد سے سر نکال دیتے اور ازواج مطہراتؓ گھر میں بیٹھے بیٹھے آپ کے بال دھو دیتی تھیں۔

یہ مکانات چھ چھ، سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لانبے تھے، چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا، دروازوں پر کمبل کا پردہ پڑا رہتا تھا۔[2] راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے۔[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ میں جو انصار رہتے تھے ان میں حضرت سعدؓ بن عبادہ، حضرت سعدؓ بن معاذ، حضرت عمارہؓ بن حزم اور حضرت ابو ایوبؓ، رئیس اور دولت مند تھے۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دودھ بھیج دیا کرتے تھے اور اسی پر آپ بسر فرماتے تھے، حضرت سعدؓ بن عبادہ نے التزام کر لیا تھا کہ رات کے کھانے پر ہمیشہ اپنے ہاں سے ایک بڑا بادیہ بھیجا کرتے تھے، جن میں کبھی سالن کبھی

---

[1] بخاری باب المساجد و باب الہجرۃ و حج و باب البیوع و عینی شرح بخاری ج ۴ صفحہ ۲۰۳ و زرقانی۔ [2] طبقات ابن سعد، سیرت نبوی صفحہ ۱۶۹ و منازل نبوی کا حال طبقات ابن سعد جزء ۸ صفحہ ۱۱۸ و وفاء الوفا میں تفصیلاً ہے۔ [3] بخاری باب صلوۃ علی الفراش۔

دودھ، کبھی گھی ہوتا تھا۔ حضرت انسؓ کی ماں حضرت ام انسؓ نے اپنی جائیداد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما کر اپنی دایہ حضرت ام ایمنؓ کو دے دیا اور خود فقر و فاقہ اختیار فرمایا۔

اذان کی ابتداء

اسلام کے تمام عبادات کا اصلی مرکز وحدت و اجتماع ہے، اس وقت تک کسی خاص علامت کے نہ ہونے کی وجہ سے نماز جماعت کا کوئی انتظام نہ تھا، لوگ وقت کا اندازہ کر کے آتے تھے اور نماز پڑھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہ تھا، آپ نے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کر دیئے جائیں، جو وقت پر لوگوں کو گھروں سے بلا لائیں، لیکن اس میں زحمت تھی، صحابہؓ کو بلا کر مشورہ کیا، لوگوں نے مختلف رائے دیں کسی نے کہا نماز کے وقت مسجد میں ایک علم کھڑا کر دیا جائے، لوگ دیکھ دیکھ کر آتے جائیں گے، آپ نے یہ طریقہ ناپسند فرمایا، عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں اعلان نماز کے جو طریقے ہیں وہ بھی آپ کی خدمت میں عرض کئے گئے، لیکن آپ نے حضرت عمرؓ کی رائے پسند کی اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ اذان دیں۔ اس سے ایک طرف تو نماز کی اطلاع عام ہو جاتی تھی اور دوسری طرف دن میں پانچ دفعہ دعوت اسلام کا اعلان ہو جاتا تھا۔

صحاح ستہ کی بعض کتابوں میں ہے کہ اذان کی تجویز عبداللہ بن زیدؓ نے پیش کی تھی جو انہوں نے خواب میں دیکھی تھی، ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی خواب میں توارد ہوا، لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مقابلہ میں کسی اور روایت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

بخاری میں صرف تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بوق اور ناقوس کی تجویزیں پیش کی گئیں، لیکن حضرت عمرؓ نے اذان کی تجویز پیش کی اور آپ نے اس کے موافق حضرت بلالؓ کو بلا کر اذان کا حکم دیا خواب کا ذکر نہیں۔

مواخاۃ

مہاجرین مکہ معظمہ سے بے سر و سامان آئے تھے، گو ان میں دولت مند اور خوشحال بھی تھے لیکن کافروں سے چھپ کر نکلے تھے اس لئے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے۔

اگرچہ مہاجرین کے لئے انصار کا گھر مہمان خانہ عام تھا تاہم ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی، مہاجرین نذر اور

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۸ کتاب النساء صفحہ ۱۱۶۔ [2] صحیح بخاری صفحہ ۲۰۵ باب فضل المنیحۃ۔ [3] ابو داؤد باب بدء الاذان و بخاری باب الاذان، بخاری میں زید کے واقعہ کا ذکر نہیں۔ [4] یہ روایت صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم، نسائی اور ترمذی میں بھی ہے لیکن تمام روایات کو اور علماء کی تحقیقات کو سامنے رکھنے سے مسئلہ کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے دوسرے لوگوں کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے یہ پیش کی تھی جیسا کہ بخاری والی روایت میں ہے کہ اولا تبعثون رجلا ینادی بالصلوۃ کہ ایک آدمی بھیجا جائے جو پکار کر نماز کا اعلان کر دے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور الصلوۃ جامعۃ کے لفظ سے اس کا اعلان کر دیا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اور بعض دوسرے صحابہ نے بھی خواب میں اذان کے مروجہ الفاظ کے ساتھ اذان کو خواب میں دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر قبول فرمایا اور اسی کے مطابق اذان مروجہ جاری فرمائی گئی۔ فتح الباری و نووی و زرقانی و روض الانف باب بدء الاذان میں یہ تفصیلات بکو روسنہ مذکور ہیں۔

خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ دست و بازو سے کام لینے کے خوگر تھے، تاہم چونکہ بالکل بکھرے تھے اور ایک حبہ تک پاس نہ تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ انصار اور ان میں رشتۂ اخوت قائم کر دیا جائے جب مسجد کی تعمیر قریب ختم ہوئی تو آپ نے انصار کو طلب فرمایا حضرت انسؓ بن مالک جو اس وقت دس سالہ تھے، ان کے مکان میں لوگ جمع ہوئے۔ مہاجرین کی تعداد پینتالیس تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا کہ یہ تمہارے بھائی ہیں، پھر مہاجرین اور انصار سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو اور اب وہ درحقیقت بھائی بھائی تھے، انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے سعدؓ بن ربیع جو عبدالرحمنؓ بن عوف کے بھائی قرار پائے اُن کی دو بیویاں تھیں، عبدالرحمنؓ سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں آپ اس سے نکاح کر لیجئے لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کیا۔

انصار کا مال و دولت جو کچھ تھا نخلستان تھے، روپے پیسے تو اس زمانے میں تھے نہیں، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ باغ ہمارے بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیئے جائیں، مہاجرین تجارت پیشہ تھے اور اس وجہ سے کھیتی کے فن سے بالکل ناآشنا تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف سے انکار کیا انصار نے کہا سب کاروبار ہم خود انجام دے لیں گے، جو کچھ پیداوار ہو گی اس میں سے نصف حصہ مہاجرین کا ہو گا، مہاجرین نے اس کو منظور کیا۔

یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا، کوئی انصاری مرتا تھا تو اس کی جائیداد اور مال مہاجر کو ملتا تھا اور بھائی بند محروم رہتے، یہ اس فرمانِ الٰہی کی تعمیل تھی:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (انفال)	جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور خدا کی راہ میں مال و جان سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے ان لوگوں کو پناہ دی اور ان کی مدد کی یہ لوگ باہم بھائی بھائی ہیں۔

جنگ بدر کے بعد جب مہاجرین کو اعانت کی ضرورت نہ رہی تو یہ آیت اتری۔

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ (انفال-۱۰)	ارباب قرابت ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔

اُس وقت سے یہ قاعدہ جاتا رہا، چنانچہ کتب تفسیر و حدیث میں بتصریح مذکور ہے۔

سنہ ۴ھ میں بنو نضیر جب جلاوطن ہوئے اور اُن کی زمین اور نخلستان قبضہ میں آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ مہاجرین نادار ہیں، اگر تمہاری مرضی ہو تو یہ نئے مقبوضات تنہا ان کو دے دیئے جائیں اور تم اپنے نخلستان واپس لے لو۔ انصار نے عرض کی کہ نہیں ہمارے نخلستان بھائیوں ہی کے قبضہ میں رہنے دیجئے اور نئے بھی انہی کو عنایت فرمایئے۔

لہ مواخاۃ کا ذکر اور ایک ایک کا نام ابن ہشام صفحہ ۱۷۵ میں ہے۔ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کا واقعہ صحیح بخاری کتاب المناقب باب اخاء النبی میں ہے۔ سے صحیح بخاری صفحہ ۳۱۳ سے صحیح بخاری صفحہ ۳۱۰ سے صحیح بخاری کتاب التفسیر آیہ واولوا الارحام بعضھم اولٰی ببعض۔ ۵ فتوح البلدان مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۰۔

دنیا انصار کے اس ایثار پر ہمیشہ ناز کرے گی۔ لیکن یہ بھی دیکھو کہ مہاجرین نے کیا کیا؟ حضرت سعد بن الربیع نے جب حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کو ایک ایک چیز کا جائزہ دے کر نصف لے لینے کی درخواست کی تو انہوں نے کہا، خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے، مجھ کو صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے، انہوں نے قینقاع کا جو مشہور بازار تھا جا کر راستہ بتا دیا، انہوں نے کچھ گھی کچھ پنیر خریدا اور شام تک خرید و فروخت کی، چند روز میں اتنا سرمایہ ہو گیا کہ شادی کر لی، رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو یہ ترقی ہوئی کہ خود ان کا قول تھا کہ خاک پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے، ان کا اسباب تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جس دن مدینہ میں پہنچتا تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔

بعض صحابہ نے دکانیں کھول لیں حضرت ابوبکرؓ کا کارخانہ سنخ میں تھا جہاں وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے حضرت عثمانؓ بنو قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ بھی تجارت میں مشغول ہو گئے تھے، اور شاید ان کی اس تجارت کو وسعت ایران تک پہنچ گئی تھی۔ اور صحابہؓ نے بھی اسی قسم کی چھوٹی بڑی تجارت شروع کر دی تھی، صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ پر لوگوں نے جب کثرت روایت کی بنا پر اعتراض کیا کہ اور صحابہؓ تو اس قدر روایت نہیں کرتے تو انہوں نے کہا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اور لوگ بازار میں تجارت کرتے تھے اور میں رات دن بارگاہ نبوت میں حاضر رہتا تھا، پھر جب خیبر فتح ہوا تو تمام مہاجرین نے یہ نخلستان انصار کو واپس کر دیئے۔ صحیح مسلم باب الجہاد میں ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما فرغ من قتال اهل خیبر وانصرف الی المدینۃ ردّ المهاجرون الی الانصار منائحهم التی کانوا منحوهم من ثمارهم۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگ خیبر سے فارغ ہوئے اور مدینہ واپس آئے تو مہاجرین نے انصار کے عطیے جو نخلستان کی صورت میں تھے واپس کر دیئے۔

مہاجرین کے لئے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھروں کے آس پاس جو افتادہ زمینیں تھیں اُن کو دے دیں اور جن کے پاس زمین نہ تھی انہوں نے اپنے مسکونہ مکانات دے دیئے۔ سب سے پہلے حضرت حارثہ بن نعمان نے اپنی زمین پیش کی، بنو زہرہ مسجد نبوی کے عقب میں آباد ہوئے۔ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے یہاں ایک قلعہ (جس کو گڑھی کہنا زیادہ موزوں ہو گا) بنوایا۔ حضرت زبیر بن العوام کو ایک وسیع زمین ہاتھ آئی حضرت عثمانؓ، حضرت مقدادؓ، حضرت عبیدؓ کو انصار نے اپنے مکانات کے پہلو میں زمینیں دیں، مواخاۃ کے رشتے سے جو لوگ آپس میں بھائی بھائی تھے، ان میں سے بعض حضرات کے نام یہ ہیں۔

لہ صحیح بخاری میں دو مختلف موقعوں پر یہ واقعہ مذکور ہے (کتاب البیوع و باب کیف آخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم باب اخاء النبی بین المهاجرین والانصار، باب الولیمہ، ولو بشاۃ) سے اسد الغابہ ج ۳ صفحہ ۳۱۳ و صفحہ ۳۱۵ وغیرہ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ سے ابن سعد ج ۳ صفحہ ۱۳ سے مسند امام حنبل ج ۱ صفحہ ۶۲ ۵ مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۴ سے ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۳۴۷ سے یہ پوری تفصیل معجم البلدان مدینہ منورہ کے ذکر میں ہے ۵ یہ تفصیل ابن ہشام صفحہ ۱۰۹ میں ہے۔

مہاجرین	انصار
حضرت ابوبکرؓ	حضرت خارجہؓ بن زید انصاری
حضرت عمرؓ	حضرت عتبانؓ بن مالک انصاری
حضرت عثمانؓ	حضرت اوسؓ بن ثابت انصاری
حضرت ابوعبیدہ جراحؓ	حضرت سعدؓ بن معاذ انصاری
حضرت زبیرؓ بن العوام	حضرت سلامہؓ بن وقش
حضرت مصعبؓ بن عمیر	حضرت ابوایوبؓ انصاری
حضرت عمارؓ بن یاسر	حضرت حذیفہؓ بن یمان
حضرت ابوذر غفاریؓ	حضرت منذرؓ بن عمرو
حضرت سلمان فارسیؓ	حضرت ابودرداؓ
حضرت بلالؓ	حضرت ابورویحہؓ
حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ	حضرت عبادؓ بن بشر
حضرت سعیدؓ بن زید بن عمرو بن نفیل	حضرت ابیؓ بن کعب

مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لئے قائم کیا گیا کہ بے خانماں مہاجرین کا چندروزہ انتظام ہو جائے، لیکن درحقیقت یہ عظیم الشان اغراض اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا۔

اسلام تہذیب اخلاق و تکمیل فضائل کی شہنشاہی ہے، اسی سلطنت الٰہی کے لئے وزراء، ارباب تدبیر، سپہ سالاران لشکر، ہر قابلیت کے لوگ درکار ہیں، شرف صحبت کی برکت سے مہاجرین میں ان قابلیتوں کا ایک گروہ تیار ہو چکا تھا اور ان میں یہ وصف پیدا ہو چکا تھا کہ ان کی درس گاہ تربیت سے اور ارباب استعداد بھی تربیت پا کر نکلیں، اس بنا پر جن لوگوں میں رشتہ اخوت قائم کیا گیا ان میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد میں وہ اتحاد مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لئے ضرور ہے، تفحص اور استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا، دونوں میں یہ اتحاد مذاق ملحوظ رکھا گیا اور جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت میں سینکڑوں اشخاص کی طبیعت اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا قریباً ناممکن ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ شان نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔

حضرت سعیدؓ بن زید عشرۂ مبشرہ میں ہیں، ان کے والد زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ملت ابراہیم کے پیرو ہو چکے تھے اور گویا اسلام کے مقدمۃ الجیش تھے، حضرت سعیدؓ نے انہی کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی اس لئے اسلام کا نام سننے کے ساتھ ہی انھوں نے لبیک کہا، ان کی ماں بھی ان کے ساتھ یا ان سے پہلے اسلام لائیں، حضرت عمرؓ انہی کے گھر میں اور ان ہی کی ترغیب سے اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے۔ ... وفضل کے لحاظ سے فضلائے صحابہ میں تھے، ان کی اخوت حضرت ابیؓ بن کعب سے قائم کی گئی، جنھوں نے یہ ... حاصل کیا کہ حضرت عمرؓ ان کو سید المسلمین کہتے تھے، بارگاہ نبوت میں منصب انشا پر سب سے پہلے وہی ممتاز ہوئے

فن قرأت کے وہ امام تسلیم کئے جاتے ہیں[1]۔

حضرت ابوحذیفہؓ عتبہ بن ربیعہ کے فرزند تھے جو قریش کا رئیس اعظم تھا، اس مناسبت سے ان کو حضرت عبادؓ بن بشر کا بھائی بنایا گیا جو قبیلۂ اشہل کے سردار تھے۔

حضرت ابوعبیدہؓ جراح جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امین الامۃ کا خطاب دیا تھا، ایک طرف تو فاتح شام ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، دوسری طرف اسلام کے مقابلہ میں پدری اور فرزندی کے جذبات ان پر کچھ اثر نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ غزوۂ بدر میں جب ان کے باپ ان کے مقابلہ میں آئے تو انھوں نے پہلے حقوق ابوت کی مراعات کی، لیکن بالآخر اسلام پر باپ کو قربان کر دینا پڑا، ان کی تربیت میں حضرت سعدؓ بن معاذ دیئے گئے جو قبیلۂ اوس کے رئیس اعظم تھے، ان میں بھی ایثار کا یہ وصف نمایاں طور پر نظر آتا ہے، بنو قریظہ ان کے حلیف تھے اور عرب میں حلیف کا رشتہ اخوت اور ابوت کے برابر ہوتا تھا، تاہم بنو قریظہ میں جب اسلام کا مقابلہ پیش آیا تو انھوں نے اپنے چار سو حلیفوں کو اسلام پر نثار کر دیا۔

حضرت بلالؓ اور حضرت ابورویحہؓ، حضرت سلمانؓ فارسی اور حضرت ابودرداؓ، حضرت عمارؓ بن یاسر اور حضرت حذیفہؓ بن یمان، حضرت مصعبؓ اور حضرت ابوایوبؓ میں وہ وحدت موجود تھی جس کی بدولت نہ صرف شاگرد بلکہ استاد بھی شاگرد سے اثر پذیر ہو سکتا تھا، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف مدینہ میں آئے تو بنیر سر پر رکھ کر پہنچے تھے، حضرت سعدؓ بن الربیع کی صحبت میں جو امیر الامراء تھے دولت اور امارت کے جس درجہ پر پہنچے ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔

انصار نے مہاجرین کی مہمانی اور ہمدردی کا جو حق ادا کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں، انھوں نے عرض کی کہ پہلے ہمارے بھائی مہاجروں کو اتنی ہی زمین عنایت فرمایئے، تب ہم لینا منظور کریں گے[2]۔

ایک دفعہ ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کہ سخت بھوکا ہوں، آپ نے گھر میں دریافت فرمایا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب آیا کہ صرف پانی، آپ نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کوئی ہے جو ان کو آج اپنا مہمان بنائے، حضرت ابوطلحہؓ نے عرض کی "میں حاضر ہوں"، غرض وہ اپنے گھر لے گئے لیکن وہاں بھی برکت تھی، بیوی نے کہا صرف بچوں کا کھانا موجود ہے، انھوں نے بیوی سے کہا چراغ بجھا دو اور وہی کھانا مہمان کے سامنے لا کر رکھ دو، تینوں ساتھ کھانے پر بیٹھے، میاں بیوی بھوکے بیٹھے رہے اور اس طرح ہاتھ چلاتے رہے کہ گویا کھا رہے ہیں، اسی واقعہ کے بارے میں یہ آیت اتری ہے[3]۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر) اور گو ان کو خود تنگی ہو تاہم اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

صفہ اور اصحاب صفہ

اصحاب صفہ اسلامی لغت کا ایک متداول لفظ ہے، گو اس کی حقیقت سے لوگ اچھی طرح واقف نہیں۔

"صفہ" سائبان کو کہتے ہیں، یہ ایک سائبان تھا جو مسجد نبویؐ کے ایک کنارہ پر مسجد سے ملا ہوا تیار کیا گیا تھا، جس

---

[1] اصابہ ذکر ابی بن کعب [2] صحیح بخاری فضائل انصار [3] صحیح بخاری و فتح الباری فضائل انصار

میں سے اکثر تو مشاغل دینی کے ساتھ ہر قسم کے کاروبار یعنی تجارت یا زراعت وغیرہ بھی کرتے تھے لیکن چند لوگوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت پذیری پر نذر کر دی تھی، ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل آتے تھے۔ ان میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لئے کچھ کھانا مہیا کرتی۔

یہ لوگ دن کو بارگاہ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑ رہتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ بھی انہی لوگوں میں تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہمد دونوں چیزیں کبھی ساتھ مہیا نہ ہو سکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی، اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور چھت میں لگا دیتے کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتیں یہ اٹھا کر کھا لیتے، کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا، اکثر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے، یہ لوگ آکر شریک نماز ہوتے لیکن بھوک اور ضعف سے عین نماز کی حالت میں گر پڑتے۔ باہر کے لوگ آتے اور ان کو دیکھتے تو سمجھتے کہ دیوانے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کہیں سے صدقہ کا کھانا آتا تو مستقلاً ان کے پاس بھیج دیتے اور جب دعوت کا کھانا آتا تو ان کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے، اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے، یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے۔

حضرت سعدؓ بن عبادہ نہایت فیاض اور دولت مند تھے، وہ کبھی کبھی اسی اسی مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت فاطمہ زہراؓ نے درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے نیل پڑ گئے ہیں، مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو تو فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور صفہ والے بھوکے رہیں۔ راتوں کو عموماً یہ لوگ عبادت کرتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے۔ ان کے لئے ایک معلم مقرر تھا اس کے ساتھ جا کر پڑھتے۔ اسی بنا پر ان میں سے اکثر قاری کہلاتے تھے، دعوت اسلام کے لئے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے تھے، غزوہ معونہ میں انہی میں سے ستر آدمی اسلام سکھلانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

ان کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی، کل مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی، لیکن کبھی ایک زمانہ میں اس قدر تعداد نہیں ہوئی، نہ صفہ میں اس قدر گنجائش تھی۔ ان لوگوں کا مفصل حال ابن الاعرابی احمد بن محمد البصری المتوفی ۳۴۰ھ جو ابن مندہ کے استاد تھے، نے ایک الگ تصنیف میں لکھا ہے، سلمی نے بھی ان کے حالات میں ایک الگ کتاب لکھی ہے۔

مدینہ کے یہود اور ان سے معاہدہ

مورخین عرب کا بیان ہے کہ مدینہ کے یہود نسلاً یہودی تھے اور اس تقریب سے عرب میں آئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو عمالقہ

---

[1] جامع ترمذی باب معیشۃ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] زرقانی ج ۱ صفحہ ۹ مصر ذکر اصحاب صفہ و مسجد نبوی [3] زرقانی ج ۱ صفحہ ۴۹ مصر، ذکر اصحاب صفہ [4] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۳۰ [5] حافظ سیوطی نے دو صفحہ کا ایک رسالہ اصحاب صفہ کے نام سے لکھا ہے اس رسالہ میں سو آدمیوں کے نام بہ ترتیب ہجا مذکور ہیں [6] اصحاب صفہ کے حال بخاری باب المغازی وغیرہ اور صحیح مسلم میں جستہ جستہ مذکور ہیں۔ زرقانی نے ادرکتابوں سے کر اضافہ کیا ہے، میں نے یہ واقعات بخاری و مسلم کے علاوہ زرقانی جلد کے حوالہ سے لکھے ہیں نیز مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۳۰ میں بھی ہیں۔

کے مقابلہ کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن تاریخی قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، یہود گو تمام دنیا میں پھیلے لیکن انہوں نے اپنے نام کہیں نہیں بدلے۔ آج بھی وہ جہاں ہیں اسرائیلی نام رکھتے ہیں، بخلاف اس کے عرب کے یہودیوں کے نام نضیر، قینقاع، مرحب، حارث وغیرہ ہوتے تھے، جو خالص عربی نام ہیں، یہود عموماً بزدل اور دنی الطبع ہوتے ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے لڑنے کے لئے کہا تو بولے۔

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (مائدہ ۱)

تم اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔

بخلاف اس کے مدینہ کے یہود نہایت دلیر، شجاع اور بہادر تھے۔ ان قرائن عقلی کے علاوہ ایک بڑے مورخ (یعقوبی) نے صاف تصریح کی ہے کہ قریظہ اور نضیر عرب تھے جو یہودی بن گئے تھے۔

ثم كانت وقعة بني النضير وهم فخذ من جذام الا انهم تهودوا وكذلك قريظة

پھر بنو نضیر کا معرکہ ہوا، یہ قبیلہ جذام کا ایک خاندان تھا لیکن یہودی ہو گیا تھا اور اسی طرح قریظہ بھی۔

مورخ مسعودی نے بھی کتاب الاشراف والتنبیہ میں ایک روایت لکھی ہے کہ یہ جذام کے قبیلے تھے، کسی زمانہ میں عمالقہ سے اور ان کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لاتے اور شام سے نقل مکان کر کے حجاز چلے آئے۔ یہ تین قبیلے تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور قریظہ، مدینہ کے اطراف میں آباد تھے اور مضبوط برج اور قلعے بنا لئے تھے۔

انصار کے جو دو قبیلے تھے یعنی اوس اور خزرج۔ ان میں باہم جو اخیر معرکہ ہوا تھا (جنگ بعاث) اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا، یہود اس مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے کہ انصار باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں۔

ان اسباب کی بنا پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں۔ آپ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو دونوں فریق نے منظور کیا۔ یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا، اب بھی قائم رہے گا۔

۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

۴۔ یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

۵۔ کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔

۶۔ مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق شریک یکدگر ہوں گے۔

---

[1] مسٹر مرگولیوس نے یہود کے متعلق تفصیل سے محققانہ بحث کی ہے، ان کا میلان رائے یہ ہے اور غالباً صحیح ہے کہ یہودیوں کی اس بڑی آبادی میں ایک دو خاندان اصل یہود بھی تھے، عرب جو یہودی ہوتے گئے وہ بھی ان میں شامل ہوتے گئے [2] یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۴۹ [3] مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۴۷۔

۷۔ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریکِ صلح ہوگا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔

واقعاتِ متفرقہ اس سال انصار میں سے دو نہایت معزز شخصوں نے جو مقربینِ خاص میں تھے، وفات پائی حضرت کلثوم بن ہدم اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ، کلثومؓ وہ شخص ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قباء میں تشریف لائے تو انہی کے مکان میں ٹھہرے، اکثر بڑے بڑے صحابہؓ بھی انہی کے گھر اترے تھے حضرت اسعدؓ بن زرارہ اُن چھ شخصوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ابن سعد کی روایت کے موافق ان چھ شخصوں میں جس نے سب سے پہلے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا یہی اسعدؓ تھے۔ یہ فخر بھی انہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہی نے مدینہ میں آکر جمعہ کی نماز قائم کی۔

چونکہ یہ قبیلہ بنی نجار کے نقیب تھے اس لئے ان کی وفات کے بعد اس قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اُن کے بجائے کوئی شخص اس منصب پر مقرر کیا جائے۔ چونکہ یہ احتمال تھا کہ کوئی شخص مقرر ہوگا، تو اوروں کو رشک ہوگا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں خود تمہارا نقیب ہوں" چونکہ آپ کی ننہال اسی قبیلہ میں تھی اس لئے اور قبائل کو رشک اور منافست کا موقع نہ ملا۔

حضرت اسعدؓ کی وفات کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت صدمہ ہوا۔ منافقین اور یہود نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر پیغمبر ہوتے تو ان کو یہ صدمہ کیوں پہنچتا۔ آپ نے سُنا تو فرمایا۔

لا املک لنفسی ولا لصاحبی من اللہ شیئا (طبری ص۱۲۶۱)	میں اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے خدا کے ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ عین اُسی زمانہ میں دو بڑے رئیسانِ کفر نے بھی وفات پائی۔ یعنی ولید بن المغیرۃ جو حضرت خالدؓ کا باپ تھا اور عاص بن وائل سہمی جس کے بیٹے حضرت عمروؓ بن عاص ہیں جو فاتح مصر اور حضرت امیر معاویہؓ کے وزیر اعظم تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت عبداللہؓ بن زبیر کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد حضرت زبیرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی تھے اور ان کی والدہ (حضرت اسماءؓ) حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی اور حضرت عائشہؓ کی بہن تھیں، اب تک مہاجرین میں سے کسی کے اولاد نہیں ہوئی تھی اس لئے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ یہودیوں نے جادو کر دیا ہے، حضرت عبداللہ بن زبیر پیدا ہوتے تو مہاجرین نے خوشی کا نعرہ مارا۔

اب تک نمازوں میں صرف دو رکعتیں تھیں، اب ظہر و عصر و عشاء میں چار چار ہو گئیں۔ لیکن سفر کے لئے اب بھی وہی دو رکعتیں قائم رہیں۔

☆

ل طبری ص ۱۲۶۱، ۱۲۶۲

۲ ھ

تحویلِ قبلہ و آغازِ غزوات

(اس سال سے اسلام کی زندگی میں دو عظیم الشان واقعات پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اسلام اپنے لئے ایک خاص قبلہ قرار دیتا ہے جو اب ۴۵ کروڑ قلوب کا مرکز ہے، دوسرا یہ کہ دشمنانِ اسلام اب مخالفت کے لئے تلوار اٹھاتے ہیں اور مسلمان اس کی مدافعت کے لئے تیار ہوتے ہیں)

تحویلِ قبلہ، شعبان ۲ھ ہر گروہ، ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے ایک خاص امتیازی شعار ہوتا ہے جس کے بغیر اس قوم کی مستقل ہستی قائم نہیں ہو سکتی، اسلام نے یہ شعار قبلۂ نماز قرار دیا جو اصل مقصد کے علاوہ اور بہت سے حِکم و اسرار کا جامع ہے۔ اسلام کا خاص نمایاں وصف مساواتِ عام جمہوریت اور توحیدِ جنس ہے، یعنی تمام مسلمان یکساں اور متحد الجہۃ نظر آئیں۔ مذہب اسلام کا رکن اعظم نماز ہے جس سے ہر روز پانچ وقت کام پڑتا ہے۔ نماز کی اصلی صورت یہ ہے کہ جمعیت اور افرادِ کثیر کے ساتھ ادا کی جائے۔ لیکن اس طرح کہ ہزاروں لاکھوں اشخاص کی منفرد ہستیاں مٹ کر ایک ہستی بن جائے۔ اسی بناء پر نمازِ جماعت میں ایک امام ہوتا ہے کہ مقتدیوں کی ایک ایک حرکت اُس کے اشاروں سے وابستہ ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ سب کا موضعِ عمل بھی ایک نظر آئے۔ یہی اصول ہے جس کی بناء پر نماز کے لئے ایک قبلہ قرار پایا اور اس شعار کا دائرہ اس قدر وسیع کیا گیا کہ اس قبلہ کی طرف رُخ کرنا ہی کفر کے دائرہ سے نکل آنا ہے۔ اب صرف یہ بحث باقی تھی کہ قبلہ کس سمت قرار دیا جائے۔ یہودی اور عیسائی بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے تھے، کیونکہ اُن کی قومی اور مذہبی ہستی بیت المقدس سے وابستہ تھی، لیکن ابراہیمؑ بت شکن کے جانشین کے لئے صرف کعبہ قبلہ ہو سکتا تھا جو اس موحدِ اعظم کی یادگار اور توحیدِ خالص کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں تھے دو مزورتیں ایک ساتھ درپیش تھیں۔ ملتِ ابراہیمی کی تاسیس و تجدید کے لحاظ سے کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ مشکل تھی کہ قبلہ کی جو اصلی غرض ہے یعنی امتیاز اور اختصاص، وہ نہیں حاصل ہوتی تھی، کیونکہ مشرکین اور کفار بھی کعبہ ہی کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقام ابراہیم کے سامنے نماز ادا کرتے تھے جس کا رُخ بیت المقدس کی طرف تھا۔ اس طرح دونوں قبلے سامنے آجاتے تھے۔ مدینہ میں دو گروہ آباد تھے۔ مشرکین جن کا قبلہ کعبہ تھا اور اہل کتاب جو بیت المقدس کی سمت نماز ادا کرتے تھے۔ شرک کے مقابلہ میں یہودیت اور نصرانیت دونوں کو ترجیح تھی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مدت یعنی تقریباً ۱۶ مہینے تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی لیکن جب مدینہ میں

اسلام زیادہ پھیل گیا تو اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اصل قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رُخ کیا جاتا، اس بناء پر یہ آیت اُتری اور دفعۃً قبلہ بدل گیا[1]

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (بقرہ-۱۸)

تو اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف پھیر دو اور جہاں کہیں رہو اسی طرف منہ پھیرو۔

تحویلِ قبلہ نے یہودیوں کو سخت برہم کر دیا، ان کو مشرکین کے مقابلہ میں مذہبی تفوق کا دعویٰ تھا اور اسلام سے پہلے مشرکین بھی اُن کے مذہبی امتیاز کے معترف تھے۔ یہاں تک کہ (جیسا ابوداؤد میں روایت ہے) جن لوگوں کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی وہ منتیں ملنتے تھے کہ بچہ زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنائیں گے اسلام نے ان کے اس مذہبی احساس کو صدمہ پہنچایا، تاہم چونکہ اب تک اسلام کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا اس لئے وہ فخر کرتے تھے کہ اسلام بھی انہی کے قبلہ کی طرف رُخ کرتا ہے۔ جب اسلام نے قبلہ بھی بدل دیا تو ان کی ناراضی اور برہمی کا پیالہ بالکل لبریز ہو گیا، انہوں نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چونکہ ہر بات میں ہماری مخالفت کرنا چاہتے ہیں اس لئے قبلہ بھی مخالفت کے ارادہ سے بدل دیا ہے۔ دودلے اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ قبلہ بدلنے کی چیز نہیں اور اس سے بے استقلالی اور تزلزلِ اعتقاد کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بناء پر قبلہ کی اصلیت اور ضرورت اور تحویلِ قبلہ کے مصالح کے متعلق چند آیتیں اتریں جن سے یہ مشکلیں حل ہوتی ہیں۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ (بقرہ-۱۷)

سفہاء یہ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا جو قبلہ تھا، اس سے ان کو کس نے پھیر دیا، کہہ دو کہ مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے۔ تیرا جو پہلے قبلہ تھا (کعبہ) اس کو جو ہم نے پھر قبلہ کر دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبر کا پیرو کون ہے اور پیچھے پھر جانے والا کون ہے؟ اور بے شبہ یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے بجز ان لوگوں کے جن کو خدا نے ہدایت کی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ

پورب پچھم رُخ کرنا ہی کوئی ثواب کی بات نہیں ثواب تو یہ ہے کہ آدمی خدا پر، قیامت پر، ملائکہ پر، خدا کی کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لائے

[1] اس مضمون میں جس قدر واقعات ہیں وہ صحیح بخاری (حدیث قبلہ نماز) اور فتح الباری شرح صحیح بخاری سے ماخوذ ہیں۔

وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ (بقرہ-۲۲)

اور خدا کی محبت میں عزیزوں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافروں کو، سائلوں کو، غلاموں کو (آزاد کرانے میں) اپنی دولت دے۔

ان آیتوں میں خدا نے پہلے یہ بتایا کہ قبلہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں، خدا کی عبادت کے لئے پورب پچھم سب برابر ہیں، خدا ہر جگہ ہے، ہر سمت ہے، ہر طرف ہے، پھر قبلہ کی تعیین کی ضرورت بتائی کہ وہ اختصاصی شعار ہے اور اصلی اور نمائشی مسلمانوں کو الگ کر دیتا ہے۔

بہت سے یہودی تھے جو منافقانہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ نماز میں بھی شرکت کرتے تھے۔ یہ اسلام کے لئے مارِ آستین تھے۔ لیکن جب قبلہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ سے بدل گیا تو نفاق کا راز بالکل فاش ہو گیا۔ کوئی یہودی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ جو چیز اس کی قومیت، مذہب بلکہ اس کی ہستی کی بنیاد ہے (یعنی بیت المقدس) اسی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے۔ پھر دوبارہ خدا نے اس نکتہ کو زیادہ واضح کر دیا کہ کسی خاص قبلہ کی طرف رُخ کرنا اصلی ثواب نہیں بلکہ ثواب درحقیقت ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نام ہے۔

★

سلسلۂ غزوات[1]

کیا عجیب بات ہے ارباب سیر مغازی کی داستان جس قدر زیادہ دراز نفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں، یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ داستان اور پھیلتی جائے کیونکہ اس کو اسلام کے جور و ستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے اس کے نقش و نگار کے لئے لہو کے چند قطرے نہیں بلکہ چشمہ ہائے خون درکار ہیں۔

یورپ کے تمام مورخوں نے سیرت نبوی کو اس انداز میں لکھا ہے کہ وہ لڑائیوں کا ایک مسلسل سلسلہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ زبردستی مسلمان بنائے جائیں۔ لیکن یہ خیال چونکہ واقع میں غلط اور سرتاپا غلط ہے اس لئے مغازی کی ابتدا سے پہلے ضرور ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کیا جائے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام جب تک مکہ میں تھا مصائب گوناگوں کا آماجگاہ تھا۔ مدینہ میں آ کر اس کی کلفتیں دور ہوئیں۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ مکہ میں جو مصیبت تھی گو سخت تھی لیکن تنہا اور منفرد تھی۔ مدینہ میں آ کر وہ متعدد اور گوناگوں بن گئی۔ مکہ کل ایک قوم تھا۔ مدینہ میں انصار کے ساتھ یہود بھی تھے جو عادات، خصائل، مذہب اور دیانت میں انصار سے بالکل مختلف اور ان کے حریف مقابل تھے۔ اس پر ایک تیسری قسم (منافقین) کا اضافہ ہوا جو مار آستین ہونے کی وجہ سے دونوں سے زیادہ خطرناک تھے۔ مکہ اگر قابو میں آ جاتا تو حرم کی وسعت اثر کی وجہ سے تمام عرب کی گردنیں خم ہو جاتیں لیکن مدینہ کا اثر چار دیواری تک محدود تھا۔ مدینہ اب تک بیرونی خطرات سے بالکل مطمئن تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ ہونے نے اس کو قریش کے غیظ و غضب کا تاراج گاہ بنا دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے چلے آئے تو چند ہی روز کے بعد قریش نے عبداللہ بن اُبی کو جو واقعہ ہجرت کے قبل رئیس الانصار تھا اور انصار نے اس کی تاجپوشی کی شاہانہ رسم ادا کرنے کے لئے تیاری کر لی تھی[2]، خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے۔

انکم آویتم صاحبنا وانا نقسم باللہ لتقاتلنہ اولتخرجنہ اولنسیرن الیکم باجمعنا حتی نقتل مقاتلتکم ونستبیح نسائکم۔	تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے اور تم کو گرفتار کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔

(سنن ابو داؤد صفحہ ۷۰ جلد ۲ باب خبر النضیر)

[1] غزوات کا سلسلہ جن اسباب سے پیدا ہوا اور جس قسم کے واقعات غزوات میں پیش آئے ان کے لئے ہم نے ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے کیونکہ ضمنی طریقے سے وہ ادا نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ عنوان اچھی طرح سے اسی وقت ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ تمام غزوات سرسری نظر سے گزر جائیں، اس لئے ہم نے اس کو تمام غزوات کے بعد لکھا ہے۔ ناظرین ابھی سے اس کا خیال رکھیں۔

[2] بخاری باب والتعلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین الخ۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ عبداللہ کے پاس تشریف لے گئے۔ اس کو سمجھایا کہ کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے؟ چونکہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے، اس لئے عبداللہ اس نکتہ کو سمجھا اور قریش کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔ بدر کے بعد قریش نے اسی مضمون کا خط لکھا۔ چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئیگی۔

(تاہم قریش کی شہ سے منافقین و یہود مدینہ کا سر پھر چکا تھا، اسی زمانہ میں یعنی بدر سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو الحارث بن خزرج کے محلہ میں سوار ہو کر تشریف لے گئے۔ ایک جگہ مشرکین و منافقین مدینہ یہود اور بعض مسلمان بیٹھے تھے۔ گدھے کے چلنے سے گرد اڑی تو عبداللہ بن ابی نے منہ پر کپڑا ڈال دیا اور حقارت سے بولا "گرد نہ اڑاؤ"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع کو سلام کیا اور کچھ قرآن کی آیتیں سنائیں۔ عبداللہ نے کہا "اے شخص مجھ کو یہ پسند نہیں۔ اگر تمہاری بات سچ بھی ہو تو ہماری مجلس میں آ کر ہم کو نہ ستایا کرو، جو تمہارے پاس جائے اس سے بیان کیا کرو"۔ مسلمان اس تحقیر سے برافروختہ ہو گئے اور قریب تھا کہ کشت و خون ہو جائے۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو ٹھنڈا کیا)[1]

اسی زمانہ کے قریب حضرت سعدؓ بن معاذ جو قبیلہ اوس کے رئیس الاعظم تھے عمرہ کرنے کے لئے مکہ معظمہ گئے۔ اُمیہ بن خلف سے اور ان سے مدت کا یارانہ تھا اور یہ تعلق اسلام کے بعد بھی قائم رہا۔ اس تعلق سے حضرت سعدؓ اب بھی اُمیہ ہی کے مہمان ہوتے۔ ایک دن وہ امیہ کو لے کر کعبہ کے طواف کو نکلے۔ اتفاق سے ابوجہل سامنے سے آ گیا۔ اُمیہ سے اس نے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا "سعد ہیں"۔ ابوجہل نے کہا، تم لوگوں نے صابیوں (کفار، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل اسلام کو صابی یعنی مرتد کہتے تھے) کو پناہ دی ہے میں کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم کعبہ میں آسکو۔ خدا کی قسم اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو بچ کر واپس نہیں جا سکتے تھے۔ حضرت سعدؓ نے کہا۔ اگر تم نے ہم کو حج سے روکا تو ہم تمہارا مدینہ کا راستہ روک[2] دیں گے (یعنی شام کی تجارت کا راستہ)

حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے تمام عرب قریش کا احترام کرتا تھا اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے ہوئے تھے سب قریش کے زیر اثر تھے[3]۔ اس بنا پر قریش نے تمام قبائل کو اسلام کا مخالف بنا دیا۔ ہجرت کے چھٹے سال تک یمن وغیرہ کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ ۶ھ میں جب بحرین سے عبدالقیس کی سفارت آئی تو لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ مضر کے قبائل ہم کو

[1] صحیح مسلم صفحہ ۹۳ جلد ۲ و بخاری باب مذکور۔ [2] یہ پورا واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ صحیح بخاری باب المغازی کی ابتدا میں مذکور ہے۔

[3] ابن ہشام واقعات وفود میں ہے وذلک ان قریشا کانوا امام الناس وقادۃ العرب لا ینکرون ذلک وکانت قریش ہی التی نصبت الحرب لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ تک پہنچنے نہیں دیتے۔ اس لئے ہم صرف ایام حج میں جب کہ لڑائی عموماً موقوف ہو جاتی ہے آپ کی خدمت میں آسکتے ہیں۔[1]

قریش نے انہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ جیسا کہ انھوں نے عبداللہ بن اُبی کو لکھا تھا اس کی تیاریاں کر رہے تھے کہ مدینہ پر حملہ کر کے اسلام کا استیصال کر دیں۔ مدت تک یہ حال رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے۔ صحیح نسائی میں ہے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اول ما قدم المدینۃ یسھر من اللیل۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول جب مدینہ میں آئے تو راتوں کو جاگا کرتے تھے۔

صحیح بخاری باب الجہاد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دیتا"۔ چنانچہ حضرت سعدؓ بن وقاص نے ہتھیار لگا کر رات بھر پہرہ دیا، تب آپ نے آرام فرمایا۔ اس سے بڑھ کر حاکم کی روایت ہے جس کے یہ الفاظ ہیں۔

عن ابی بن کعب قال لما قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ المدینۃ وآوتھم الانصار رمتھم العرب عن قوس واحدۃ وکانوا لا یبیتون الا بالسلاح ولا یصبحون الا فیہ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ جب مدینہ آئے اور انصارؓ نے ان کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ ان سے لڑنے کو آمادہ ہو گئے۔ صحابہؓ صبح تک ہتیار باندھ کر سوتے تھے۔

مورخین مغازی کی ابتداء انہی واقعات سے کرتے ہیں کہ اسی سال خدا نے جہاد کی اجازت دی، لیکن ایک دقیقہ بین انہی کی تصریحات سے پتہ لگا سکتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا، مواہب لدنیہ اور زرقانی میں لکھا ہے کہ خدا نے ۱۲ صفر ۲ھ میں جہاد کی اجازت دی۔ اس کی سند میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔

اول ایۃ نزلت فی الاذن بالقتال اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔

(زرقانی بحوالہ صحیح نسائی جلد ا صفحہ ۴۴۸)

پہلی آیت جو قتال کی اجازت میں نازل ہوئی وہ یہ ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ الخ یعنی جن سے لڑائی کی جاتی ہے (مسلمان) ان کو بھی اب لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور خدا ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔

تفسیر ابن جریر میں ہے کہ قتال کے متعلق سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ (بقرہ-۲۴)

اور خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

لیکن غور سے دیکھو کہ دونوں آیتوں میں انہی لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو پہلے مسلمانوں سے لڑتے

[1] وفد بنی عبد القیس کے ذکر میں صحیح بخاری اور دیگر تمام کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے [2] لباب فی اسباب النزول سیوطی سورہ نور آیت وعد اللہ الذین امنوا منکم [3] مسند دارمی میں بھی یہ روایت مذکور ہے

آتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان درحقیقت لڑنے پر مجبور کئے جاتے تھے۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا کام حفاظت خود اختیاری کی تدبیر تھی، نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی بلکہ انصار کی بھی کیونکہ اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے، قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا اور اپنے تمام قبائل متحدہ میں یہ آگ بھڑکا دی تھی۔ اس بنا پر آپ نے دو تدبیریں اختیار کیں۔

اول یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو اُن کا مایۂ غرور تھی بند کر دی جائے تا کہ وہ صلح پر مجبور ہو جائیں اور یہ ہو گا کہ حضرت سعدؓ بن معاذ نے مکہ میں ابوجہل کو اسی کی دھمکی دی تھی۔

دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب و جوار کے جو قبائل ہیں اُن سے امن و امان کا معاہدہ ہو جائے۔

بدر سے پہلے جو مہمیں بھیجی گئیں

(غرض ان حالات کی بنا پر غزوۂ بدر سے پہلے سو سو پچاس پچاس کی ٹکڑیاں مکہ کی طرف روانہ کی جانے لگیں، ابواء کی مہم سے پہلے جو صفر ۲ھ میں واقع ہوئی اور جس میں آپ نے خود شرکت فرمائی تھی، ارباب سیر نے تین مہم کا ذکر کیا ہے جن کو اُن کی زبان میں سریہ کہتے ہیں، سریۂ حمزہؓ، سریۂ عبیدہؓ بن حارث، سریۂ سعدؓ بن ابی وقاص، لیکن ان میں سے کسی مہم میں کوئی کشت و خون نہیں ہوا، یا بیچ بچاؤ ہو گیا یا بچ کر نکل گئے۔ ارباب سیر نے ان سرایا کا مقصد یہ بتایا ہے کہ قریش کے تجارتی قافلہ کو چھیڑنے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ یعنی حضرت سعدؓ کی تہدید کے مطابق اُن کی شامی تجارت کو بند کرنا مقصود تھا۔ مخالفین کہتے ہیں کہ صحابہ کو غارت گری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن یہ الزام کس قدر جہالت پر مبنی ہے کہ اول تو اسلام کی شریعت میں بدترین گناہ ہے۔ ثانیاً واقعہ کیا بتاتا ہے؟ کیا ان میں سے کسی مہم میں بھی مذکور ہے کہ صحابہ نے قافلہ کا مال لوٹ لیا؟ ثالثاً اگر ان سرایا کا مقصد لوٹنا اور ڈاکہ ڈالنا ہی ہوتا تھا تو قریش کے قافلۂ تجارت کے سوا یہ مقصد کہیں اور نہیں حاصل ہو سکتا تھا؟)

جہینہ

اطراف کے جن قبائل کے پاس معاہدہ کے لئے مہم بھیجی گئی ان میں سب سے پہلے جہینہ کا قبیلہ ہے جہینہ کا قبیلہ مدینہ سے تین منزل پر آباد تھا اور اُن کا کوہستان دور تک پھیلا ہوا تھا، ان سے معاہدہ ہوا کہ وہ فریقین سے یکساں تعلقات رکھیں گے۔ یعنی دونوں سے الگ رہیں گے۔

صفر ۲ھ میں آپ ساٹھ مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور ابواء تک گئے (جس کے قریب ہی غزوۂ ابواء یا غزوۂ ودان واقع ہوا) اور جہاں آپ کی والدہ ماجدہ کا مزار ہے۔ ابواء کا صدر مقام فرع ہے جو ایک وسیع قصبہ ہے اور جہاں قبیلۂ مزینہ آباد ہے اور جو مدینہ سے تقریباً ۸ منزل (۸۰ میل) ہے۔ یہ مدینہ کی آخر سرحد ہے۔ ان اطراف میں قبیلۂ بنو ضمرہ آباد تھا اور یہ نواح اُن کی حدود حکومت میں داخل تھے۔ یہاں آپ نے

[1] اس واقعہ کا ذکر مورخین نے مستقل طور نہیں کیا بلکہ جہاں سب سے پہلے سریۂ حمزہؓ کا ذکر کیا ہے وہاں مجدی جہنی (رئیس قبیلہ) کی نسبت لکھا ہے کان موادعا للفریقین، یعنی اس نے دونوں فریقوں سے صلح کر رکھی تھی۔

چند روز قیام کر کے بنوضمرہ سے معاہدہ کیا، جن کا سردار مخشی بن عمرو ضمری تھا۔ معاہدہ کے یہ الفاظ تھے۔

ھذا کتاب من محمد رسول اللّٰہ لبنی ضمرۃ فانھم آمنون علی اموالھم وانفسھم وان لھم النصر علی من رامھم الا ان یحاربوا فی دین اللّٰہ ما بل بحر صوفۃ وان النبی اذا دعاھم لنصرہ اجابوہ۔ (روض الانف ج ۲ ص ۵۸ زرقانی ج ۱ ص ۴۵۶)	یہ محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی تحریر ہے بنوضمرہ کیلئے ان لوگوں کا مال اور جان محفوظ رہے گا اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا اس کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ میں لڑیں اور پیغمبر جب ان کو مدد کے لئے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے۔

تمام محدثین مغازی کی ابتداء اسی واقعہ سے کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں بھی اسی کو اوّل الغزوات قرار دیا ہے۔

قریباً ایک مہینہ کے بعد کرز بن جابر فہری نے جو مکہ کے رؤسا میں تھا مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے مویشی لوٹ لئے۔ اس کا تعاقب کیا گیا لیکن وہ بچ کر نکل گیا تھا کرز بعد کو مسلمان ہوتے اور فتح مکہ میں تنہا راہ چلتے شہید ہوئے[1]

جمادی الثانی یعنی اس واقعہ کے تیسرے مہینے آپ دو سو مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور مقام ذوالعشیرۃ پہنچ کر بنومدلج سے معاہدہ کیا۔ یہ مقام مدینہ سے ۹ منزل پر ینبوع کے نواح میں ہے۔

بنومدلج، بنوضمرہ کے حلیف تھے اور چونکہ بنوضمرہ پہلے اسلام کے معاہدہ میں داخل ہو چکے تھے، اس لئے انھوں نے آسانی سے یہ شرطیں منظور کر لیں۔

چند روز کے بعد یعنی رجب ۲ھ میں آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللّٰہؓ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطن نخلہ کی طرف بھیجا، یہ مقام مکہ اور طائف کے بیچ میں مکہ سے ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے۔ آپؐ نے حضرت عبداللّٰہؓ کو ایک خط دے کر فرمایا تھا کہ دو دن کے بعد اس کو کھولنا۔ حضرت عبداللّٰہؓ نے خط کھولا تو لکھا تھا کہ مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو۔ اتفاق یہ کہ قریش کے چند آدمی جو شام سے تجارت کا مال لئے آتے تھے، سامنے سے نکلے۔ حضرت عبداللّٰہؓ نے ان پر حملہ کیا۔ ان میں سے ایک

---

[1] اصابہ ذکر کرز فہری ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مؤرخین نے دونوں پہلے واقعوں کی نسبت لکھا ہے کہ ان کا مقصد قریش کے کارواں کا لوٹنا تھا لیکن اتفاق سے کارواں ہاتھ نہ آیا اور بچ کر نکل گیا، لیکن میں واقعات کا پابند ہوں، رائے اور قیاس سے غرض نہیں اس قدر واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان مقامات تک گئے اور وہاں کے قبائل سے معاہدہ کیا۔ اس سے آگے مؤرخین کا قیاس ہے کہ قریش کے کارواں پر حملہ کرنا مقصود تھا، گو یہ مقصود حاصل نہ ہو سکا۔ اگر خدانخواستہ کارواں کا لوٹنا ہی مقصود ہو تو آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو عیاذاً باللّٰہ اس قدر بے تدبیر فرض کرنا پڑے گا کہ ہر مرتبہ ناکامیابی ہوتی تھی اور قافلہ بچ کر نکل جاتا تھا یہاں تک کہ بار بار تجربہ کے بعد بھی برابر یہی اسی قسم کی ناکامیابی ہوتی اور قافلہ صحیح وسلامت نکل گیا۔

شخص عمرو بن الحضرمی مارا گیا، دو گرفتار ہوتے اور مال غنیمت ہاتھ آیا۔ حضرت عبداللّٰہؓ نے مدینہ میں آ کر یہ واقعہ بیان کیا اور غنیمت کی چیزیں پیش کیں، آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی غنیمت کے قبول کرنے سے بھی آپؐ نے انکار فرمایا۔ صحابہؓ نے حضرت عبداللّٰہؓ سے برہم ہو کر کہا۔

صنعتم مالم تومروا بہ وقاتلتم فی الشھر الحرام ولم تومروا بقتال (طبری صفحہ ۱۲۷۵)	تم نے وہ کام کیا (قافلہ لوٹنا) جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا اور ماہِ حرام میں لڑے حالانکہ اس مہینہ میں تم کو لڑنے کا حکم نہ تھا۔

جو لوگ گرفتار اور قتل ہوتے وہ بڑے معزز خاندان کے لوگ تھے، عمرو بن الحضرمی جو مقتول ہوا عبداللّٰہ حضرمی کا بیٹا تھا جو حرب بن امیہ (امیر معاویہؓ کے دادا) کا حلیف تھا۔ حرب قریش کا رئیس اعظم تھا اور عبدالمطلب کے بعد ریاستِ عام اسی کو حاصل ہوتی تھی۔ جو لوگ گرفتار ہوتے یعنی عثمان و نوفل، دونوں مغیرہ کے پوتے تھے۔ مغیرہ ولید کا باپ، حضرت خالدؓ کا دادا اور حرب کے بعد دوسرے درجے کا رئیس تھا۔ اس بنا پر اس واقعہ نے تمام قریش کو مشتعل کر دیا۔ اور ثار یعنی انتقام خون کی بنیاد قائم ہو گئی۔ معرکۂ بدر کا سلسلہ اسی واقعہ سے وابستہ ہے۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے انھوں نے تصریح کی ہے کہ غزوۂ بدر اور تمام لڑائیاں جو قریش سے پیش آئیں سب کا سبب یہی حضرمی کا قتل ہے۔ علامہ طبری لکھتے ہیں[1]۔

وکان الذی ھاج وقعۃ بدر وسائر الحروب التی کانت بین رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وبین مشرکی قریش فیما قال عروۃ بن الزبیر ما کان من قتل واقد بن عبد اللّٰہ السھمی عمرو بن الحضرمی	اور جس چیز نے بدر کے واقعہ کو ابھارا اور وہ تمام لڑائیاں چھیڑ دیں جو آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم اور مشرکین قریش میں پیش آئیں، سب کا سبب یہی تھا کہ واقد سہمی نے حضرمی کو قتل کر دیا تھا۔

چونکہ غزوۂ بدر تمام غزوات کی اصلی بنیاد ہے اس لئے ہم پہلے اس واقعہ کو سادہ صورت میں لکھ کر پھر تفصیل سے اس کے متعلق گفتگو کریں گے۔

✶

---

[1] اصابہ ترجمہ علاء حضرمی [2] طبری صفحہ ۱۲۷۴ [3] طبری صفحہ ۱۲۸۴ و ۱۲۸۵

غزوۂ بدر

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (آل عمران آیت ۱۲۳)

رمضان سنہ ۲ ھ

بدر ایک گاؤں کا نام ہے جہاں سال کے سال میلہ لگتا ہے یہ مقام اسی نقطہ کے قریب ہے جہاں شام سے مدینہ جانے کا راستہ دشوار گزار گھاٹیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے، مدینہ منورہ سے قریباً ۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آتے ہیں قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، عبداللہ بن ابی کو انھوں نے خط لکھ بھیجا کہ یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دو یا ہم آکر ان کے ساتھ تمہارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں۔ کُرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آکر غارت گری کر گیا تھا۔ حملہ کے لئے سب سے بڑی ضروری چیز مصارف جنگ کا بندوبست تھا، اس لئے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروان تجارت شام کو روانہ ہوا، اس سروسامان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی، کل کی کل دے دی[1]۔

نہ صرف مرد بلکہ عورتیں جو کاروبار تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں ان کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا۔ قافلہ ابھی شام سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آگیا جس نے قریش کی آتشِ غضب کو اور بھڑکا دیا، اسی اثنا میں یہ غلط خبر مکہ معظمہ میں پھیل گئی کہ مسلمان قافلہ کے لوٹنے کو آرہے ہیں۔ قریش کے غیظ و غضب کا بادل بڑے زور شور سے اٹھا اور تمام عرب پر چھا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور واقعہ کا اظہار فرمایا، حضرت ابوبکرؓ وغیرہ نے جاں نثارانہ تقریریں کیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی طرف دیکھتے تھے، کیونکہ انصار نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینہ پر چڑھ آئیں، حضرت سعدؓ بن عبادہ (سردار خزرج) نے اٹھ کر کہا۔ "کیا حضور کا اشارہ ہماری طرف ہے؟ خدا کی قسم! آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں"۔

یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، بخاری میں ہے کہ حضرت مقدادؓ نے کہا کہ ہم موسیٰؑ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں۔ ہم لوگ آپ کے داہنے سے، بائیں سے، سامنے سے، پیچھے سے لڑیں گے، ان کی اس تقریر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ دمک اٹھا۔

غرض ۱۲ رمضان سنہ ۲ ھ کو آپ تقریباً تین سو جاں نثاروں کے ساتھ شہر سے نکلے۔ ایک میل چل کر فوج کا

[1] ابن سعد میں ابوسفیان سردار قافلہ کا قول لکھا ہے: واللہ ما بمکۃ من قرشی ولا قرشیۃ لہ نش وصاعدا الا بعث بہ معنا۔ ہمارے مورخین کو اسباب و نتائج کی جستجو نہیں ہوتی اس لئے انھوں نے اس واقعہ کو محض ایک واقعہ کی حیثیت سے لکھ دیا لیکن ان کو احساس نہیں کہ مکہ کو تمام سرمایہ کے اگل دینے کی ضرورت کیا تھی۔

جائزہ لیا جو کم عمر تھے واپس کر دیئے گئے[1]۔ ایسے پُر خطر موقع پر بچوں کا کام نہیں۔ عمیرؓ بن ابی وقاص ایک کمسن بچے تھے جب ان سے واپسی کو کہا گیا تو رو پڑے، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ عمیرؓ کے بھائی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے کمسن سپاہی کے گلے میں تلوار حمائل کی[2]۔ اب فوج کی کل تعداد ۳۱۳ تھی جس میں ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ چونکہ غیبت کی حالت میں منافقین اور یہود کی طرف سے اطمینان نہ تھا اس لئے ابولبابہ بن عبدالمنذر کو مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ مدینہ کو واپس جائیں۔ عالیہ (مدینہ کی بالائی آبادی) پر عاصم بن عدی کو مقرر فرمایا۔ ان انتظامات کے بعد آپ بدر کی طرف بڑھے، جدھر سے اہل مکہ کی آمد کی خبر تھی۔ دو خبر رساں بسبس اور عدی آگے روانہ کر دیئے گئے تھے کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔ روحاء، منصرف، ذات، اجلال، معلات اثیل سے گزرتے ہوئے ۱۷ رمضان کو بدر کے قریب پہنچے۔ خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آگئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں رک گئے اور فوجیں اُتر پڑیں۔

مکہ معظمہ سے قریش بڑے سروسامان سے نکلے تھے، ہزار آدمی کی جمعیت تھی، سو سواروں کا رسالہ تھا رؤسائے قریش سب شریک تھے، ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تھا اس لئے اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا تھا۔ رسد کا یہ انتظام تھا کہ امرائے قریش یعنی عباس (ابن مطلب) عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، نضر بن الحارث، ابوجہل، امیہ وغیرہ وغیرہ، باری باری ہر روز دس دس اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے تھے[3] عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا فوج کا سپہ سالار تھا۔

قریش کو بدر کے قریب پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداران نے کہا، اب لڑنا ضروری نہیں، لیکن ابوجہل نے نہ مانا، زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے۔ باقی فوج آگے بڑھی، قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے انھوں نے مناسب موقعوں پر قبضہ کر لیا تھا، بخلاف اس کے مسلمانوں کی طرف چشمہ یا کنواں تک نہ تھا، زمین ایسی ریتلی تھی کہ اونٹوں کے پاؤں ریت میں دھنس دھنس جاتے تھے حضرت حبابؓ بن منذر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ وحی نہیں ہے۔ حضرت حبابؓ نے کہا تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنوئیں بے کار کر دیئے جائیں[4]۔ آپ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔ تائید ایزدی اور حسن اتفاق سے مینہ برس گیا جس سے گرد جم گئی اور جا بجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لئے گئے کہ غسل اور وضو کے کام آئیں۔ اس قدرتی احسان کا خدا نے قرآن مجید میں بھی ذکر کیا ہے۔

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ (انفال-۲۰) اور جب کہ خدا نے آسمان سے پانی برسایا کہ تم کو پاک کرے۔

پانی پر اگرچہ قبضہ کر لیا گیا لیکن ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض عام تھا اس لئے دشمنوں کو بھی پانی لینے

[1] ابن سعد صفحہ ۹۔ [2] منتخب کنز العمال بروایت ابن عساکر بدر۔ [3] معارف ابن قتیبہ (باب اسماء المطعمین من قریش فی غزاۃ بدر) و سیرت ابن اسحاق بروایت ابن ہشام غزوۂ بدر۔ [4] ابن ہشام۔

کی عام اجازت تھی؎۱ یہ رات کا وقت تھا۔ تمام صحابہؓ نے کمر کھول کھول کر رات بھر آرام کیا، لیکن صرف ایک ذات تھی (ذاتِ نبویؐ) جو صبح تک بیدار اور مصروفِ دعا رہی۔ صبح ہوئی تو لوگوں کو نماز کے لئے آواز دی۔ بعد نماز جہاد پر وعظ فرمایا۔

قریش جنگ کے لئے بے تاب تھے تاہم کچھ نیک دل بھی تھے جن کے دل خونریزی سے لرزتے تھے، ان میں حکیم بن حزام (جو آگے چل کر اسلام لائے) نے سردارِ فوج عتبہ سے جا کر کہا۔ آپ چاہیں تو آج کا دن آپ کی نیک نامی کی ابدی یادگار رہ جائے۔ عتبہ نے کہا کیونکر؟ حکیم نے کہا قریش کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ صرف حضرمی کا خون ہے، وہ آپ کا حلیف تھا۔ آپ اس کا خون بہا ادا کر دیجئے۔ عتبہ نیک نفس آدمی تھا۔ اس نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ لیکن چونکہ ابوجہل کا اتفاق رائے ضرور تھا۔ حکیم عتبہ کا پیغام لے کر گئے۔ ابوجہل ترکش سے تیر نکال کر پھیلا رہا تھا۔ عتبہ کا پیغام سن کر بولا۔ ہاں عتبہ کی ہمت نے جواب دے دیا، عتبہ کے فرزند حضرت ابوحذیفہؓ اسلام لا چکے تھے اور اس معرکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے تھے۔ اس بناء پر ابوجہل نے یہ بدگمانی کی کہ عتبہ اس لئے لڑائی سے جی چراتا ہے کہ اس کے بیٹے پر آنچ نہ آئے۔

ابوجہل نے حضرمی کے بھائی ابو عامر کو بلا کر کہا۔ دیکھتے ہو تمہارا خون بہا تمہاری آنکھ کے سامنے آکر نکلا جاتا ہے، عامر نے عرب کے دستور کے مطابق کپڑے پھاڑ ڈالے گرد اڑا کر واعمروہ واعمروہ کا نعرہ مارنا شروع کیا اس واقعہ نے تمام فوج میں آگ لگا دی۔ عتبہ نے ابوجہل کا طعنہ سنا تو غیرت سے سخت برہم ہوا، اور کہا کہ میدانِ جنگ بتا دے گا کہ نامردی کا داغ کون اٹھاتا ہے، یہ کہہ کر مغفر مانگا لیکن اس کا سر اس قدر بڑا تھا کہ کوئی مغفر اس کے سر پر ٹھیک نہ اترا، مجبوراً سر سے کپڑا لپیٹا اور لڑائی کے ہتھیار سجے۔

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ کو خون سے آلودہ کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ صحابہؓ نے میدان کے کنارے ایک چھپر کا سائبان تیار کیا کہ آپؐ اس میں تشریف رکھیں۔ حضرت سعدؓ بن معاذ دروازہ پر تیغ بکف کھڑے ہوئے کہ کوئی ادھر نہ بڑھنے پائے۔ اگرچہ بارگاہِ الٰہی سے فتح و نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا۔ عناصرِ عالم آمادۂ مدد تھے، ملائکہ کی فوجیں ہم رکاب تھیں؛ تاہم عالمِ اسباب کے لحاظ سے آپؐ نے اصولِ جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں، مہاجرین کا علم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو عنایت فرمایا، خزرج کے علم بردار حضرت حبابؓ بن منذر اور اوس کے حضرت سعدؓ بن معاذ مقرر ہوئے۔

صبح ہوتے ہوتے آپؐ نے صف آرائی شروع کی۔ دستِ مبارک میں ایک تیر تھا، اس کے اشارہ سے صفیں قائم کرتے تھے کہ کوئی شخص تل بھر آگے یا پیچھے نہ رہنے پائے۔ لڑائی میں شور و غل عام بات ہے لیکن منع کر دیا گیا کہ کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلنے پائے، اس موقع پر بھی جب کہ دشمن کی عظیم الشان تعداد مقابل تھی اور مسلمانوں کی طرف ایک آدمی بھی آکر بڑھ جاتا تو کچھ نہ کچھ مسرت ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ تن وفا تھے (حضرت) حذیفہؓ بن الیمان اور (حضرت) حُسَیلؓ دو صحابی کہیں سے آرہے تھے، راہ میں کفار نے روکا کہ محمد (صلی اللہ

؎۱ ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۶ ؎۲ منتخب کنز العمال غزوۂ بدر بروایت مسند ابن حنبل و ابن ابی شیبہ

علیہ وسلم) کی مدد کو جا رہے ہو۔ انھوں نے انکار کیا اور عدم شرکت کا وعدہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو صورتِ حال عرض کی، فرمایا ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے؎۱۔

اب دو صفیں آمنے سامنے مقابل تھیں، حق و باطل، نور و ظلمت، کفر و اسلام۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ (آل عمران - ۲)

جو لوگ باہم لڑے اُن میں تمہارے لئے عبرت کا نشان ہے ایک خدا کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا منکر خدا تھا۔

یہ عجیب منظر تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں توحید کی قسمت صرف چند جانوں پر منحصر تھی۔ صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے "خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے آج پورا کر" محویت اور بے خودی کے عالم میں چادر کندھے پر سے گر گر پڑتی تھی اور آپؐ کو خبر تک نہ ہوتی تھی، کبھی سجدہ میں گرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "خدایا! اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا؎۲" اس بے قراری پر بندگانِ خاص کو رقت آگئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی حضور! خدا اپنا وعدہ وفا کرے گا، آخر روحانی تسکین کے ساتھ،

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (قمر - ۳)

فوج کو شکست دی جائے گی اور وہ پشت پھیر دیں گے۔

پڑھتے ہوئے لبِ مبارک فتح کی پیشین گوئی سے آشنا ہوئے۔ قریش کی فوجیں اب بالکل قریب آگئیں، تاہم آپؐ نے صحابہؓ کو پیش قدمی سے روکا اور فرمایا کہ جب دشمن پاس آجائیں تو تیر سے روکو۔

یہ معرکہ ایثار اور جاں بازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر تھا، دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود اُن کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے (جو اب تک کافر تھے) میدانِ جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکرؓ تلوار کھینچ کر نکلے؎۳۔ عتبہ میدان میں آیا تو حضرت حذیفہؓ (عتبہ کے فرزند تھے) اس کے مقابلہ کو آئے۔ حضرت عمرؓ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی؎۴۔

لڑائی کا آغاز یوں ہوا کہ سب سے پہلے عامر حضرمی جس کو بھائی کے خون کا دعویٰ تھا آگے بڑھا۔ مہجع حضرت عمرؓ کا غلام اس کے مقابلہ کو نکلا اور مارا گیا۔

عتبہ جو سردارِ لشکر تھا، ابوجہل کے طعنے سے سخت برہم تھا سب سے پہلے وہی بھائی اور بیٹے کو لے کر میدان میں نکلا اور مبارز طلبی کی، عرب میں دستور تھا کہ نامور لوگ کوئی امتیازی نشان لگا کر میدانِ جنگ میں جاتے تھے عتبہ کے سینہ پر شتر مرغ کے پر تھے۔ حضرت عوفؓ، حضرت معاذؓ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ مقابلے کو نکلے۔ عتبہ نے نام پوچھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ انصارؓ ہیں تو عتبہ نے کہا ہم کو تم سے غرض نہیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے پکارا کہ محمدؐ! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں؎۵، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد

؎۱ صحیح مسلم باب الوفاء بالعہد کتاب الجہاد والسیر۔ ؎۲ استیعاب ذکر عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ ؎۳ سیرت ابن ہشام ص ۲۸۸ مطبع محمد علی مصر ؎۴ کتب حدیث میں جو الفاظ ہیں مختلف ہیں، ابوداؤد (کتاب الجہاد) میں ہے کہ عتبہ نے کہا کہ ہم کو اپنے برادرانِ عم زاد سے غرض ہے تم سے کام نہیں، انصاری محدثین نے اس کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ اس سے انصار کی توہین منظور نہ تھی بلکہ یہ غرض تھی کہ انتقام خون

کے مطابق انصار ہٹ آئے اور حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبیدہؓ میدان میں آئے چونکہ یہ لوگ خود پہنے تھے جن سے چہرے چھپ گئے تھے، عتبہ نے پوچھا تم کون ہو؟ سب نے نام و نسب بتائے۔ عتبہ نے کہا "ہاں! اب ہمارا جوڑ ہے"۔

عتبہ حضرت حمزہؓ سے اور ولید حضرت علیؓ سے مقابل ہوا اور دونوں مارے گئے، لیکن عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہؓ کو زخمی کیا۔ حضرت علیؓ نے بڑھ کر شیبہ کو قتل کر دیا اور حضرت عبیدہؓ کو کندھے پر اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ حضرت عبیدہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا میں دولت شہادت سے محروم رہا؟ آپ نے فرمایا "نہیں، تم نے شہادت پائی"۔ حضرت عبیدہؓ نے کہا۔ آج ابو طالب زندہ ہوتے تو تسلیم کرتے کہ اُن کے شعر کا مستحق میں ہوں۔

ونسلمہ حتی نصرع حولہ	ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس وقت دشمنوں کے حوالہ کریں گے جب اُن کے گرد لڑ کر مر جائیں
ونذھل عن ابنائنا والحلائل	اور ہم اپنے بیٹوں اور بیبیوں سے مجبلا نہ دیئے جائیں۔

سعید بن العاص کا بیٹا (عبیدہ) سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا صف سے نکلا اور پکارا کہ میں ابو کرش ہوں، حضرت زبیرؓ اس کے مقابلہ کو نکلے اور چونکہ صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں، تاک کر آنکھ میں برچھی ماری وہ زمین پر گرا اور مر گیا۔ برچھی اس طرح پیوست ہو گئی تھی کہ حضرت زبیرؓ نے اس کی لاش پر پاؤں اڑا کر کھینچا تو بڑی مشکل سے نکلی لیکن دونوں سرے خم ہو گئے۔ یہ برچھی یادگار رہی۔ یعنی حضرت زبیرؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگ لی، پھر چاروں خلفاء کے پاس منتقل ہوتی رہی، پھر حضرت عبد اللہؓ بن زبیر کے پاس آئی۔[1]

حضرت زبیرؓ نے اس معرکہ میں کئی کاری زخم اٹھائے، شانہ پر جو زخم تھا اتنا گہرا تھا کہ اچھے ہو جانے پر اس میں انگلی چلی جاتی تھی۔ چنانچہ اُن کے بیٹے (عروۃ) بچپن میں اُن زخموں سے کھیلا کرتے تھے، جس تلوار سے لڑتے تھے وہ لڑتے لڑتے گر گئی تھی، چنانچہ جب حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ شہید ہوئے تو عبد الملک نے عروۃ سے کہا، تم زبیرؓ کی تلوار پہچان لو گے؟ انھوں نے کہا ہاں۔ عبد الملک نے پوچھا کیونکر؟ بولے کہ بدر کے معرکہ میں اس میں دندانے پڑ گئے تھے۔ عبد الملک نے تصدیق کی اور یہ مصرع پڑھا۔ بھن فلول من قراع الکتائب عبد الملک نے تلوار عروہ کو دے دی انھوں نے اس کی قیمت انکوائی تو تین ہزار ٹھہری، اس کے قبضہ پر چاندی کا کام تھا۔[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کا مطالبہ قریش سے ہے انصار سے نہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مکہ والے انصار کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے صحیح روایتوں میں مذکور ہے کہ جب ابو جہل انصار کے ہاتھ سے مارا گیا تو مرتے وقت اس نے کہا، کاش! مجھ کو فلاحوں (کاشتکار) کے سوا کسی اور نے مارا ہوتا۔ انصار کھیتی باڑی کا پیشہ کرتے تھے جو قریش کے نزدیک معیوب تھا۔

[1] ابن سعد غزوۂ بدر و بدایہ و نہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۷۳ مصر، و زرقانی۔ ان واقعات میں روایتیں مختلف ہیں اور قریباً سب ہم مرتبہ ہیں، اس لئے جو روایت اختیار کر لی جائے قابل الزام نہیں۔ [2] صحیح بخاری۔ غزوۂ بدر میں پورا واقعہ منقول ہے۔ [3] پوری تفصیل صحیح بخاری غزوۂ بدر کے ذکر میں ہے۔

اب عام حملہ شروع ہو گیا۔ مشرکین اپنے بل بوتے پر لڑ رہے تھے لیکن ادھر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سر بسجدہ صرف خدا کی قوت کا سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔

ابو جہل کی شرارت اور دشمنیِ اسلام کا عام چرچا تھا۔ اس بنا پر انصار میں سے معوذؓ اور معاذؓ دو بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آ جائے گا یا اس کو مٹا دیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ دفعۃً مجھ کو داہنے بائیں دو نوجوان نظر آئے۔ ایک نے مجھ سے کان میں پوچھا کہ ابو جہل کہاں ہے؟ میں نے پوچھا برادر زادہ! ابو جہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟ بولا کہ میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ ابو جہل کو جہاں دیکھ لوں گا یا اُسے قتل کر دوں گا یا خود لڑ کر مارا جاؤں گا۔ میں جواب نہیں دینے پایا تھا کہ دوسرے نوجوان نے بھی مجھ کو کانوں میں یہی باتیں کہیں۔ میں نے دونوں کو اشارہ سے بتایا کہ ابو جہل وہ ہے۔ بتانا تھا کہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابو جہل خاک پر تھا۔ دونوں جوان عفراء کے بیٹے تھے۔[1] "معوذ و معاذ" ابو جہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آکر معاذ کے بائیں شانہ پر تلوار ماری جس سے بازو کٹ گیا لیکن تسمہ باقی لگا رہا۔ معاذؓ نے عکرمہ کا تعاقب کیا، وہ بچ کر نکل گیا۔ معاذؓ اسی حالت میں لڑ رہے تھے لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی، ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھینچا کہ تسمہ بھی الگ ہو گیا اور اب وہ آزاد تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے فرمایا تھا کہ کفار کے ساتھ جو لوگ آئے ہیں ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو خوشی سے نہیں بلکہ قریش کے جبر سے آئے ہیں۔ اُن لوگوں کے نام بھی آپ نے بتا دیئے تھے ان میں ہی ابو البختری بھی تھا۔ مجذر کی نظر (جو انصار کے حلیف تھے) ابو البختری پر پڑی۔ مجذر نے کہا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرے قتل سے منع فرمایا ہے اس لئے تجھ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو البختری کے ساتھ اس کا ایک رفیق بھی تھا ابو البختری نے کہا اس کو بھی؟ مجذر نے کہا "نہیں"۔ ابو البختری نے کہا تو میں خاتونانِ عرب کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابو البختری نے اپنی جان بچانے کے لئے رفیق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر ابو البختری یہ رجز پڑھتا ہوا مجذر پر حملہ آور ہوا اور مارا گیا۔

لن یسلم ابن حرۃ زمیلہ	شریف زادہ اپنے رفیق کو چھوڑ نہیں سکتا جب تک کہ مر
حتی یموت او یری سبیلہ	نہ جائے یا وہ اپنا راستہ نہ دیکھ لے۔

عتبہ اور ابو جہل کے مارے جانے سے قریش کا پائے ثبات اکھڑ گیا اور فوج میں بے دلی چھا گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید دشمن امیہ بن خلف بھی جنگِ بدر میں شریک تھا۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف نے اس سے کسی زمانہ میں عہد کیا تھا کہ وہ مدینہ میں آئے گا تو یہ اس کی جان کے ضامن ہوں گے۔ بدر میں اس دشمنِ خدا سے انتقام لینے کا خوب موقع تھا۔ لیکن چونکہ عہد کی پابندی اسلام کا شعار ہے، حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف نے چاہا کہ وہ بچ کر نکل جائے۔ اس کو لے کر ایک پہاڑ پر چلے گئے۔ اتفاق یہ کہ حضرت بلالؓ نے دیکھ لیا۔ انصار کو خبر کر دی، دفعۃً لوگ ٹوٹ پڑے انھوں نے امیہ کے بیٹے کو آگے کر دیا، لوگوں نے اس کو قتل کر دیا لیکن اس پر

[1] بعض روایتوں میں معاذ بن عمرو و معاذ بن عفراء ہے۔

بھی قناعت نہ کی اور امیہ کی طرف بڑھے۔ انھوں نے امیہ سے کہا، تم زمین پر لیٹ جاؤ۔ یہ لیٹ گیا تو وہ اُس پر چھا گئے کہ لوگ اس کو مارنے نہ پائیں، لیکن لوگوں نے ان کی ٹانگوں کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اس کو قتل کر دیا حضرت عبدالرحمٰنؓ کی بھی ایک ٹانگ زخمی ہوئی اور زخم کا نشان مدتوں تک قائم رہا۔

ابوجہل اور عتبہ وغیرہ کے قتل کے بعد قریش نے سپر ڈال دی اور مسلمانوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا، حضرت عباسؓ، عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی)، نوفل، اسود بن عامر، عبداللہ بن زمعۃ اور بہت سے بڑے بڑے معزز لوگ گرفتار ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص جاکر خبر لائے ابوجہل کا کیا انجام ہوا؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جاکر لاشوں میں دیکھا تو زخمی پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ بولے تو ابوجہل ہے؟ اس نے کہا، ایک شخص کو اس کی قوم نے قتل کر دیا تو یہ فخر کی کیا بات ہے۔ ابوجہل نے ایک دفعہ اُن کو تھپڑ مارا تھا، انھوں نے اس کے انتقام میں اس کی گردن پر پاؤں رکھا۔ ابوجہل نے کہا او بکری چرانے والے! دیکھ تو کہاں پاؤں رکھتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اس کا سر کاٹ لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا۔

مغربی مؤرخین کو جن کے نزدیک عالم اسباب میں جو کچھ ہے صرف اسبابِ ظاہری کے نتائج ہیں، حیرت ہے کہ تین سو پیدل آدمیوں نے ایک ہزار جن میں سو سواروں کا رسالہ تھا کیونکر فتح ہوئی۔ لیکن تائیدِ آسمانی نے بارہا ایسے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں۔ تاہم اس واقعہ میں ظاہر بینوں کے اطمینان کے سامان بھی موجود ہیں۔ اوّل تو قریش میں باہم اتفاق نہ تھا، عتبہ سردار لشکر لڑنے پر راضی نہ تھا، قبیلہ زہرہ کے لوگ بدر تک آکر واپس چلے گئے پانی برسنے سے موقع جنگ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ قریش جہاں صف آرا تھے وہاں کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا قریش مرعوب ہو کر اسلامی فوج کا تخمینہ غلط کر رہے تھے یعنی اپنی تعداد سے دوگنا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ (آل عمران۔ ۲) وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے آپ سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔

کفار کی فوج میں کوئی ترتیب اور صف بندی نہ تھی۔ بخلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دستِ مبارک میں تیر لے کر نہایت ترتیب سے صفیں درست کی تھیں، مسلمان رات کو اطمینان سے سوتے تھے، صبح اٹھے تو تازہ دم تھے۔ بخلاف اس کے کفار بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے۔

تاہم یہ اسباب بھی ان کا اجتماع اور تہیہ یہی تائید الٰہی ہے، پھر قریش اور مسلمانوں کی فوج کا باہم مقابلہ کرو تو نظر آئے گا کہ عام فوجی نظر کیا مسلمانوں کی فتح کی مقتضی تھی، قریش کی فوج میں بڑے بڑے دولت مند تھے جو تنہا تمام فوج کی رسد کا سامان کرتے تھے، مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا۔ قریش کی تعداد ایک ہزار تھی مسلمان صرف ۳۰۰ تھے۔ قریش میں سو سوار تھے مسلمانوں کی فوج میں صرف دو گھوڑے تھے۔ مسلمانوں میں بہت کم سپاہی تمام ہتھیاروں سے پورے تھے اور ادھر قریش کا ہر سپاہی لوہے میں غرق تھا۔

بایں ہمہ خاتمہ جنگ پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں سے صرف ۱۴ شخصوں نے شہادت پائی جن میں ۶ مہاجر اور باقی

نیچے پورا واقعہ صحیح بخاری میں ہے لیکن چونکہ کتاب المغازی میں نہیں بلکہ کتاب الوکالہ میں ہے اسلئے ارباب سیر کی نظر نہیں پڑی ۔ بخاری غزوہ بدر ۔ ایضاً

انصار تھے۔ لیکن دوسری طرف قریش کی اصلی طاقت ٹوٹ گئی اور رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قریش کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے۔ اُن میں شیبہ، عتبہ، ابوجہل، ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام امیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج قریش کے سرتاج تھے، قریباً ستر آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ اسیرانِ جنگ میں سے عقبہ اور نضر بن حارث قتل کر دیئے گئے۔ باقی گرفتار ہو کر مدینہ میں آئے ان میں حضرت عباسؓ، عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی)، ابوالعاص (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد) بھی تھے۔

لڑائیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جہاں کوئی لاش نظر آتی تھی، آپ اس کو زمین میں دفن کرا دیتے تھے، لیکن اس موقع پر کشتوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے ایک ایک کا الگ الگ دفن کرانا مشکل تھا، ایک وسیع کنواں تھا تمام لاشیں آپ نے اس میں ڈلوا دیں لیکن امیہ کی لاش پھول کر اس قابل نہیں رہی تھی کہ اس جگہ سے ہٹائی جائے اس لئے وہیں خاک میں دبا دی گئی۔

اسیرانِ جنگ جب مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئے تو حضرت سودہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ) بھی تشریف رکھتی تھیں۔ ان قیدیوں میں ان کے عزیز سہیل بن عمر بھی تھے، اُن پر نگاہ پڑی تو بے ساختہ بول اٹھیں کہ تم نے بھی عورتوں کی طرح خود بیڑیاں پہن لیں، یہ نہ ہو سکا کہ لڑ کر مر جاتے۔ اسیرانِ جنگ دو دو، چار چار صحابہ کو تقسیم کر دیئے گئے اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہؓ نے اُن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے۔ ان قیدیوں میں ابوعزیز بھی تھے جو حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے۔ مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس دیتے اور یہ اس بناء پر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔

(قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجمعوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! اس کے دو نیچے کے دانت اکھڑوا دیجئے کہ پھر اچھا نہ بول سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اگر اس کے عضو بگاڑوں گا (مثلہ)، تو گو نبی ہوں لیکن خدا اس کے جزا میں میرے اعضا بھی بگاڑ دے گا)

حضرت عباسؓ کے بدن پر کرتا نہ تھا، لیکن اُن کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کرتہ اُن کے بدن پر ٹھیک نہیں اترتا تھا۔ عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) نے کہ حضرت عباسؓ کا ہم قد تھا اپنا کرتہ منگوا کر دیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کے کفن کے لئے جو اپنا کرتہ عنایت فرمایا تھا وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا۔

عام روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر صحابہ سے مشورہ کیا کہ اسیرانِ جنگ کے معاملہ میں کیا کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں، فدیہ لے کر چھوڑ دیئے جائیں لیکن حضرت

لے روض الانف سے ابن ہشام سے طبری صفحہ ۱۳۳۸ سے ایضاً صفحہ ۱۳۴۴ سے صحیح بخاری صفحہ ۴۲۲ (باب الکسوۃ للاسارٰی)

عمرؓ کے نزدیک اسلام کے معاملہ میں دوست دشمن، عزیز و اقارب، قریب و بعید کی تمیز نہ تھی، اس لئے انھوں نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر دیئے جائیں اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو آپ قتل کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبرؓ کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا اس پر خدا کا عتاب آیا اور یہ آیت اتری،

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (انفال-۹)
اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ یہ عتاب ربانی سن کر رو پڑے۔

یہ روایت تمام تاریخوں میں مذکور اور احادیث میں بھی موجود ہے، لیکن سبب عتاب کے بیان میں اختلاف ہے۔ ترمذی میں جو روایت ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس وقت تک مال غنیمت کے متعلق احکام نہیں آئے تھے، عرب کے عام دستور کے موافق صحابہؓ غنیمت میں مصروف ہو گئے اس پر عتاب آیا لیکن چونکہ اس کے متعلق پہلے کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا اس لئے یہ جرم معاف کر دیا گیا اور حکم دیا کہ مال غنیمت جو ہاتھ آچکا حلال ہے، قرآن مجید میں عتاب کے بعد یہ الفاظ ہیں۔

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا (انفال-۹)
تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال طیب ہے۔

اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ مال جو ہاتھ آیا تھا وہ حلال کر دیا گیا اور وہ مال غنیمت تھا، غرض صحیح مسلم اور ترمذی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے یا مال غنیمت کے لوٹنے پر تھا۔ صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ جب عتاب کی آیت نازل ہوئی تو آپؐ رونے لگے اور جب حضرت عمرؓ نے سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ابکی الذی عرض علی اصحابك من اخذھم الفداء یعنی تمہارے ساتھیوں نے جو فدیہ لیا اس پر جو خدا کی طرف سے پیش کیا گیا اس پر میں رو رہا ہوں، عموماً لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ عتاب اس پر آیا کہ اسیران جنگ کو قتل کیوں نہیں کر ڈالا، چنانچہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ (انفال-۹)
کسی نبی کو یہ مناسب نہیں کہ بغیر اچھی طرح خونریزی کرنے کے لوگوں کو قیدی بنائے۔

لیکن اس آیت کا صرف یہ ماحصل ہے کہ میدان جنگ میں جب تک کافی خونریزی نہ ہو چکے قیدی بنانا مناسب نہیں۔ اس سے یہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے کہ اگر خونریزی سے پہلے گرفتار کر لئے گئے تو لڑائی کے بعد بھی وہ قتل کئے جا سکتے ہیں۔

بہرحال اسیران جنگ سے چار چار ہزار درہم فدیہ لیا گیا، لیکن جو لوگ ناداری کی وجہ سے فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے وہ چھوڑ دیئے گئے ان میں سے جو لکھنا جانتے تھے اُن کو حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں تو چھوڑ دیئے جائیں گے، حضرت زیدؓ بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔

انصار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ حضرت عباسؓ ہمارے بھانجے ہیں، ہم اُن کا

[1] مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۲۴۷، [2] طبقات ابن سعد صفحہ ۱۴۔

فدیہ چھوڑ دیتے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات کی بنا پر گوارا نہیں فرمایا، اور ان کو بھی فدیہ ادا کرنا پڑا فدیہ کی عام مقدار چار، چار ہزار درہم تھی لیکن امراء سے زیادہ لیا گیا، حضرت عباسؓ دولت مند تھے، اس لیے ان سے بھی زیادہ رقم وصول کی گئی۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ اسلام نے جو مساوات قائم کی اس میں قریب و بعید، عزیز و بیگانہ، عام و خاص کے تمام تفرقے مٹ چکے تھے (لیکن ایک طرف تو ادائے فرض کی یہ مساوات تھی، دوسری طرف محبت کا یہ تقاضا تھا کہ حضرت عباسؓ کی کراہ سن کر رات کو آپؐ آرام نہ فرما سکے، لوگوں نے اُن کی گرہ کھولی تو آپؐ نے آرام فرمایا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص بھی اسیران جنگ میں آئے تھے، ان کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو جو ان کی زوجہ تھیں اور مکہ میں تھیں) کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں، حضرت زینبؓ کا جب نکاح ہوا تھا تو حضرت خدیجہؓ نے جہیز میں اُن کو ایک قیمتی ہار دیا تھا حضرت زینبؓ نے زر فدیہ کے ساتھ وہ ہار بھی گلے سے اتار کر بھیج دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو ۲۵ برس کا محبت انگیز واقعہ یاد آگیا۔ آپؐ بے اختیار رو پڑے اور صحابہ سے فرمایا کہ تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دو سب نے تسلیم کی گردنیں جھکا دیں اور وہ ہار واپس کر دیا۔

(ابوالعاص رہا ہو کر مکہ آئے اور حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیا۔ ابوالعاص بہت بڑے تاجر تھے، چند سال کے بعد بڑے سر و سامان سے شام کی تجارت لے کر نکلے۔ واپسی میں مسلمان دستوں نے ان کو مع تمام مال و اسباب گرفتار کر لیا۔ اسباب ایک ایک سپاہی پر تقسیم ہو گیا، یہ چھپ کر حضرت زینبؓ کے پاس پہنچے، انھوں نے پناہ دی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا، کہ اگر مناسب سمجھو تو ابوالعاص کا اسباب واپس کر دو، پھر تسلیم کی گردنیں جھک گئیں اور سپاہیوں نے ایک ایک دھاگہ تک لا لا کر واپس کر دیا۔ اب یہ دار الیسانہ تھا جو خالی جاتا ابوالعاص مکہ آئے اور تمام شرکاء کو حساب سمجھا کر دولت اسلام سے فائز ہوئے اور کہہ دیا کہ میں اس لئے یہاں آ کر اور حساب سمجھا کر جاتا ہوں تاکہ یہ نہ کہو کہ ابوالعاص ہمارا روپیہ کھا کر تقاضے کے ڈر سے مسلمان ہو گیا۔)

بدر کی خبر مکہ میں پہنچی تو گھر گھر ماتم تھا لیکن غیرت کی وجہ سے قریش نے منادی کرا دی کہ کوئی شخص رونے نہ پائے۔ اس لڑائی میں اسود کے تین لڑکے مارے گئے تھے اس کا دل امنڈ آتا تھا لیکن قومی عزت کی وجہ سے رو نہیں سکتا تھا۔ اتفاق یہ کہ ایک دن کسی طرف سے رونے کی آواز آئی۔ سمجھا کہ قریش نے رونے کی اجازت دے دی ہے، نوکر سے کہا دیکھنا کون روتا ہے؟ کیا رونے کی اجازت ہو گئی، میرے سینہ میں آگ لگ رہی ہے، جی کھول کر رو لوں تو تسکین ہو جائے۔ آدمی نے آکر کہا ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے اس کے لئے رو رہی ہے۔ اسود کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکلے:۔

اتبکی ان یضل لھا بعیر — اونٹ کے گم ہونے پر روتی ہے
ویمنعھا من النوم السھود — اور اس کو نیند نہیں آتی راونٹ پر

[1] بخاری صفحہ ۵۷۲، رج اول کتاب المغازی، [2] تاریخ طبری صفحہ ۱۳۴۸ و ابوداؤد [3] تاریخ طبری۔

وَلَا تَبْكِيْ عَلٰى بَكْرٍ وَلٰكِنْ — مت رو، بدر پر آنسو بہا، جہاں
عَلٰى بَدْرٍ تَقَاصَرَتِ الْجُدُوْدُ — قسمت نے کمی کی، تجھ کو رونا ہے
فَبَكِّيْ اِنْ بَكَيْتِ عَلٰى عَقِيْلٍ — تو عقیل پر رو اور حارث پر رو جو
وَبَكِّيْ حَارِثًا اَسَدَ الْاُسُوْدِ — شیروں کا شیر تھا۔

(عمیر بن وہب قریش میں اسلام کا سخت دشمن تھا وہ اور صفوان بن امیہ حجر میں بیٹھے مقتولین بدر کا ماتم کر رہے تھے۔ صفوان نے کہا "خدا کی قسم! اب جینے کا مزہ نہیں" عمیر نے کہا سچ کہتے ہو، اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر آتا۔ میرا بیٹا بھی وہاں قید ہے صفوان نے کہا تم قرض کی اور بچوں کی فکر نہ کرو، اُن کا میں ذمہ دار ہوں۔ عمیر نے گھر آکر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ پہنچا حضرت عمرؓ نے اس کے تیور دیکھ لئے۔ گلا دبائے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ آپؐ نے فرمایا عمر چھوڑ دو۔ عمیر قریب آجاؤ۔ پوچھا کس ارادے سے آئے؟ جواب دیا کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں۔ فرمایا تلوار کیوں حمائل ہے؟ عمیر نے کہا آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں؟ فرمایا، کیوں نہیں۔ تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی؟ عمیر آپؐ کی یہ بات سن کر سناٹے میں آگیا۔ بے اختیار ہو کر بولا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بے شک تم پیغمبر ہو۔ بخدا میرے اور صفوان کے سوا اس معاملہ کی کسی کو خبر نہ تھی۔ قریش جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی خبر سننے کے منتظر تھے انھوں نے عمیر کے مسلمان ہونے کی خبر سنی۔

حضرت عمیرؓ مسلمان ہو کر بہادرانہ مکہ میں آئے جہاں کا ہر ذرہ اس وقت مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا اُن کو اسلام کے دوستوں سے جس شدت کے ساتھ عداوت تھی اسی شدت سے وہ اب دشمنان اسلام کے دشمن تھے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے اسلام کی دعوت کو پھیلایا اور ایک مجمع کثیر کو اس روشنی سے منور کر دیا)[1]

غزوۂ بدر کا بیان قرآن میں

(اس غزوہ کو دیگر غزوات پر جو امتیازات حاصل ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خود خدا نے اپنے کلام پاک میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور ایک خاص سورہ (انفال) بدر کے احسانات و نعم کی تفصیل اور بعض مسائل متعلقہ بدر کی توضیح کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ واقعہ کی اصل حقیقت جاننے کے لئے آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی صحیح ماخذ موجود نہیں۔

(۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۔ اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۔

مومن وہ ہیں کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے خدا پر بھروسہ کرتے ہیں جو نماز بہ پابندی پڑھتے ہیں اور خدا نے جو ان کو روزی دی ہے اس سے راہ خدا میں بھی کچھ دیتے ہیں، یہ ہیں سچے مومن، اُن کے لئے خدا کے پاس رتبے ہیں، بخشش ہے اور اچھی روزی ہے

[1] یہ تمام واقعات تاریخ طبری میں بحوالہ عروہ بن زبیر مذکور ہیں ص ۳۵۲)

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۔ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۔ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۔ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۔ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۔ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۔ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۔

جس طرح اے پیغمبر تیرا خدا تجھ کو حق پر تیرے گھر سے (مدینہ سے) نکال لایا حالانکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس سے ناخوش تھا وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑتا ہے۔ گویا کہ وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور وہ موت کو دیکھ رہے ہیں اور جب خدا تم سے قریش کے قافلہ اور قریش کی فوج میں سے ایک کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ تمہارے لئے ہے تم چاہتے ہو کہ بے خطر والا گروہ تم کو مل جائے (یعنی قافلہ) اور خدا یہ چاہتا ہے کہ حق کو اپنے حکم سے ثابت کرے اور باطل کو مٹائے گو گنہگار اس سے رنجیدہ ہوں، یاد کرو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے اس نے تمہاری سنی (اور) کہا میں تمہاری لگا تار ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا، خدا نے یہ صرف مسلمانوں کی خوشی اور اطمینان قلب کے لئے کیا اور فتح تو صرف خدا کے پاس ہے، خدا غالب و دانا ہے۔ یاد کرو جب تمہارے چین کے لئے اپنی طرف سے اونگھ تم پر طاری کر رہا تھا اور آسمان سے پانی برسا رہا تھا کہ تم کو پاک کرے اور شیطان کی ناپاکی تم سے دور کرے اور تمہارے دل مضبوط کرے اور ثابت قدم رکھے۔ یاد کرو جب خدا فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا، میں کافروں کے دل میں رعب ڈال دوں گا۔ کافروں کی گردنیں مارو اور ہر جوڑ پر مارو، یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا اور خدا کے رسول سے دشمنی کی ہے اور جو خدا اور خدا کے رسول سے دشمنی کرے گا خدا اس کو سخت عذاب دینے والا ہے یہ ہے عذاب اس کا مزہ چکھو، کافروں کے لئے عذاب دوزخ ہے مسلمانو! جب میدان جنگ میں کافروں کے مقابل آؤ تو پشت نہ پھیرو اور بجز اس کے کہ لڑنے کے لئے مڑے یا کسی دستہ کی طرف پھرے جو کوئی پشت پھیرے وہ خدا کا غضب لائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور کیا بڑا ٹھکانا ہے مسلمانو! ان کافروں کو تم نے نہیں مارا لیکن خدا نے مارا، اور اے محمد! تم نے

فلم تقتلوهم ولكن الله قتلهم وما رميت إذ رميت ولكن الله رمى وليبلي المؤمنين منه بلاء حسنا إن الله سميع عليم. ذلكم وأن الله موهن كيد الكافرين. إن تستفتحوا فقد جاءكم الفتح وإن تنتهوا فهو خير لكم وإن تعودوا نعد ولن تغني عنكم فئتكم شيئا ولو كثرت وأن الله مع المؤمنين.

نہیں پھینکا جب تم نے پھینکا، لیکن خدا نے پھینکا کہ اپنی طرف سے اہل ایمان کو اچھا انعام دے خدا دانا اور بینا ہے اور کافروں کے داؤ پیچ کو کمزور کرنے والا ہے اگر تم فتح چاہتے تھے تو فتح آ چکی اب اگر تم رک جاؤ تو بہتر ہے اور اگر تم پھر مخالفت پر آمادہ ہو گے تو ہم پھر مسلمانوں کی مدد کریں گے۔ یاد رکھو کہ تمہاری جمعیت کچھ مفید نہیں گو وہ کتنی ہی کثیر ہو اور خدا مومنوں کے ساتھ ہے۔

(انفال-۲)

(۲) واعلموا أنما غنمتم من شيء فأن لله خمسه وللرسول ولذي القربى واليتمى والمسكين وابن السبيل إن كنتم آمنتم بالله وما أنزلنا على عبدنا يوم الفرقان يوم التقى الجمعان والله على كل شيء قدير. إذ أنتم بالعدوة الدنيا وهم بالعدوة القصوى والركب أسفل منكم ولو تواعدتم لاختلفتم في الميعاد ولكن ليقضي الله أمرا كان مفعولا ليهلك من هلك عن بينة ويحيى من حي عن بينة وإن الله لسميع عليم. إذ يريكهم الله في منامك قليلا ولو أراكهم كثيرا لفشلتم ولتنازعتم في الأمر ولكن الله سلم إنه عليم بذات الصدور. وإذ يريكموهم إذ التقيتم في أعينكم قليلا ويقللكم في أعينهم ليقضي الله أمرا كان مفعولا وإلى الله ترجع الأمور. يا أيها الذين آمنوا إذا لقيتم فئة فاثبتوا واذكروا الله كثيرا لعلكم تفلحون وأطيعوا

(۲) اور جان لو کہ جو مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ خدا کے لئے اور اس کے رسول کے لئے، اہل قرابت کیلئے یتیموں کے لئے، مسکینوں کے لئے اور مسافروں کیلئے ہے اگر خدا پر تم ایمان لا چکے ہو اور حق و باطل میں فرق کر دینے والے دن میں (یعنی بدر میں) خدا نے اپنے بندہ پر جو (فتح) آتاری اس کو مان چکے، جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آگئیں اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی فوج دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے نیچے تھا، اگر تم ایک دوسرے سے وقت مقرر کر کے آتے تو وقت میں اختلاف ہو جاتا لیکن (خدا نے یہ اس لئے کر دیا) تاکہ جو ہونے والا تھا خدا اس کو کر دے تاکہ جس کو مرنا ہو وہ بھی دلیل دیکھ کے مرے اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل دیکھ کے زندہ رہے اور بیشک خدا سننے والا اور جاننے والا ہے، یاد کرو جب خدا تم کو جنگ کی حالت میں ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا اگر زیادہ کر کے دکھاتا تو تم سست پڑ جاتے اور باہم جھگڑ پڑتے لیکن خدا نے محفوظ رکھا، وہ سینوں کے بھید سے واقف ہے، جب تمہاری نظر میں خدا ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا اور تم کو ان کی نگاہ میں تاکہ جو ہونے والا ہے خدا اس کو پورا کرے اور اسی کے طرف تمام معاملے پھرتے ہیں، مسلمانو: جب کسی

الله ورسوله ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم واصبروا إن الله مع الصابرين. ولا تكونوا كالذين خرجوا من ديارهم بطرا ورئاء الناس ويصدون عن سبيل الله والله بما يعملون محيط.

(انفال)

دستہ فوج سے مقابلہ آ پڑے تو ثابت قدم رہو اور خدا کو اکثر یاد کیا کرو تاکہ کامیاب ہو اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جھگڑا نہ کرو ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، مستقل رہو خدا مستقل لوگوں کے ساتھ ہے اور ان لوگوں (یعنی قریش) کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور دکھاوے کے ساتھ اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے اور خدا ان کے تمام کاموں کو گھیرے ہوئے ہے۔

(۳) ما كان لنبي أن يكون له أسرى حتى يثخن في الأرض تريدون عرض الدنيا والله يريد الآخرة والله عزيز حكيم. لولا كتاب من الله سبق لمسكم فيما أخذتم عذاب عظيم. فكلوا مما غنمتم حلالا طيبا واتقوا الله إن الله غفور رحيم.

(انفال-۹)

(۳) پیغمبر کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ اس کے پاس قیدی ہوں تا آنکہ خوب زمین میں لڑ نہ لے، تم دنیا کی دولت چاہتے ہو (قیدی ہوں گے تو فدیہ ہاتھ آئے گا) اور خدا آخرت چاہتا ہے خدا توانا اور دانا ہے۔ اگر خدا کی تقدیر پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو تم نے جو قیدیوں سے لیا اس پر دردناک عذاب پہنچتا۔ اب جو کچھ تم کو غنیمت میں ملا کھاؤ وہ حلال طیب ہے اور خدا سے ڈرا کرو خدا آمرزگار اور مہربان ہے۔

يا أيها النبي قل لمن في أيديكم من الأسرى إن يعلم الله في قلوبكم خيرا يؤتكم خيرا مما أخذ منكم ويغفر لكم والله غفور رحيم. وإن يريدوا خيانتك فقد خانوا الله من قبل فأمكن منهم والله عليم حكيم.

(انفال-۱۰)

اے پیغمبر! تمہارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو کہ خدا اگر تمہارے دلوں میں کچھ نیکی دیکھے گا تو تم سے جو لیا گیا ہے اس کے بدلہ وہ نیکی عطا کرے گا اور تمہیں معاف کرے گا وہ بخشش اور مہربانی والا ہے اور اگر یہ قیدی تجھ سے خیانت کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے وہ خدا کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں اس لئے تو خدا نے ان کو تمہارے قابو میں کر دیا۔ خدا باخبر اور دانا ہے۔

خدا نے اسی احسان کو اُحد کے موقع پر یاد دلایا ہے۔

ولقد نصركم الله ببدر وأنتم أذلة فاتقوا الله لعلكم تشكرون (آل عمران-۱۳)

یقیناً خدا نے تمہاری مدد کی بدر میں، جب تم کمزور تھے، تو خدا سے ڈرو، تاکہ تم شکرگزار بن جاؤ۔

*

غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ محققانہ طور سے اس بات پر بحث کی جائے کہ غزوۂ بدر کا مقصد جیسا کہ عام مورخین نے بیان کیا ہے، کاروانِ تجارت کو لُوٹنا تھا یا قریش کے حملہ کا دفاع تھا۔

میں اس بات سے خوب واقف ہوں کہ تاریخ اور محکمۂ عدالت میں فرق ہے، مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تاریخ کا اندازِ بیان مقدمہ دیوانی یا فوجداری کے فیصلہ لکھنے سے بالکل مختلف ہے۔ میں اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میرا منصب واقعہ نگاری ہے، فیصلہ نویسی نہیں۔ لیکن موقع ایسا آپڑا ہے کہ ایک واقعہ تاریخی نے مقدمۂ عدالت کی حیثیت حاصل کرلی ہے، اس لئے مجھ کو اپنے مقصد سے ہٹ کر فصل مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے۔ اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مورخین اور اربابِ سیر میرے حریفِ مقابل ہیں، نہایت جلد نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پاسکتا ہے۔ سلسلۂ کلام کے اچھی طرح پیشِ نظر رکھنے کے لئے سب سے پہلے ہم کو بتا دینا چاہیے کہ (ہماری تحقیقات کی رو سے) واقعہ کی اصلی صورت کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرمی کے قتل نے تمام مکہ کو جوشِ انتقام سے لبریز کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی پیش آگئیں، دونوں فریق ایک دوسرے سے پُر حذر رہتے تھے اور جیسا کہ ایسی حالتوں میں عام قاعدہ ہے غلط خبریں خود بخود مشہور ہو کر پھیل جاتی ہیں، اسی اثنا میں ابوسفیان قافلۂ تجارت کے ساتھ شام گیا اور ابھی وہ شام میں تھا کہ یہ خبر وہاں مشہور ہوگئی کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، ابوسفیان نے وہیں سے مکہ کو آدمی دوڑایا کہ قریش کو خبر ہو جائے، قریش نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں، مدینہ میں یہ مشہور ہوا کہ قریش ایک جمعیتِ عظیم لے کر مدینہ آرہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔

اس بحث کے فیصلہ کے لئے سب سے پہلے ان واقعات کو یکجا لکھ دینا چاہیے جن پر دونوں فریق کا اتفاق ہے تاکہ وہ انفصالِ بحث میں اصولِ موضوعہ کے طور پر کام آئیں، وہ یہ ہیں۔

(۱) قرآن مجید میں اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے تو اس کے مقابلہ میں کسی روایت اور تاریخ کا اعتبار نہ کیا جائیگا۔

(۲) کتب حدیث میں صحت کے لحاظ سے باہم جو فرقِ مراتب ہے اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں تو آپ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر اُن کا استمزاج کیا۔ مہاجرین نے نہایت جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی مرضی دریافت کرنا چاہتے تھے، یہ دیکھ کر سعدؓ یا اور کوئی معزز انصاری اٹھے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنھوں نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو، ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔ خدا کی قسم! اگر آپ حکم دیں تو ہم آگ اور سمندر میں کود پڑیں۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ صحابہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے، چنانچہ خود قرآن مجید میں تصریح ہے۔

وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِھُوْنَ (انفال)۔۔ اور مسلمانوں کا ایک گروہ قطعاً ناخوش تھا۔

عموماً اربابِ سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی رضامندی جو خاص طور پر دریافت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے مکہ میں جب آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تو صرف یہ اقرار کیا تھا کہ جب کوئی دشمن خود مدینہ پر حملہ آور ہوگا تو انصار مقابلہ کریں گے، یہ اقرار نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑیں گے۔

ان واقعات کے بعد اب مرکزِ بحث یہ ہے کہ یہ واقعات کہاں پیش آئے؟ اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ مدینے سے جب آپ نکلے تو صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود تھا۔ دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لئے چلے آتے ہیں اس وقت آپ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائیں تاکہ آگے کے واقعات یہیں پیش آئے لیکن کتبِ سیر، تاریخ اور دیگر تمام شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے (قرآن) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۔ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۔ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۔

(انفال ع ۱۰)

جس طرح تجھ کو تیرے خدا نے تیرے گھر سے حق پر نکالا اور بیشک مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا یہ لوگ حق کے ظاہر ہوتے پیچھے تجھ سے حق بات میں جھگڑا کرتے تھے گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں اور موت کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جبکہ خدا تم سے یہ وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھٹکے والی جماعت تم کو ہاتھ آجائے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں سے قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

(۱) ترکیبِ نحوی کے رُو سے وَاِنَّ میں جو واؤ ہے، حالیہ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقع عین وہ موقع تھا جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے، نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ آگے بڑھے کیونکہ واؤ حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے۔

(۲) آیتِ مذکورہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ سامنے تھے ایک کاروانِ تجارت اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آرہی تھی، اربابِ سیر کہتے ہیں کہ آیتِ قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے قریب پہنچ چکے تھے، لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروانِ تجارت صحیح سلامت بچ کر نکل گیا تھا اس وقت یہ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ دونوں میں ایک کا وعدہ ہے: اس لئے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہوسکتا ہو اور یہ صرف وہ وقت ہوسکتا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آگئی تھیں، کہ اُدھر ابوسفیان کاروانِ تجارت لے کر چلا ہے اور اِدھر قریش جنگ کے سروسامان کے ساتھ مکہ سے نکل چکے ہیں۔

(۳) سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیتِ مذکورۂ بالا میں کفار کے دو فریق کا خدا نے بیان کیا ہے، ایک قافلۂ تجارت اور دوسرا صاحبِ شوکت یعنی کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے آرہے تھے آیت

میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروانِ تجارت پر حملہ کیا جائے، خدا نے اُن لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا:

وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (انفال ع-۱)

اور تم چاہتے تھے کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو ہاتھ آ جائے اور خدا یہ چاہتا ہے کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف خدا ہے جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔

(۴) اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے اس سروسامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جانباز مہاجر و انصار ساتھ ہیں، ان میں فاتحِ خیبرؓ اور حضرت امیر حمزہؓ سید الشہداءؓ بھی ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے، باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید میں بتصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے کچھ صحابہ کا دل بیٹھا جاتا ہے اور اُن کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منہ میں لئے جاتا ہے۔

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ (انفال-۱)

اور مسلمانوں کی ایک جماعت کارہ تھی، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑا کرتی تھی، گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں۔

اگر صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف، یہ اضطراب، یہ پہلوتہی کس بناء پر تھی، اس سے پہلے بارہا (بقول اربابِ سیر) قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیج دیئے گئے تھے اور کبھی ان کو خطرہ نہیں پہنچا تھا، اس دفعہ اسی قافلہ کا اتنا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں، یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں خبر آ گئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیتِ عظیم لے کر مدینہ پر آ رہے ہیں۔

(۵) قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس وقت جب آپؐ مدینہ ہی میں تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری تفسیر سورۂ نساء میں تصریحاً مذکور ہے، آیت یہ ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً (نساء-۱۳)

بجز معذوروں کے، وہ لوگ جو بیٹھ رہے اور وہ لوگ جو خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں برابر نہیں ہو سکتے، خدا نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں درجہ میں فضیلت دی ہے۔

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور جو شریک ہوئے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے غیر اولی الضرر کا جملہ نہ تھا، یہ آیت سن کر حضرت عبد اللہ بن مکتومؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الناس فانطلقوا حتی نزلوا بدرا۔

(۲) ووردت علیھم روایا قریش وفیھم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوہ فکان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسألونہ عن ابی سفیان واصحابہ فیقول مالی علم بابی سفیان ولکن ھذا ابوجھل وعتبۃ وشیبۃ وامیہ بن خلف فاذا قال ذلک ضربوہ فقال نعم انا اخبرکم ھذا ابوسفیان فاذا ترکوہ فسألوہ فقال مالی بابی سفیان علم ولکن ھذا ابوجھل وعتبۃ وشیبۃ وامیہ بن خلف فی الناس فاذا قال ھذا ایضا ضربوہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قائم یصلی فلما رأی ذالک انصرف قال والذی نفسی بیدہ لتضربوہ اذا صدقکم وتترکوہ اذا کذبکم۔

(صحیح مسلم باب غزوۂ بدر)

کہ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو شرکتِ جنگ کی دعوت دی، لوگ چل پڑے اور بدر پر اترے۔

(۲) اور پہلے قریش کا ہراول دستہ آ گرا تھا اس میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا، مسلمانوں نے اس کو گرفتار کر لیا اور اس سے ابوسفیان کا حال پوچھنے لگے، وہ کہتا تھا مجھے ابوسفیان کی خبر نہیں لیکن یہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف آ رہے ہیں، جب وہ یہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے، وہ کہتا اچھا ابوسفیان کا بتاتا ہوں تب اُس کو چھوڑ دیتے تو پھر پوچھتے تو وہ کہتا مجھ کو ابوسفیان کی خبر نہیں لیکن ابوجہل عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف رؤسائے قریش آ رہے ہیں لیکن جب وہ یہ کہتا تب بھی اس کو مارتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول تھے آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب وہ سچ کہتا ہے تو تم اس کو مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو تم چھوڑ دیتے ہو۔

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا اسی وقت آپؐ نے انصارؓ و مہاجرین سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی اور یہ مطلقاً ثابت ہے کہ ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا اس بنا پر یہ محقق طور پر ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لئے آپؐ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتبِ سیرت میں مذکور ہے تو اس وقت انصار وہاں کہاں ہوتے؟ اور نیز اس ٹکڑے میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی، حالانکہ اربابِ سیرت کے مطابق واقع یہ ہونا چاہیئے کہ انصار معاہدہ اور معمولِ سابق کے خلاف شرکت کے لئے نکلے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اُن کا عندیہ دریافت فرمایا اور اس کے بعد شرکت کے لئے آمادہ کیا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔

حدیث کے دوسرے ٹکڑے سے بوضاحت تمام محقق ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقہ سے یہ پہلے ہی معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے، گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو، اس حدیث میں ایک گرہ اور کھولنی ہے۔ اگر پہلے صرف ابوسفیان کا آنا معلوم ہوا تھا اور قریش کے حملہ کی خبر نہ تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اصرار اور سروسامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے، اس لئے ابوسفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضاء یہ ہے کہ یہ ہو کہ جب مشرکین مکہ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی، چنانچہ اسی واقعہ کو ان ہی الفاظ کے

اپنے اندھے پن کا عذر کیا، اس پر وہیں یہ ٹکڑا نازل ہوا غیر اولی الضرر یعنی معذوروں کے سوا، یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔

(۶) کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے بدر میں آئے ان کی نسبت قرآن مجید میں ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (انفال)

اور (ان لوگوں کی طرح نہ ہو) جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور خدا کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔

اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لئے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہارِ شان اور دکھاوے کے لئے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے، اس میں اظہارِ شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟ البتہ چونکہ درحقیقت وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تھے جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان و نمائش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا اس لئے خدا نے اس کو غرور و نمائش اور صد عن سبیل اللہ کہا۔

قرآن مجید کے بعد احادیثِ نبویؐ کا درجہ ہے، احادیث کی متعدد کتابوں میں غزوۂ بدر کا مفصل و مجمل ذکر ہے لیکن حضرت کعبؓ والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گزرا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کے لوٹنے کے لئے نکلے تھے۔

حضرت کعبؓ کی حدیث یہ ہے:۔

عن عبد الله بن كعب قال كعب لم اتخلف عن رسول الله صلعم فى غزوة غزاها الا غزوة تبوك غير انى كنت تخلفت فى غزوة بدر ولم يعاتب احد تخلف عنها انما خرج النبى صلى الله عليه وسلم يريد عير قريش حتى جمع الله بينه وبينهم على غير ميعاد۔

کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا، بجز غزوۂ تبوک کے اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہ تھا اور جو اس میں شریک نہ ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے تئے نکلے تھے کہ خدا نے دونوں فریق کو اچانک متقابل کر دیا۔

اس کے برخلاف حضرت انسؓ کی حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے۔

(۱) عن انسؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم شاور حين بلغه اقبال ابى سفيان قال فتكلم ابو بكرؓ فاعرض عنه ثم تكلم عمرؓ فاعرض عنه فقام سعد بن عبادة فقال ايانا تريد يا رسول الله والذى نفسى بيده لو امرتنا ان نخيضها البحر لاخضناها ولو امرتنا ان نضرب اكبادها الى برك الغماد لفعلنا قال فندب

(۱) انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپ نے مشورہ طلب کیا حضرت ابوبکرؓ بولے تو آپ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت عمرؓ بولے آپ نے اُن کی طرف بھی توجہ نہ کی پھر حضرت سعدؓ بن عبادہ کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہؐ! کیا آپ کا روئے خطاب ہم انصار کی طرف ہے، خدا کی قسم! اگر دریا میں سواری ڈالنے کا آپ حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے تو ہم کریں گے حضرت انسؓ کہتے ہیں

ساتھ امام احمد بن حنبل نے مسند میں، ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، ابن جریر نے تاریخ میں اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اور اس کے راوی معرکۂ بدر کے ہیرو اسد اللہ علیؓ بن ابی طالب ہیں۔

عن على قال لما قدمنا المدينة اصبنا من ثمارها فاجتويناها واصابنا بها وعك وكان النبى صلى الله عليه وسلم يتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشركين قد اقبلوا سار رسول الله صلى الله عليه وسلم الى بدر وبدر بئر فسبقنا المشركين اليها (اس کے بعد بدر کے تمام واقعات و جزئیات مذکور ہیں)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے اس لئے ہم لوگ بیمار ہو گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو پوچھا کرتے، جب ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آ رہے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو چلے، بدر ایک کنوئیں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکینِ مکہ کے حملہ کی خبر سن کر آپ نکلے تھے اور بدر آ کر قیام فرمایا تھا، اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے، ان قطعی نصوص کے بعد اگرچہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں لیکن لیطمئن قلبی کے طور پر واقعاتِ ذیل پر لحاظ کرنا چاہئے۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایے بھیجے ان میں بیس تیس آدمی سے لے کر سو دو سو تک کی جمعیت تھی ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا، اربابِ سیر اس خاص امر کو بہ تصریح لکھتے ہیں اور اس تصریح کی اس لئے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی، یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی، جس میں ۸۳ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے۔

یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپ نکلے یہ خبر آ چکی تھی کہ قریش مدینہ پر آ رہے ہیں۔ اسی بنا پر آپ نے انصار کو مخاطب کیا کیونکہ معاہدۂ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آ چکا تھا۔

(۲) مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لئے شام کو جایا کرتا تھا، مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا، مدینہ سے مکہ تک جس قدر قبائل آباد تھے عموماً قریش کے زیر اثر تھے، بخلاف اس کے مدینہ سے شام تک کے حدود تک قریش کا اثر نہ تھا، اس بنا پر اگر کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا، یہ بالکل خلافِ قیاس ہے کہ کاروانِ تجارت شام سے آ رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو چکی ہے اور آپ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں مکہ کی طرف جاتے ہیں اور پانچ منزل مکہ کی طرف جا کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا اور قریش سے جنگ پیش آ جاتی ہے۔

(۳) واقعات کی ترتیب یہ ہے

(۱) قریش نے عبداللہ بن اُبی کو خط لکھا کہ محمدؐ اور اُن کے رفقاء کو مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم مدینہ آ کر تم کو بھی برباد کر دیں گے (بحوالہ سنن ابی داؤد اوپر گزر چکا)

(۲) ابوجہل نے سعدؓ بن معاذ سے کہا کہ تم نے ہمارے مجرموں کو پناہ دی ہے، اگر امیہ کی ضمانت نہ ہوتی تو تم

لہ جلد اول ص ۱۱۷، ۲ منتخب کنز العمال غزوۂ بدر بحوالہ جلد ۳ ص ۱۲۸۹۔

کو قتل کر دیا۔

(۳) کرز بن جابر نے جمادی الثانی ۲ھ میں مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ لوٹ لئے۔

(۴) اس کے بعد ہی رجب ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہؓ بن جحش کو تجسس کے لئے بھیجا کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔

(۵) عبد اللہؓ بن جحش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف قریش کا ایک مختصر سا قافلہ لوٹ لیا اور ایک آدمی قتل اور دو اسیر کئے۔

قریش نے مکہ میں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اس کو پیش نظر رکھو۔ پھر یہ خیال کرو کہ ان کا جوش انتقام کسی طرح کم نہیں ہوتا اور وہ عبد اللہ بن ابی کو لکھتے ہیں کہ ہم مدینہ آکر تم کو اور محمدؐ دونوں کو فنا کر دیں گے۔ کرز فہری مدینہ میں چھاپہ مارتا ہے۔ اسی اثنا میں قریش کا اشتعال اس سے اور بڑھ جاتا ہے کہ حضرت عبد اللہؓ بن جحش نے ان کا قافلہ لوٹ لیا اور اُن کے دو معزز خاندان کے ممبر اسیر کر لئے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ قریش صبر کرتے ہیں اور کسی قسم کے انتقام کا ارادہ نہیں کرتے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس قافلہ کو جس میں مکہ کی کل کائنات تھی لوٹنے کے لئے نکلتے ہیں تب مجبوراً اُن کو مدافعت کے لئے نکلنا پڑتا ہے۔ اس پر بھی بدر کے قریب پہنچ کر جب اُن کو معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا تو اُن کے بڑے بڑے سردار اور خود عتبہ جو سالار لشکر تھا رائے دیتا ہے کہ اب لڑنے کی ضرورت نہیں واپس چلنا چاہیئے۔ کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوش عداوت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان نبوت کے موافق ہے۔

(۴) ارباب سیر عموماً لکھتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں صحابہؓ کو کاروان تجارت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو لوگوں نے چنداں مستعدی ظاہر نہیں کی، کیونکہ لوگ سمجھے کہ کوئی مہم اور معرکہ جہاد نہیں ہے بلکہ صرف تحصیل غنیمت ہے، اس لئے جن لوگوں کو مال غنیمت کی حاجت تھی وہ گئے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انصار میں جس قدر اعیان قوم اور سر لشکر تھے سب کے زر و مال کے محتاج اگر تھے تو مہاجرین تھے لیکن جانے والوں میں انصار کی تعداد مہاجرین سے دگنی تگنی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استمزاج کے جواب میں جن لوگوں نے جاں نثارانہ فقرے کہے تھے، مہاجرین میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و مقدادؓ تھے اور انصار میں حضرت سعدؓ بن عبادہ تھے۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اور مدینہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے اس لئے قطعاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت سعدؓ نے یہ جواب مدینہ ہی میں دیا تھا اور وہیں قریش کے حملہ کا حال معلوم ہو گیا تھا اور اس لئے یہ قطعی ہے کہ مدینہ ہی میں اس بات کی ضرورت پیش آئی تھی کہ انصار کا استمزاج لیا جائے۔

(۵) عام ارباب سیر بلکہ احادیث کی کتابوں میں بھی منقول ہے کہ غزوۂ بدر میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

ؔ صحیح مسلم و صحیح بخاری غزوۂ بدر

لوگوں کو چلنے کی ترغیب دی تو کچھ لوگ آمادہ ہوئے اور کسمسائے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جہاد یا غزوہ نہیں صرف قافلہ کا مال لوٹنا ہے، اس لئے یہ اپنی مرضی پر موقوف ہے جس کا جی چاہے جائے جس کا جی چاہے نہ جائے طبری میں ہے۔

قالوا لما سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بابی سفیان مقبلا من الشام ندب المسلمین الیھم وقال ھذہ عیر قریش فیھا اموالھم فاخرجوا الیھا لعل اللہ ان ینفلکموھا فانتدب الناس فخف بعضھم وثقل بعضھم وذلک انھم لم یظنوا ان رسول اللہ یلقی حربا (صفحہ ۱۲۹۲)

لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کا شام سے روانہ ہونا سنا تو مسلمانوں کو بلایا اور فرمایا کہ یہ قریش کا قافلہ آرہا ہے جس میں ان کا مال ہے چلو شاید خدا تم کو اس میں سے مال غنیمت دلوادے، لوگ آمادہ ہوئے لیکن بعضوں نے پہلوتہی کی، کیونکہ وہ سمجھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی لڑائی تو پیش نہیں آئے گی۔

لیکن یہ واقعات صریح آیات قرآنی کے خلاف ہیں، قرآن مجید میں یہ تصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمساتے تھے وہ عدم ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اُن کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ (انفال-۱)

اور مسلمانوں کا ایک فریق نکلنے سے ناراض تھا، وہ تجھ سے حق کے متعلق جھگڑتا تھا، بعد اس کے کہ حق ظاہر ہو گیا تھا، وہ گویا موت کی طرف ہنکارے جا رہے ہیں۔

(۶) تمام کتب احادیث اور سیر میں تصریح ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک میل چل کر (مقام بیر ابی عنبہ میں) آپؐ نے فوج کا جائزہ لیا اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ وغیرہ اس بنا پر واپس بھیج دیئے گئے کہ اُن کی عمریں پندرہ برس سے کم تھیں یا یہ کہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے، اگر صرف قافلہ کا لوٹنا مقصود ہوتا تو یہ کام نوخیز نوجوان زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے تھے لیکن چونکہ واقع میں جہاد مقصود تھا جو ایک فریضۂ الٰہی ہے اور اس کے لئے بلوغ کی قید ہے اس لئے نابالغ لوگ واپس کر دیئے گئے کہ اس کے اہل نہیں۔

(۷) حافظ ابن عبد البر نے استیعابؔ میں روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو قافلہ قریش پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو خیثمہؓ نے جو ایک انصاری تھے اپنے بیٹے سعدؓ سے کہا کہ مجھے جانے دو اور تم یہاں مستورات کی خبرگیری کرو۔ سعدؓ نے کہا حضور! اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ضرور میں آپ کو اپنے اوپر ترجیح دیتا لیکن یہ شہادت کا درجہ ہے میں اس کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی اور سعدؓ کے نام قرعہ نکلا۔ سعدؓ شریک جنگ ہو کر شہید ہوئے۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ قافلہ لوٹنا نہیں بلکہ جہاد پیش نظر تھا اور لوگوں کو دولت شہادت کے حاصل ہونے کی آرزو ہے۔

ؔ دیکھو تذکرہ سعد بن خیثمہؓ، اصابہ اور طبقات میں یہ واقعہ باختلاف الفاظ منقول ہے۔

غزوۂ بدر کا اصلی سبب عرب کا خاصہ قومی تھا کہ جب کسی قبیلہ کا کوئی آدمی کسی طریقے سے کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو ایک سخت ہنگامہ کارزار قائم ہو جاتا تھا۔ دونوں طرف ٹڈی دل امنڈ آتا تھا اور خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں۔ یہ لڑائیاں مدتوں تک قائم رہتی تھیں، قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے تاہم یہ سلسلہ بند نہیں ہوتا تھا۔ عرب لکھے پڑھے نہ تھے تاہم مقتول کا نام کاغذ پر درج ہو کر خاندان میں وراثتًا ملا آتا تھا بچوں کو یہ نام یاد کرایا جاتا تھا کہ بڑے ہو کر اس خون کا انتقام لینا ہے۔ داحس اور بسوس کی قیامت خیز لڑائیاں جو چالیس چالیس برس قائم رہیں اور جن میں ہزاروں لاکھوں جانیں برباد ہو گئیں اسی بناء پر ہوئیں۔ عربی زبان میں انتقام کو ثار کہتے ہیں اور ثار عرب کی قومی تاریخ کا سب سے بڑا اہم لفظ ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں حضرت عبداللہ بن جحش[1] کے واقعہ میں عمرو بن حضرمی قتل کر دیا گیا تھا حضرمی عتبہ بن ربیعہ کا حلیف تھا جو تمام قریش کا سردار تھا۔ بدر اور تمام غزوات کا سلسلہ اسی خون کا انتقام تھا۔ عروہ بن زبیر (حضرت عائشہؓ کے بھانجے) نے اس واقعہ کو بتصریح بیان کیا ہے۔

وکان الذی هاج وقعة بدر وسائر الحروب التی کانت بین رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وبین مشرکی قریش فیما قال عروة بن الزبیر ما کان من قتل واقد بن عبد اللہ التمیمی عمرو بن الحضرمی (تاریخ طبری صفحہ ۱۲۸۴)	جس چیز نے غزوۂ بدر اور دیگر وہ تمام لڑائیاں برپا کیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین عرب کے درمیان واقع ہوئیں وہ جیسا کہ عروہ بن زبیر کا بیان ہے، عمرو بن حضرمی کا قتل کیا جانا ہے جس کو واقد بن عبداللہ تیمی نے قتل کر دیا تھا۔

ایک عام غلطی جس نے واقعہ بحث طلب میں غلطی پیدا کر دی ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لڑائی کفار سے ہوئی وہ بدر تھی، حالانکہ بدر سے پہلے لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں، عروہ بن الزبیر نے غزوۂ بدر کے متعلق عبدالملک کو جو خط لکھا تھا اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں۔

ان اباسفیان بن حرب اقبل من الشام فی قریب من سبعین راکبا من قبائل قریش فذکروا لرسول صلی اللہ علیه وسلم واصحابه وقد کانت الحرب بینهم فقتلت قتلی وقتل ابن الحضرمی فی اناس بنخلة واسرت اساری من قریش وکانت تلك الوقعة هاجت الحرب بین رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وبین قریش واول ما اصاب به بعضهم بعضا من الحرب وذلك قبل مخرج ابی سفیان واصحابه الی الشام (طبری ص ۱۲۸۵)	ابوسفیان بن حرب تقریباً ستر سوار کے ساتھ شام سے آرہا تھا جو کل کے کل قریشی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے اس کا تذکرہ کیا اور دونوں فریق میں لڑائی شروع ہو چکی تھی اور ادھر کے چند لوگ جن میں ابن حضرمی بھی تھا مارے جا چکے تھے اور کچھ قید بھی ہو چکے تھے اور اسی واقعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش میں جنگ برپا کر دی تھی اور یہی سب سے پہلے واقعہ تھا جس میں دونوں فریق نے ایک دوسرے کو صدمہ پہنچایا اور یہ لڑائی ابوسفیان کی روانگی شام سے پہلے وقوع میں آچکی تھی۔

[1] عبداللہؓ بن جحش جن کی سرداری میں یہ قتل واقع ہوا حضرت حمزہؓ کے بھانجے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں زاد بھائی تھے، قاتل یعنی واقد بن عبداللہ حضرت عمرؓ کے خاندان کے حلیف تھے اور حضرت عمرؓ کے آغاز خلافت تک زندہ رہے، دیکھو طبقات ابن سعد، ذکر عبداللہ بن جحش و واقد بن عبداللہ۔

اس میں تصریح ہے کہ ابوسفیان جب شام کو روانہ بھی نہیں ہوا تھا، اسی وقت لڑائی شروع ہو چکی تھی غزوۂ بدر ابوسفیان کی واپسی شام کے بعد واقع ہوا ہے۔ اصلیت واقعہ کی تحقیق کا سب سے بڑا اصلی ذریعہ یہ ہے کہ خود حریفان جنگ کی شہادت بہم پہنچائی جائے اس قسم کی شہادتیں بہت کم ہاتھ آسکتی ہیں لیکن خوش قسمتی سے یہاں اس قسم کی شہادت موجود ہے حضرت حکیمؓ بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) غزوۂ بدر میں شریک تھے اور اس وقت تک کافر تھے وہ عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ برس بڑے تھے اور گو زمانۂ جاہلیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت محبت رکھتے تھے اور نبوت کے بعد بھی یہ محبت قائم رہی، تاہم فتح مکہ تک ایمان نہیں لائے وہ روسائے قریش میں تھے حرم کا ایک بڑا منصب یعنی رفادہ ان ہی کے ہاتھ میں تھا، دارالندوہ کے مہتمم اور مالک بھی وہی تھے وہ مروان بن حکم کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے۔ ایک دفعہ وہ مروان سے ملنے گئے۔ مروان نے نہایت تعظیم و تکریم کی، صدر مجلس سے اٹھ کر ان کے پاس آبیٹھا اور کہا بدر کا واقعہ بیان کیجئے۔ انھوں نے واقعہ کے ابتدائی حالات بیان کر کے کہا کہ جب ہماری فوجیں میدان میں اتریں تو میں عتبہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے یہ کہا۔

یا ابا الولید هل لك ان تذهب بشرف هذا الیوم ما بقیت، قال افعل ماذا؟ قلت انکم لا تطلبون من محمد الا دم ابن الحضرمی وهو حلیفك فتحمل دیته فترجع بالناس۔	اے ابوالولید! کیا تم چاہتے ہو کہ تمام عمر کے لئے ساری نیک نامی تم ہی کو ہاتھ آئے؟ عتبہ نے کہا کیونکر؟ میں نے کہا تم یعنی قریش محمدؐ سے ابن حضرمی کے خون کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے اور وہ تمہارا حلیف تھا اس لئے تم اس کا خون بہا ادا کر دو کہ سب لوگ واپس چلے جائیں۔

عتبہ نے یہ تجویز پسند کی لیکن ابوجہل نے نہ مانا اور حضرمی کے بھائی عامر حضرمی کو بلا کر کہا خون کا بدلہ سامنے ہے، کھڑے ہو کر قوم سے دہائی دو۔ عامر عرب کے دستور کے موافق ننگا ہو گیا اور پکارا۔

واعمراه واعمراه۔	ہائے عمر (حضرمی) ہائے عمر۔

آغاز جنگ کے وقت سب سے پہلے جو شخص میدان جنگ میں نکلا وہ یہی عامر حضرمی تھا۔

حکیم بن حزام اور عامر حضرمی غزوۂ بدر تک کافر تھے، عتبہ و ابوجہل جو سرداران قریش تھے کفر پر تادم مرگ قائم رہے اگرچہ اس درجہ کے لوگ غزوۂ بدر کو حضرمی کے خون کا انتقام سمجھتے تھے اور سمجھتے رہے، تو ہم کو کچھ پروا نہیں کرنی چاہیئے کہ اوروں نے جو اس کے سینکڑوں برس بعد پیدا ہوئے اس کا سبب قافلۂ تجارت کا بچانا

[1] اصابہ تذکرہ حکیمؓ بن حزام [2] طبری ص ۱۳۱۳ از سیرت ابن ہشام بمناہ ذکر غزوۂ بدر، [3] پوری تفصیل طبری ص ۱۳۱۴ تا ۱۳۱۰ میں ہے۔

کہا۔ وشتان بینہما

ایک ضروری نکتہ گو یہ امر اب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ غزوۂ بدر کا سبب کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا تاہم اس گرہ کا کھولنا ضرور ہے کہ ایسے صاف اور صریح واقعہ کے متعلق تمام ارباب سیر نے متفقاً کیوں غلطی کی؟ اور صحیح بخاری وغیرہ میں یہ تصریحات کیوں پائی جاتی ہیں؟ بدر کی ابتداء قافلہ ہی پر حملہ کرنے کی غرض سے ہوئی تھی۔

اصل یہ ہے کہ اصولِ جنگ کے موافق اکثر غزوات میں یہ ظاہر نہیں کیا جاتا تھا کہ کدھر جانا اور کس غرض سے جانا مقصود ہے، صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں حضرت کعبؓ بن مالک جو مشہور صحابی ہیں اُن کا قول نقل کیا ہے

ولم یکن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یرید غزوۃ الا وری بغیرھا۔ (اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تھے تو کسی اور موقع کا توریہ فرماتے تھے)

توریہ کے معنی شارحین بخاری نے یہ لکھے ہیں کہ آپ ایسے موقع پر مبہم اور محتمل المعنیین الفاظ استعمال فرماتے تھے۔ گو میرے نزدیک یہ کلیہ اس معنی میں صحیح نہیں تاہم واقعات کے استقصاء سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بعض موقعوں پر واقعہ اس طرح مبہم رکھا جاتا تھا کہ لوگ مختلف قیاس پیدا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ بدر میں سعد بن خیثمہؓ کو پہلے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ نہیں بلکہ فوج کا مقابلہ ہے، بخلاف اس کے صحیح بخاری میں ان ہی کعبؓ بن مالک کا قول منقول ہے کہ بدر میں صرف قافلہ سے تعرض کرنا مقصود تھا۔

دیباچہ میں ہم لکھ آئے ہیں کہ راوی (جس میں صحابہؓ بھی داخل ہیں) بہت سے موقعوں پر جو واقعہ بیان کرتا ہے وہ حقیقت میں واقعہ نہیں بلکہ اس کا استنباط ہوتا ہے، یعنی اس نے اس کو یوں ہی سمجھا۔ بدر میں بھی یہی صورت پیش آئی اور اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صحابہؓ نے مختلف قیاس کئے اور جو قیاس مذاقِ عام کے مناسب تھا وہی پھیل گیا۔

بدر کے نتائج بدر کے معرکہ نے مذہبی اور ملکی حالات پر گوناگوں اثرات پیدا کئے اور حقیقت میں یہ اسلام کی ترقی کا قدمِ اولین تھا، قریش کے تمام بڑے بڑے رؤسا جن میں سے ایک ایک اسلام کی ترقی کی راہ میں سدِ آہن تھا فنا ہو گئے، عتبہ اور ابوجہل کی موت نے قریش کی ریاست عامہ کا تاج ابوسفیان کے سر پر رکھا جس سے دولتِ اموی کا آغاز ہوا لیکن قریش کے اصلی زور و طاقت کا معیار گھٹ گیا۔

مدینہ میں اب تک عبداللہ بن ابی بن سلول اعلانیہ کافر تھا، لیکن اب بظاہر وہ اسلام کے دائرہ میں آ گیا، گو تمام عمر منافق رہا اور اسی حالت میں جان دی، قبائلِ عرب جو سلسلۂ واقعات کا رُخ دیکھتے تھے، اگرچہ رام نہیں ہوئے لیکن سہم گئے۔

ان موافق حالات کے ساتھ مخالف اسباب میں بھی انقلاب شروع ہو گیا، یہود سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں یک سو رہیں گے، لیکن اس فتحِ نمایاں نے ان میں حسد کی آگ بھڑکا دی اور وہ اس کو ضبط نہ کر سکے چنانچہ اس کی تفصیل یہودیوں کے واقعات میں بالتفصیل آتی ہے۔

قریش کو پہلے صرف حضرمی کا رونا تھا۔ بدر کے بعد ہر گھر ماتم کدہ تھا اور مقتولین بدر کے انتقام کے لئے مکہ کا بچہ بچہ مضطر تھا چنانچہ سویق کا واقعہ اور اُحد کا معرکہ اسی جوش کا مظہر تھا۔

غزوۂ سویق، ذی الحجہ ۲ھ ابوسفیان اب قریش کا رئیس تھا، اس منصب کا سب سے بڑا فرض غزوۂ بدر کا انتقام تھا۔ اُس نے بدر سے مشرکین کی واپسی پر منت مانی تھی کہ جب تک مقتولانِ بدر کا انتقام نہ لے لے گا غسلِ جنابت نہ کرے گا، نہ سر میں تیل ڈالے گا، چنانچہ دو سو شتر سواروں کے ساتھ مدینہ پر بڑھا۔ یہود کی نسبت معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مدد دیں گے، اس لئے پہلے حیی بن اخطب کے پاس گیا لیکن اس نے دروازہ کھولا نہیں، مایوس ہو کر سلام بن مشکم کے پاس آیا وہ یہود بن نضیر کا سردار تھا اور تجارتی خزانہ اسی کے زیر اہتمام رہتا تھا، اس نے بڑے جوش سے استقبال کیا، خوشگوار کھانے کھلائے، شراب پلوائی، مدینہ کے مخفی راز بتائے۔ صبح کو ابوسفیان عُریض پر حملہ آور ہوا، جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ ایک انصاری کو جن کا نام سعدؓ بن عمرو تھا قتل کیا، چند مکانات اور گھاس کے انبار جلا دیئے۔ ان باتوں سے اس کے نزدیک قسم پوری ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ کو خبر ہوئی تو آپؐ نے تعاقب کیا۔ ابوسفیان کے پاس رسد کا سامان صرف ستو تھا، گھبراہٹ میں ستو کے بورے پھینکتا گیا جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں، اس لئے یہ واقعہ غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت فاطمہ زہراؓ کی شادی ذی الحجہ ۲ھ حضرت فاطمہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں سب سے کم سن تھیں، اب ان کی عمر اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی اور شادی کے پیغام آنے لگے تھے۔ ابن سعدؓ نے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی، آپؐ نے فرمایا کہ جو خدا کا حکم ہو گا، پھر حضرت عمرؓ نے جرأت کی، ان کو بھی آپؐ نے کچھ جواب نہیں دیا، بلکہ وہی الفاظ فرمائے، لیکن بظاہر یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابن سعد کی اکثر روایتیں حضرت فاطمہؓ کے حال میں روایت کی ہیں لیکن اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بہرحال حضرت علیؓ نے جب درخواست کی تو آپؐ نے حضرت فاطمہؓ کی مرضی دریافت کی، وہ چپ رہیں یہ ایک طرح کا اظہار رضا تھا آپؐ نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ تمہارے پاس مہر میں دینے کے لئے کیا ہے۔ بولے کچھ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ اور وہ حطمیہ زرہ کیا ہوئی (جنگ بدر میں ہاتھ آئی تھی) عرض کی وہ تو موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا بس وہ کافی ہے۔

ناظرین کو خیال ہو گا کہ بڑی قیمتی چیز ہو گی، لیکن اگر وہ اس کی مقدار جاننا چاہتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ صرف سوا سو روپئے۔[1] زرہ کے سوا اور جو کچھ حضرت علیؓ کا سرمایہ تھا وہ ایک بھیڑ کی کھال اور ایک بوسیدہ یمنی چادر تھی، حضرت علیؓ نے یہ سب سرمایہ حضرت فاطمہ زہراؓ کے نذر کیا حضرت علیؓ اب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس رہتے تھے شادی کے بعد ضرورت ہوئی کہ الگ گھر لیں حضرت حارثہ بن نعمان انصاری کے متعدد مکانات تھے جن میں سے وہ کئی

[1] غلطی سے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں سوا دو سو چھپ گیا ہے اس کی تصحیح کر دی جاتی ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر کر چکے تھے، حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت صلی اللہ سے کہا کہ انہی سے کوئی اور مکان دلوا دیجئے، آپ نے فرمایا کہ کہاں تک، اب ان سے کہتے شرم آتی ہے۔ حضرت حارثہؓ نے سنا تو دوڑے آئے کہ حضورؐ میں اور میرے پاس جو کچھ ہے سب آپ کا ہے۔ خدا کی قسم! میرا جو مکان آپ لے لیتے ہیں مجھ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس رہ جائے۔ غرض انہوں نے اپنا ایک مکان خالی کر دیا حضرت فاطمہؓ اس میں اٹھ گئیں

شہنشاہِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدۂ عالم کو جو جہیز دیا، وہ بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا جس کے اندر روئی کے بجائے کھجور کے پتے تھے، ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑے تھے۔

حضرت فاطمہؓ جب نئے گھر میں جا لیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے، دروازہ پر کھڑے ہو کر اذن مانگا، پھر اندر آئے، ایک برتن میں پانی منگوایا، دونوں ہاتھ اس میں ڈالے اور حضرت علیؓ کے سینے اور بازوؤں پر پانی چھڑکا، پھر حضرت فاطمہؓ کو بلایا وہ شرم سے لڑکھڑاتی آئیں، ان پر بھی پانی چھڑکا، اور فرمایا کہ میں نے اپنے خاندان میں سے سب سے افضل تر شخص سے تمہارا نکاح کیا ہے۔[1]

واقعات متفرقہ ۲ھ

زرقانی کے بیان کے مطابق اسی سال رمضان مبارک کے روزے فرض ہوئے۔

صدقۂ عید الفطر کا حکم بھی اسی سال سے جاری ہوا، پہلے آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں اس صدقہ کے فضائل بیان فرمائے، پھر صدقہ کا حکم دیا۔

عید الفطر کی نماز با جماعت عیدگاہ میں بھی اسی سال ادا فرمائی۔ اس سے پہلے عید کی نماز نہیں ہوتی تھی۔

ارباب سیر کی ترتیب کے مطابق غزوۂ بنی قینقاع کا ذکر بھی اسی سال کے واقعات میں ہونا چاہیے تھا لیکن اتصال و تسلسل واقعہ کی بنا پر وہ آئندہ مذکور ہوگا

★

[1] یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد اور اصابہ سے ماخوذ ہے۔

سنہ ۳ھ

غزوۂ اُحُد[1]

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔ (آل عمران ۱۴۰)[2]

عرب میں صرف ایک شخص کا قتل لڑائی کا ایک سلسلہ چھیڑ دیتا تھا جو سیکڑوں برس تک ختم نہیں ہو سکتا تھا فریقین میں سے جس کو شکست ہوتی تھی وہ انتقام کو ایسا فرض موبد جانتا تھا جس کے ادا کئے بغیر اس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی تھی، بدر میں قریش کے ستر آدمی مارے گئے تھے جن میں اکثر وہ تھے جو قریش کے تاجِ وافسر تھے اس بنا پر تمام مکہ جوش انتقام سے لبریز تھا قریش کا کاروان تجارت جو جنگ بدر کے زمانہ میں نفع کثیر کے ساتھ شام سے واپس آ رہا تھا، اس کا راس المال حصہ داروں کو تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن زرِ منافع امانت کے طور پر محفوظ تھا

قریش کو کشتگانِ بدر کے ماتم سے فرصت ملی تو اس فرض کے ادا کا خیال آیا چند سرداران قریش جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، ان لوگوں کو جن کے عزیز و اقارب جنگِ بدر میں قتل ہو چکے تھے، ساتھ لے کر ابوسفیان کے پاس گئے اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہماری قوم کا خاتمہ کر دیا، اب انتقام کا وقت ہے ہم چاہتے ہیں کہ مالِ تجارت کا جو نفع اب تک جمع ہے وہ اس کام میں صرف کیا جائے۔ یہ ایک ایسی درخواست تھی جو پیش ہونے سے پہلے قبول کر لی گئی تھی، لیکن قریش کو اب مسلمانوں کے قوت و زور کا اندازہ ہو چکا تھا وہ جانتے تھے کہ جنگ بدر میں جس سامان سے وہ گئے تھے اس سے اب کچھ زیادہ درکار ہے، عرب میں جوش پھیلانے اور دلوں کے گرمانے کا سب سے بڑا آلہ شعر تھا قریش میں دو شاعر، شاعری میں مشہور تھے، عمرو جمحی اور مسافع، عمرو جمحی غزوۂ بدر میں گرفتار ہو گیا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اقتضائے رحم سے اس کو رہا کر دیا تھا، قریش کی درخواست پر وہ اور مسافع مکہ سے نکلے، اور تمام قبائل قریش میں اپنی آتش بیانی سے آگ لگا آئے۔

لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوشِ جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونانِ حرم تھیں جس لڑائی میں خاتونیں ساتھ ہوتی تھیں، عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہوگی تو عورتیں بے حرمت ہوں گی، بہت سی عورتیں ایسی تھیں جن کی اولاد جنگِ بدر میں قتل ہو چکی تھی اس لئے وہ خود جوشِ انتقام سے لبریز تھیں اور انہوں نے منتیں مانی تھیں کہ اولاد کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گے، غرض جب فوجیں تیار ہوئیں تو بڑے بڑے معزز گھرانوں کی عورتیں بھی فوج میں شامل ہوئیں، ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں۔[3]

---

[1] مدینہ منورہ سے شمالی جانب قریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے [2] صحیح بخاری باب غزوۂ احد میں ہے کہ یہ آیت غزوۂ اُحد میں نازل ہوئی [3] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۳۸۶، زرقانی ج ۲ صفحہ ۲ نے ان میں خواتین کے سوا سلافہ بنت سعد وغیرہ بنت علقمہ وادر خاتونوں کا ذکر کیا ہے ان میں خناس و عمرہ کے سوا باقی خواتین بعد کو مسلمان ہوگئیں۔ خناس اور عمرہ کے اسلام کے متعلق کچھ معلوم نہیں (زرقانی علی المواہب ۲۰)

۱۔	ہند	عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ماں۔
۲۔	اُم حکیم	عکرمہ (فرزند ابوجہل) کی بیوی۔
۳۔	فاطمہ (بنت ولید)	حضرت خالد کی بہن۔
۴۔	برزة	مسعود ثقفی، جو طائف کا رئیس تھا، اس کی بیٹی۔
۵۔	ریطة	عمرو بن العاص کی زوجہ۔
۶۔	خناس	حضرت مصعبؓ بن عمیر کی ماں۔

حضرت حمزہؓ نے ہند کے باپ عتبہ کو بدر میں قتل کیا تھا۔ جبیر بن مطعم کا چچا بھی حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اس بنا پر ہند نے وحشی کو جو جبیر کا غلام اور حربہ اندازی میں کمال رکھتا تھا، حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کیا اور یہ اقرار ہوا کہ اس کارگزاری کے صلہ میں وہ آزاد کر دیا جائے گا۔

حضرت عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا گو اسلام لا چکے تھے لیکن اب تک مکہ ہی میں مقیم تھے انھوں نے تمام حالات لکھ کر ایک تیز رو قاصد کے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجے اور قاصد کو تاکید کی کہ تین رات دن میں مدینہ پہنچ جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے پانچویں شوال ۳ھ کو دو خبر رساں جن کے نام انس اور مونس تھے خبر لانے کے لئے بھیجے۔ انھوں نے آکر اطلاع دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے قریب آگیا اور مدینہ کی چراگاہ (عریض) کو ان کے گھوڑوں نے صاف کر دیا۔ آپ نے حبابؓ بن منذر کو بھیجا کہ فوج کی تعداد کی خبر لائیں، انھوں نے آکر صحیح تخمینہ سے اطلاع دی، چونکہ شہر پر حملہ کا اندیشہ تھا، ہر طرف پہرے بٹھا دیئے گئے، حضرت سعدؓ ابن عبادہ اور حضرت سعدؓ بن معاذ ہتھیار لگا کر تمام رات مسجد نبوی کے دروازہ پر پہرہ دیتے رہے۔

صبح کو آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا، مہاجرین نے عموماً اور انصار میں سے اکابر نے رائے دی کہ عورتیں باہر قلعے میں بھیج دی جائیں اور شہر میں پناہ گزین ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی سلول جو اب تک کبھی شریکِ مشورہ نہیں کیا گیا تھا اس نے بھی یہی رائے دی، لیکن ان نوخیز صحابہؓ نے جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ اب لوگوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلافِ مرضی نکلنے پر مجبور کیا، سب نے عرض کی کہ ہم اپنی رائے سے باز آتے ہیں، ارشاد ہوا کہ پیغمبر کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔

قریش بدھ کے دن مدینہ کے قریب پہنچے اور کوہ احد پر پڑاؤ ڈالا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن نمازِ جمعہ پڑھ کر ایک ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے نکلے، عبداللہ بن ابی تین سو کی جمعیت لے کر آیا تھا، لیکن یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میری رائے نہ مانی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اب صرف سات سو صحابہؓ رہ گئے ان میں ایک سو زرہ پوش تھے۔ مدینہ سے نکل کر فوج کا جائزہ لیا گیا اور جو لوگ کمسن تھے واپس کر دیئے گئے۔ ان میں حضرت

له طبری (ج ۳ ص ۱۳۸۶ مطبوعہ یورپ) بطن له زرقانی ج ۲ ص ۲۵ یمن۔

زیدؓ بن ثابت، حضرت براءؓ بن عازب، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمر اور حضرت عرابہ اوسی بھی تھے لیکن جاں نثاری کا یہ ذوق تھا کہ نوجوانوں میں سے جب حضرت رافعؓ بن خدیج سے کہا گیا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو واپس جاؤ تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے، چنانچہ ان کی ترکیب چل گئی اور وہ لے لئے گئے۔ سمرۃ ایک نوجوان جو اُن کے ہم سن تھا انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ میں رافعؓ کو لڑائی میں پچھاڑ لیتا ہوں اس لئے اگر ان کو اجازت ملتی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہیئے۔ دونوں کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرہؓ نے رافعؓ کو زمین پر دے مارا اس بنا پر ان کو اجازت مل گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی، حضرت مصعبؓ بن عمیر کو علم عنایت کیا، حضرت زبیرؓ بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہؓ کو اُس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے۔ پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئیں، اس لئے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں۔ حضرت عبداللہ بن جبیر ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے۔

قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے انھوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے، سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کی کمان میں تھا جو قریش کا مشہور رئیس تھا، تیر اندازوں کے دستے الگ تھے جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا، دو سو گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔

سب سے پہلے طبلِ جنگ کے بجائے خاتونانِ قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں جن میں کشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقامِ خون کے رجز تھے، ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں، اشعار یہ تھے،

نحن بنات طارق	ہم آسمانوں کے تاروں کی بیٹیاں ہیں
نمشی علی النمارق	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
ان تقبلوا نعانق	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی
او تدبروا نفارق	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے۔

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابوعامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبولِ عام شخص تھا اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا، اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزت کرتا تھا، چونکہ اس کو خیال تھا کہ انصار جب اُس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دینگے میدان میں آکر پکارا "مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں ابوعامر ہوں" انصار نے کہا "ہاں او بدکار ہم تجھ کو پہچانتے ہیں خدا تیری آرزو بر نہ لائے"۔

له طبری جلد ۲ صفحہ ۱۳۹۱ (یہ طبری کی روایت ہے لیکن بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافعؓ کو اجازت مل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس نوجوانی ہی میں تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کا یہ حال معلوم ہوا تو ان کو شرکت کی اجازت دے دی۔ ابن ہشام ذکر غزوۂ احد و زرقانی ج ۲ صفحہ ۲۹ و ۳۰ و ابن کثیر ج ۴ صفحہ ۱۳) له الاصابۃ ۴۳

قریش کا علم بردار طلحہ، صف سے نکل کر پکارا "کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے کہ یا مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے۔" حضرت علی مرتضیٰؓ نے صف سے نکل کر کہا "میں ہوں"، یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی۔ طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا

ان علی اھل اللواء حقا — علم بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون میں رنگ دے
ان نخضب الصعدۃ او تندقا — یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے

حضرت حمزہؓ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی، ساتھ ہی اُن کی زبان سے یہ نکلا کہ "میں ساقی حجاج کا بیٹا ہوں۔"

اب عام جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابودجانہؓ فوجوں کے دل میں گھس گئے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ حضرت ابودجانہؓ عرب کے مشہور پہلوان تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میں تلوار لے کر فرمایا "کون اس کا حق ادا کرتا ہے؟" اس سعادت کے لیے دفعۃً بہت سے ہاتھ بڑھے لیکن یہ فخر حضرت ابودجانہؓ کے نصیب میں تھا۔ اس غیر متوقع عزت نے اُن کو بادۂ شجاعت سے مست کر دیا، سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے لیکن اس وقت پسند ہے۔" حضرت ابودجانہؓ فوجوں کو چیرتے، لاشوں پر لاشے گراتے بڑھتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ ہند سامنے آگئی، اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھا لی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔

حضرت حمزہؓ دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے اور جس طرف بڑھتے تھے صفیں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں۔ اسی حالت میں سباع غسانی سامنے آگیا، پکارے کہ "او ختانۃ النساء کے بچے! کہاں جاتا ہے"، یہ کہہ کر تلوار ماری، وہ خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہؓ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا، وہ حضرت حمزہؓ کی تاک میں تھا۔ حضرت حمزہؓ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے ہیں اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہؓ نے اس پر حملہ کرنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح پرواز کر گئی۔

کفار کے علم بردار لڑ لڑ کر قتل ہو جاتے تھے تاہم علم گرنے نہیں پاتا تھا، ایک کے گرنے سے پہلے دوسرا جانباز بڑھ کر علم کو ہاتھ میں لے لیتا۔ ایک شخص نے جس کا نام صواب تھا جب علم ہاتھ میں لیا تو کسی نے بڑھ کر اس زور سے تلوار ماری کہ دونوں ہاتھ ساتھ کٹ کر گر پڑے لیکن وہ قومی علم کو اپنی آنکھوں سے خاک پر نہیں دیکھ سکتا تھا، علم کے گرنے کے ساتھ سینہ کے بل زمین پر گرا اور علم کو سینہ سے دبا لیا۔ اسی حالت میں یہ کہتا ہوا مارا گیا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ علم دیر تک خاک پر پڑا رہا، آخر ایک بہادر خاتون عمرہ بنت علقمہ دلیرانہ بڑھی اور علم کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا

۱ یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے تھے۔ ۲ صحیح بخاری باب قتل حمزہؓ صفحہ ۳ ... ۵ ... طبری (ج ۳ ص ۱۴۰۰)

یہ دیکھ کر ہر طرف سے قریش سمٹ آئے اور اکھڑتے ہوئے پاؤں پھر جم گئے۔ ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا مگر اُس کے بیٹے حضرت حنظلہؓ اسلام لا چکے تھے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باپ کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی، لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے۔ حضرت حنظلہؓ نے کفار کے سپہ سالار (ابوسفیان) پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ اُن کی تلوار ابوسفیان کا فیصلہ کر دے، دفعتاً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر اُن کے وار کو روکا اور اُن کو شہید کر دیا۔ تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف تھا، علم بردار کے قتل اور حضرت علیؓ اور حضرت ابودجانہؓ کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی، یہ دیکھ کر تیر انداز جو پشت پر مقرر کیے گئے تھے، وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

حضرت عبداللہؓ بن جبیر نے بہت روکا لیکن وہ رُک نہ سکے۔ تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا۔ عبداللہؓ بن جبیر چند جانبازوں کے ساتھ جم کر لڑے لیکن سب کے سب شہید ہوئے۔ اب راستہ صاف تھا، خالد نے سواروں کے دستہ کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی ہیں۔ بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح باہم مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صورت میں مشابہ اور علم بردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا اور غل مچ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی۔ بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔ حضرت حذیفہؓ کے والد یمان، اس کشمکش میں آگئے اور اُن پر تلواریں برس پڑیں۔ حضرت حذیفہؓ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں لیکن کون سنتا تھا، غرض وہ شہید ہو گئے اور حضرت حذیفہؓ نے ایثار کے لہجہ میں کہا "مسلمانو! خدا تم کو بخش دے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ مسلمان پہلو میں ہیں جن میں حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت ابودجانہؓ، حضرت طلحہؓ کا نام بہ تخصیص معلوم ہے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ رہ گئے تھے۔

اس ہلچل اور اضطراب میں اکثروں نے تو بالکل ہمت ہار دی لیکن جانبازوں کا ابھی زور نہیں چلتا تھا جو جہاں تھا وہیں گھر کر رہ گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کو خبر نہ تھی۔ حضرت علیؓ تلوار چلاتے اور دشمنوں کی صفیں الٹتے جاتے تھے لیکن کعبہ مقصود (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا پتہ نہ تھا۔ حضرت انسؓ کے چچا ابن نضر لڑتے بھڑتے موقع سے آگے نکل گئے۔ دیکھا تو حضرت عمرؓ نے مایوس ہو کر ہتھیار پھینک دیا ہے۔ پوچھا یہاں کیا کرتے ہو؟ بولے اب لڑ کر کیا کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو شہادت پائی۔ ابن نضر نے کہا ان کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے۔ یہ کہہ کر فوج میں گھس گئے اور لڑ کر شہادت پائی۔ لڑائی کے بعد جب ان کی لاش دیکھی گئی تو اسی سے زیادہ تیر، تلوار اور نیزے کے زخم تھے، کوئی شخص پہچان تک نہ سکا، ان کی بہن نے انگوٹھی دیکھ کر پہچانا۔

۱ صحیح بخاری غزوۂ احد ص ۵۸۹ ... ۲ ... یہ عام ارباب سیر کی روایت ہے، صحیح بخاری میں یہ واقعہ مذکور ہے لیکن حضرت عمرؓ کا نام نہیں

جاں نثاران خاص برابر لڑتے جاتے تھے لیکن نگاہیں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھونڈتی تھیں، سب سے پہلے حضرت کعبؓ بن مالک کی نظر پڑی، چہرۂ مبارک پر مغفر تھا لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں، حضرت کعبؓ نے پہچان کر پکارا "مسلمانو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں" یہ سن کر ہر طرف سے جاں نثار ٹوٹ پڑے۔ کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رُخ پر زور دیا۔ دل کا دل ہجوم کر کے بڑھتا تھا لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کون مجھ پر جان دیتا ہے؟" زیادؓ بن سکن پانچ انصاری لے کر اس خدمت کے ادا کرنے کے لئے بڑھے اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑ کر جانیں فدا کر دیں۔ حضرت زیادؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ۔ لوگ اٹھا کر لائے۔ کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منہ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دی[۱]

بجہ ناز رفتہ باشد زجہان نیاز مندے … کہ بوقت جان سپردن بسرش رسیدہ باشی

ایک بہادر مسلمان اس عالم میں بھی بے پروائی کے ساتھ کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا۔ اس نے بڑھ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟ آپؐ نے فرمایا جنت میں۔ اس بشارت سے بے خود ہو کر وہ اس طرح کفار پر ٹوٹ پڑا کہ مارا گیا[۲]۔

عبداللہ بن قمیۂ جو قریش کا مشہور بہادر تھا، صفوں کو چیرتا پھاڑتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آگیا اور چہرہ مبارک پر تلوار ماری۔ اس کے صدمے سے مغفر کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں، چاروں طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے۔ یہ دیکھ کر جاں نثاروں نے آپؐ کو دائرہ میں لے لیا، ابودجانہؓ جھک کر سپر بن گئے۔ اب جو تیر آتے تھے ان کی پیٹھ پر آتے تھے۔ حضرت طلحہؓ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا۔ ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا[۳]۔ بے درد رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر تیر برسا رہے تھے اور آپؐ کی زبان پر یہ الفاظ تھے

ربِّ اغفر قومی فانہم لا یعلمون … اے خدا! میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں۔

حضرت ابوطلحہؓ جو حضرت انسؓ کے علاتی باپ تھے، مشہور تیر انداز تھے، انھوں نے اس قدر تیر برسائے کہ دو تین کمانیں اُن کے ہاتھ میں ٹوٹ ٹوٹ کر رہ گئیں۔ انہوں نے سپر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر اوٹ کر لیا تھا کہ آپؐ پر کوئی وار نہ آنے پائے۔ آپؐ کبھی گردن اٹھا کر دشمنوں کی فوج کی طرف دیکھتے تو عرض کرتے کہ آپؐ گردن نہ اٹھائیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے، یہ میرا سینہ سامنے ہے[۴]۔ حضرت سعدؓ بن وقاص بھی مشہور تیر انداز تھے اور اس وقت آپؐ کے رکاب میں حاضر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ترکش ان کے آگے ڈال دیا اور فرمایا "تم پر میرے ماں باپ قربان۔ تیر مارتے جاؤ[۵]"

اسی حالت میں آپؐ کی زبان سے عبرت کے لہجہ میں یہ لفظ نکلا، وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی

[۱] صحیح بخاری غزوہ احد صفحہ ۵۷۹ و صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۰۸، باب ثبوت الجنۃ للشہید [۲] صحیح مسلم غزوہ بدر میں ہے کہ سات انصار تھے اور ساتوں نے باری باری اپنی جانیں فدا کیں [۳] بخاری غزوہ احد صفحہ ۵۷۹ [۴] صحیح مسلم غزوہ احد ج ۲ ص ۹۰ [۵] صحیح بخاری غزوہ احد صفحہ ۵۸۱ [۵] صحیح بخاری غزوہ احد صفحہ ۵۸۹۔

کرتی ہے۔ بارگاہِ خداوندی میں یہ الفاظ ناپسند آئے اور یہ آیت اتری

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ۔ … تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں

چنانچہ صحیح بخاری غزوۂ احد میں یہ واقعہ مذکور ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابت قدموں کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے کہ دشمن ادھر نہیں آ سکتے تھے۔ ابوسفیان نے دیکھ لیا۔ فوج لے کر پہاڑ پر چڑھا۔ لیکن حضرت عمرؓ اور چند صحابہؓ نے پتھر برسائے جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکا۔

آپؐ کی وفات کی خبر مدینہ میں پہنچی تو خلاص شعار نہایت بے تابی کے ساتھ دوڑے، جناب فاطمہ زہراؓ نے آکر دیکھا تو ابھی تک چہرۂ مبارک سے خون جاری ہے۔ حضرت علیؓ سپر میں بھر کر پانی لائے، جناب سیدہؓ دھوتی تھیں لیکن خون نہیں تھمتا تھا، بالآخر چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور زخم پر رکھ دیا، خون فوراً تھم گیا[۱]

ابوسفیان سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا کہ یہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں؟

آپؐ نے حکم دیا، کوئی جواب نہ دے۔ ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا نام لے کر پکارا اور جب کچھ آواز نہ آئی تو پکار کر بولا "سب مارے گئے" حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا، بول اٹھے "او دشمنِ خدا! ہم سب زندہ ہیں"

ابوسفیان نے کہا۔

اعل ھبل۔ اے ہبل تو اونچا رہ۔

صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کہا

اللہ اعلیٰ واجل۔ خدا اونچا اور بڑا ہے۔

ابوسفیان نے کہا۔

لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم۔ ہمارے پاس عزیٰ ہے تمہارے پاس نہیں،

صحابہؓ نے کہا۔

اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم۔ خدا ہمارا آقا ہے اور تمہارا کوئی آقا نہیں۔

ابوسفیان نے کہا، آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے۔ فوج کے لوگوں نے مُردوں کے ناک کان کاٹ لے ہیں، میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا۔ لیکن مجھ کو معلوم ہوا تو کچھ رنج بھی نہیں ہوا[۲]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مستورات اور بچوں کو حضرت یمانؓ اور حضرت ثابتؓ کی حفاظت میں مدینہ کے پاس کے قلعوں میں بھیج دیا تھا۔ ان لوگوں کو شکست کی خبر معلوم ہوئی تو سب کو چھوڑ کر اُحد کی طرف بڑھے حضرت ثابتؓ مشرکوں کے ہاتھ سے مارے گئے، حضرت یمانؓ کو مسلمان ہجوم عام میں پہچان نہ سکے اُن پر تلواریں برس پڑیں، اُن کے صاحبزادے حضرت حذیفہؓ نے ہر چند "ہاں ہاں" کہا اور بتایا کہ میرے باپ ہیں لیکن ہنگامہ

[۱] طبری ۱۴۲۰ [۲] صحیح بخاری غزوہ احد ص ۵۸۰ [۳] حضرت ثابت کا نام حضرت ثابت کا نام سے منقول ہے... [۴] یہ تمام تفصیل بخاری غزوۂ احد کے ذکر میں ہے

نی کون سنتا تھا، حذیفہؓ یہ کہہ کر رہ گئے کہ مسلمانو! خدا تمہارے اس گناہ کو بخش دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یمانؓ کا خون بہا مسلمانوں کی طرف سے ادا کرنا چاہا لیکن حضرت حذیفہؓ نے معاف کر دیا۔ ابن ہشام میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے، صحیح بخاری میں بھی ہے لیکن مختصر ہے۔

خاتونانِ قریش نے انتقامِ بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا۔ ان کے ناک کان کاٹ لئے۔ ہندہ (حضرت امیر معاویہؓ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا۔ حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی، لیکن گلے سے اتر نہ سکا اس لئے اگل دینا پڑا۔ تاریخوں میں ہندہ کا لقب جو جگر خوار لکھا جاتا ہے، اسی بنا پر لکھا جاتا ہے۔ ہندہ فتح مکہ میں ایمان لائی۔ جس طرح ایمان لائی وہ عبرت خیز ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

اس غزوہ میں اکثر خاتونانِ اسلام نے بھی شرکت کی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلیمؓ جو حضرت انسؓ کی ماں تھیں زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ اور ام سلیمؓ کو دیکھا کہ پائینچے چڑھائے ہوئے مشک بھر بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، مشک خالی ہو جاتی تھی تو جا کر بھر لاتی تھیں۔[1] ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ام سلیطؓ نے بھی جو حضرت ابو سعید خدریؓ کی ماں تھیں یہی خدمت انجام دی۔[2]

عین اس وقت جب کہ کافروں نے عام حملہ کر دیا تھا اور آپؐ کے ساتھ صرف چند جان نثار رہ گئے تھے حضرت ام عمارہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئیں اور سینہ سپر ہو گئیں۔ کفار جب آپؐ پر بڑھتے تھے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں۔ ابن قمیہ جب دڑاتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا تو حضرت ام عمارہؓ نے بڑھ کر روکا، چنانچہ کندھے پر زخم آیا اور غار پڑ گیا۔ انھوں نے بھی تلوار ماری لیکن وہ دوہری زرہ پہنے ہوئے تھے اس لئے کارگر نہ ہوئی۔[3]

حضرت صفیہؓ (حضرت حمزہؓ کی بہن) شکست کی خبر سن کر مدینہ سے نکلیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صاحبزادے حضرت زبیرؓ کو بلا کر ارشاد کیا کہ حمزہؓ کی لاش نہ دیکھنے پائیں۔ حضرت زبیرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا۔ بولیں کہ میں اپنے بھائی کا ماجرا سن چکی ہوں، لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی، لاش پر گئیں، خون کا جوش تھا اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے لیکن انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر چپ ہو رہیں اور مغفرت کی دعا مانگی۔[4]

انصار میں سے ایک عفیفہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں مارے گئے تھے، باری باری تین سخت حادثوں کی صدا اس کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی۔ لیکن وہ ہر بار صرف یہی پوچھتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا بخیر ہیں، اس نے پاس آکر چہرۂ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھی۔[5]

---

[1] صفحہ ۵۰۱ کتاب المغازی غزوۂ احد [2] صحیح بخاری صفحہ ۵۸۲ ذکر ام سلیطؓ [3] ابن ہشام صفحہ ۸۴، ۸۰ مطبع محمد علی مصر [4] طبری (۱۴۲۱) [5] طبری صفحہ ۱۴۲۵۔

کلُّ مصیبۃٍ بعدک جلل
تیرے رہتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔
میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی، برادر بھی فدا
اے شہ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

مسلمانوں کی طرف سے ستر آدمی مارے گئے، جن میں زیادہ تر انصار تھے لیکن مسلمانوں کے افلاس کا یہ حال تھا کہ اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ شہدا کی پردہ پوشی ہو سکتی۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر ایک صحابی تھے کہ ان کا پاؤں چھپایا جاتا تو سر کھل جاتا اور سر چھپایا جاتا تو پاؤں کھل جاتا۔ آخر پاؤں اذخر کی گھاس سے چھپا دیئے گئے۔ یہ دردانگیز و حیرت انگیز منظر تھا کہ بعد کو بھی جب مسلمانوں کو یاد آجاتا تو آنکھیں تر ہو جاتیں۔ شہدا بے غسل اسی طرح خون میں لتھڑے ہوئے دو دو ملا کر ایک ایک قبر میں دفن کئے گئے۔ جس کو قرآن زیادہ یاد ہوتا اس کو مقدم کیا جاتا۔ ان شہدا پر نماز جنازہ بھی اس وقت نہیں پڑھی گئی۔[1] آٹھ برس کے بعد وفات سے ایک دو برس پہلے جب آپ ادھر سے گذرے تو بے اختیار آپ پر رقت طاری ہوئی اور اس طرح آپؐ نے پُر درد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہو اور اس کے بعد آپؐ نے خطبہ دیا کہ مسلمانو! تم سے یہ خوف نہیں کہ پھر مشرک بن جاؤ گے لیکن یہ ڈر ہے کہ دنیا میں نہ پھنس جاؤ۔[2]

دونوں فوجیں جب میدان سے الگ ہوئیں تو مسلمان زخم سے چور تھے تاہم یہ خیال کر کے کہ ابو سفیان مسلمانوں کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو، آپؐ نے مسلمانوں کی طرف روئے خطاب کر کے فرمایا کہ کون ان کا تعاقب کرے گا فوراً ستر آدمیوں کی ایک جماعت اس مہم کے لئے تیار ہو گئی جن میں حضرت ابو بکرؓ و زبیرؓ بھی داخل تھے۔[3]

ابو سفیان احد سے روانہ ہو کر جب مقام روحا پہنچا، یہاں خیال آیا کہ کام ناتمام رہ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے گمان تھا، دوسرے ہی دن آپؐ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی واپس نہ جائے۔ چنانچہ حمراء الاسد تک جو مدینہ سے ۸ میل ہے تشریف لے گئے، قبیلہ خزاعہ اس وقت تک ایمان نہیں لایا تھا لیکن در پردہ اسلام کا طرف دار تھا۔ اس کا رئیس معبد خزاعی شکست کی خبر سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور واپس جا کر ابو سفیان سے ملا۔ ابو سفیان نے اپنا ارادہ ظاہر کیا، معبد نے کہا میں دیکھتا آتا ہوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سروسامان سے آرہے ہیں کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہے۔ غرض ابو سفیان واپس گیا۔[4]

یہی واقعہ ہے جس کو مورخین نے تکثیرِ غزوات کے شوق میں ایک نیا غزوہ بنا لیا ہے اور حمراء الاسد کا ایک نیا عنوان قائم کیا ہے۔

---

[1] یہ صحیح بخاری کی روایت ہے لیکن دوسری کتابوں میں بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہؓ پر تو خصوصیت کے ساتھ اور دوسرے شہدا پر بھی نماز جنازہ پڑھی۔ یہ شہدا ایک ایک کر کے اور بعض دس دس کر کے لائے جاتے تھے اور آپؐ ان پر نماز جنازہ پڑھتے تھے اور حضرت حمزہؓ کی لاش مبارک پر ہر جماعت کے ساتھ گویا ستر دفعہ یا سات دفعہ نماز ادا کی گئی۔ شرح معانی الآثار طحاوی باب الصلوٰۃ علی الشہدا۔ و نصب الرایہ زیلعی باب احادیث الصلوٰۃ علی شہید و مغازی واقدی صفحہ ۳۰ مطبوعہ کلکتہ۔ [2] یہ تمام واقعات صحیح بخاری غزوۂ احد کے متفرق ابواب میں ہیں [3] بخاری صفحہ ۵۸۴ [4] طبری صفحہ ۱۴۲۸، ۱۴۲۹ [5] مسند احمد ج ۲ ص ۸۴۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو تمام مدینہ ماتم کدہ تھا، آپ جس طرف سے گزرتے تھے گھروں سے ماتم کی آوازیں آتی تھیں۔ آپ کو عبرت ہوئی کہ سب کے عزیز و اقارب ماتم داری کا فرض ادا کر رہے ہیں، لیکن حمزہؓ کا کوئی نوحہ خواں نہیں ہے رقت کے جوش میں آپؐ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

اما حمزۃ فلا بواکی لہ — لیکن حمزہؓ کا کوئی رونے والا نہیں۔

انصار نے یہ الفاظ سُنے تو تڑپ اُٹھے۔ سب نے جا کر اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہؓ کا ماتم کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو دروازہ پر پردہ نشینانِ انصار کی بھیڑ تھی اور حضرت حمزہؓ کا ماتم بلند تھا، ان کے حق میں دعائے خیر کی اور فرمایا تمہاری ہمدردی کا شکر گزار ہوں، لیکن مُردوں پر نوحہ کرنا جائز نہیں (عرب میں دستور تھا کہ مُردوں پر عورتیں زور زور سے نوحہ اور بین کرتی تھیں، کپڑے پھاڑ لیتی تھیں، گال نوچتی، گالوں پر تھپڑ مارتی تھیں اور چیختی چلاتی تھیں، یہ رسم بد اسی دن سے بند کر دی گئی اور فرمایا گیا کہ آج سے کسی مُردہ پر نوحہ نہ کیا جائے) بعد کو ارشاد ہوا کہ اس طرح ماتم کرنا مسلمان کی شان نہیں[1]۔

(قرآن مجید میں سورۂ آل عمران میں غزوۂ اُحد کا مفصل ذکر موجود ہے)

واقعات متفرقہ ۳ھ

اسی سال یعنی ۳ھ میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ رمضان کی پندرہویں تاریخ تھی۔ اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ سے جو حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں اور غزوۂ بدر کے زمانہ میں بیوہ ہو گئی تھیں نکاح کیا۔ اسی سال حضرت عثمانؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ سے شادی کی،

وراثت کا قانون بھی اسی سال نازل ہوا، اب تک وراثت میں ذوی الارحام کا کوئی حصہ نہ تھا، انکے حقوق کی بھی تفصیل کی گئی۔ مشرکہ کا نکاح مسلمان سے اب تک جائز تھا، اس سال اس کی بھی تحریم نازل ہوئی۔

*

[1] ابن ہشام (غزوۂ احد) اور مسند احمد (۲:۴۰ و ۸۴) [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز ص۔

۴ھ

سلسلۂ غزوات و سرایا

تمام قبائل عرب بجز ایک دو کے اسلام کے دشمن تھے۔ دشمنی زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ ہر قبیلہ بُت پرستی کو اپنا دین و آئین سمجھتا تھا، اسلام اسی کو مٹاتا تھا، اس کے ساتھ قریش کا اثر تمام عرب پر تھا، حج کے زمانہ میں تمام قبائل مکہ میں جمع ہوتے تھے اور قریش ان کو اسلام کی دشمنی پر برانگیختہ کرتے تھے، ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ تمام قبائل کی وجہ معاش لوٹ اور غارت گری تھا اور اسلام اس کو نہ صرف قولاً بلکہ عملاً بھی روکتا تھا اس لئے وہ جانتے تھے کہ اسلام اگر قائم ہو گیا تو ہمارے ذرائع معاش بند ہو جائیں گے۔ تاہم بدر کی فتح نے ایک عام رعب بٹھا دیا تھا جس کی وجہ سے تمام قبیلے اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے۔ لیکن اُحد کی شکست نے حالت بدل دی اور دوبارہ تمام قبائل دفعۃً اٹھ کھڑے ہوئے، سیرت نبوی میں سرایا (چھوٹی چھوٹی لڑائیوں) کا جو ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ عام مورخوں نے اگرچہ اپنی عادت کے موافق ان لڑائیوں کے ذکر میں ان کے اسباب سے بحث نہیں کی لیکن ابن سعد نے طبقات میں اور اور ائمہ فن نے قریباً ہر واقعہ کا سبب لکھ دیا ہے، یعنی کسی خاص قبیلے نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدافعت کے لئے فوجیں بھیجیں۔

سریہ ابی سلمہ

۱- سب سے پہلے محرم ۴ھ میں طلحہ اور خویلد نے اپنے قبیلہ کو جو فید کے کوہستانی علاقہ قطن میں رہتا تھا مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے حضرت ابوسلمہ کو ایک سو پچاس مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس طرف روانہ کیا۔ یہ خبر سن کر ان کی جماعت منتشر ہو گئی[2]۔

سریہ ابن انیس

۲- اس کے بعد محرم ۴ھ میں سفیان بن خالد جو قبیلہ لحیان کا تھا اور جو کوہستان عرنہ کا رئیس تھا مدینہ پر حملہ کا قصد کیا۔ اس کے مقابلہ کے لئے آپ نے حضرت عبد اللہ بن انیسؓ کو بھیجا جنھوں نے لطائف الحیل سے موقع حاصل کیا اور سفیان کو قتل کر دیا۔

[1] غزوہ اور سریہ میں جو فرق ہے اس کی نسبت علمائے سیرت مختلف الرائے ہیں۔ زیادہ مقبول یہ رائے ہے کہ جس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے وہ غزوہ کے نام سے موسوم ہے اور جس میں صحابہ افسر مقرر کر کے بھیج دیئے جاتے تھے وہ سریہ کہلاتا تھا۔ [2] ابن سعد صفحہ ۳۵ (جلد ۲ قسم اول) اصل عبارت یہ ہے۔ بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان طلحۃ وسلمۃ ابنی خویلد قد سارا فی قومھما ومن اطاعھما یدعونھم الی حرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [3] طبقات ابن سعد صفحہ ۳۶۔ اصل عبارت یہ ہے۔ وذلک انہ بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سفیان بن خالد الھذلی قد جمع الجموع لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

صفر ۴ھ میں ابُو براء کلابی جو قبیلۂ کلاب کا رئیس تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ چند لوگوں کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں، آپؐ نے فرمایا مجھ کو نجد کی طرف سے ڈر ہے، ابو براء نے کہا ان کا میں ضامن ہوں، آپؐ نے منظور فرمایا اور ستر انصار ساتھ کر دیئے، یہ لوگ نہایت مقدس اور درویش تھے اور اکثر اصحابِ صفہ میں سے تھے، ان کا معمول تھا کہ دن بھر لکڑیاں چنتے، شام کو فروخت کر کے کچھ اصحاب صفہ کے نذر کرتے کچھ اپنے لئے رکھتے۔

بیر معونہ ان لوگوں نے بیر معونہ پہنچ کر قیام کیا اور حرام بن ملحان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط دے کر عامر بن طفیل (بن مالک بن جعفر کلابی عامری) کے پاس بھیجا جو قبیلہ کا رئیس تھا، عامر نے حرام کو قتل کر دیا اور اس پاس کے جو قبائل تھے یعنی عُصَیّہ، رِعل، ذکوان سب کے پاس آدمی دوڑا دیئے کہ تیار ہو کر آئیں۔ ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا اور عامر کی سرداری میں آگے بڑھا، صحابہؓ حرام کی واپسی کے منتظر تھے، جب دیر لگی تو خود روانہ ہوئے راستہ میں عامر کی فوج کا سامنا ہوا، کفار نے ان کو گھیر لیا اور سب کو قتل کر دیا، صرف عمروؓ بن امیۃ کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں، یہ کہہ کر ان کی چوٹی کاٹی اور چھوڑ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا۔ مہینہ بھر نماز فجر میں ان ظالموں کے حق میں بد دعا کی، حضرت عمروؓ بن امیہ نے (واپسی میں راستہ میں بنی عامر کے) دو آدمیوں کو قتل کر دیا تھا (جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امان دے چکے تھے، مگر حضرت عمروؓ بن امیہ کو اس کا علم نہ تھا، وہ یہ نہ سمجھے کہ ہم نے بنی عامر سے اُن کی اس بے وفائی کا بدلہ لے لیا جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے ساتھ کیا ہے (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُنا تو) آپؐ نے اس پر ناراضی ظاہر فرمائی اور دونوں کے خون بہا ادا کرنے کا اعلان فرمایا۔

واقعۂ رجیع انہی دنوں عضل اور قارہ جو دو مشہور قبیلے ہیں، اُن کے چند آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا ہے، چند لوگوں کو ہمارے ہاں بھیجئے کہ اسلام کے عقائد اور احکام

---

۱ ابو براء بعد کو اسلام لائے یا نہیں؛ اس میں اہل علم کا اختلاف ہے، ذہبی کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اسلام نہیں لائے۔ اصابہ میں ہے کہ اُن کے قبولِ اسلام کی کوئی روایت نہیں ہے تاہم بعض روایات کی بنا پر ایک جماعت کا خیال ہے کہ اسلام لائے تھے۔ زرقانی ج ۲ صفحہ ۸۹۔

۲ اور یہ کچھ بے جا بھی نہ تھا، عامر بن طفیل جو ان اطراف کا رئیس تھا اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ میرے تمہارے درمیان تین باتیں ہیں، بادیہ کے مالک تم ہو اور شہروں کا میں ہوں یا اپنے بعد مجھ کو اپنا جانشین بناؤ ورنہ غطفان۔

۳ صحابہ کی اس جماعت میں حضرت کعبؓ بن زید بھی تھے، کفار نے یہ سمجھا کہ یہ بھی شہید ہو گئے ہیں، لیکن ان میں جان باقی تھی اور بعد کو زندہ بچ رہے اور غزوۂ خندق میں شہید ہوئے۔ زرقانی ج ۲ صفحہ ۹۸۔

۴ حضرت عمروؓ بن امیۃ اور حضرت منذرؓ بن محمد عقبہ انصاری پیچھے تھے، جب یہ مقام حادثہ پر پہنچے تو حضرت منذرؓ کو شہید کر دیا گیا اور حضرت عمروؓ بن امیہ کو قید کر لیا گیا، اور بعد کو وہ چھوڑ دیئے گئے، زرقانی ج ۲ صفحہ ۹۷۔

۵ البدایہ والنہایہ ابن کثیر جلد ۴ زرقانی ج ۲ صفحہ ۹۳۔

سکھائیں، آپؐ نے دس شخص ساتھ کر دیئے۔ جن کے سردار حضرت عاصمؓ بن ثابت تھے، یہ لوگ جب مقام رجیع پہنچے جو عسفان اور مکہ کے وسط میں ہے تو ان غداروں نے بد عہدی کی اور قبیلۂ بنو لحیان کو اشارہ کیا کہ ان کا کام تمام کر دیں، بنو لحیان دو سو آدمی لے کر جن میں ایک سو تیر انداز تھے، ان لوگوں کے تعاقب میں چلے اور ان کے قریب آ گئے۔ ان لوگوں نے بڑھ کر ایک ٹیکرے پر پناہ لی۔ تیر اندازوں نے ان سے کہا کہ اُتر آؤ، ہم تم کو پناہ دیتے ہیں حضرت عاصمؓ نے کہا، میں کافر کی پناہ میں نہیں آتا۔ یہ کہہ کر خدا سے خطاب کیا کہ اپنے پیغمبر کو خبر پہنچا دے۔ غرض وہ مع سات آدمیوں کے لڑ کر تیر اندازوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے (قریش نے چند آدمیوں کو بھیجا کہ عاصمؓ کے بدن سے گوشت کا ایک لوتھڑا کاٹ لائیں کہ ان کی شناخت ہو۔ قدرتِ خداوندی نے شہید مسلم کی یہ تحقیر گوارا نہ کی، شہد کی مکھیوں نے لاش پر پہرہ ڈال دیا، قریش ناکام پھر گئے) لیکن (تین) شخصوں نے جن (میں سے دو) کے نام حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ (بن الدثنہ) تھے، کافروں کے وعدہ پر اعتماد کیا اور ٹیکرے سے اُتر آئے۔ کافروں نے بد عہدی کر کے ان کی مشکیں کس لیں اور مکہ میں لے جا کر بیچ ڈالا حضرت خبیبؓ نے جنگِ اُحد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا، اس لئے ان کو حارث کے لڑکوں نے خرید لیا کہ باپ کے بدلہ میں قتل کریں گے چند روز انہی کے گھر میں رہے، ایک دن حارث کی نواسی کو کھیلا رہے تھے۔ اتفاق سے ہاتھ میں چھری تھی بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آ گئی۔ دیکھا کہ حضرت خبیبؓ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے، کانپ اٹھی، حضرت خبیبؓ نے کہا، کیا تو یہ سمجھی کہ میں اس کو قتل کر دوں گا؛ ہمارا یہ کام نہیں۔ خاندانِ حارث ان کو حرم کے حدود سے باہر لے گیا اور قتل کرنا چاہا، انھوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ قاتلوں نے اجازت دی۔ انھوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا۔ دیر تک پڑھنے کو جی چاہتا تھا لیکن تم کو خیال ہوگا کہ موت سے ڈرتا ہوں۔ پھر یہ اشعار پڑھے۔

وما ان ابالی حین اقتل مسلما
علی ای شق کان للّٰہ مصرعی
وذلک فی ذات الالٰہ وان یشاء
یبارک علی اوصال شلوٍ ممزّع

جب میں اسلام کیلئے قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھ کو اس کی پرواہ نہیں کہ کس پہلو قتل کیا جاؤں گا، یہ جو کچھ ہے خالصاً خدا کے لئے ہے اگر وہ چاہے گا تو جسم کے اُن پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کرے گا۔

اسی زمانہ سے دستور ہے کہ جب کسی کو قتل کرتے ہیں تو مقتول پہلے دو رکعت نماز ادا

---

۱ بخاری (کتاب المغازی) نے اس موقع پر جو تیسرے بزرگ کا ذکر کیا ہے ان کا نام نہیں لکھا ہے، ابن اسحاق نے ان کا نام حضرت عبداللہ بن طارق بتلایا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ اسی وقت اسی موقع پر شہید کر دیئے گئے، لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ یہاں سے آگے چل کر مکہ کے راستے میں بمقام ظہران ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، زرقانی ج ۲ صفحہ ۸۔

۲ حارث کے بیٹے ابو سروعہ جنھوں نے حضرت خبیبؓ کو شہید کیا تھا، بعد کو مسلمان ہوئے اور شرفِ صحابیت سے سرفراز ہوئے (زرقانی ج ۲ صفحہ ۸)۔ ۳ صحیح بخاری میں اُسترا لکھا ہے۔

کرلیتا ہے۔ (اور یہ مستحب سمجھا جاتا ہے)

دوسرے صاحب حضرت زیدؓ تھے، ان کو صفوان بن امیہ نے قتل کے ارادہ سے خریدا تھا، ان کے قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشا دیکھنے آئے، جن میں ابوسفیان بھی تھا جب قاتل نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان نے کہا، سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل کئے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتے بولے، "خدا کی قسم! میں تو اپنی جان کو اس کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلووں میں کانٹا چبھ جائے"۔ صفوان کے غلام نسطاس نے ان کی گردن مار دی۔

ان لڑائیوں کا سلسلہ یہود کی لڑائیوں سے مل جاتا ہے اور چونکہ یہود کے واقعات اور ان کی سرگزشت تاریخ اسلام سے گوناگوں تعلقات رکھتی ہے، اس لئے ہم اُن کے واقعات مستقل حیثیت سے لکھتے ہیں، اور اس غرض کے لئے کسی قدر ہم کو پچھلے زمانہ کی طرف واپس آنا پڑے گا۔

واقعات متفرقہ ۴ھ

اسی سال شعبان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔

اسی سال ازواجِ مطہراتؓ میں سے حضرت زینب بنت خزیمہ نے انتقال فرمایا جن سے اسی سال نکاح بھی ہوا تھا۔

اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو حکم دیا کہ وہ عبرانی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لیں اور فرمایا کہ مجھ کو یہود پر اطمینان نہیں۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت زیدؓ نے صرف پندرہ دن میں عبرانی زبان سیکھ لی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں عبری زبان سے لوگ بہت کچھ آشنا تھے۔

اسی سال شوال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ سے نکاح فرمایا۔

اسی سال یہودیوں نے آپؐ کے سامنے ایک یہودی کا مقدمہ پیش کیا اور آپؐ نے توراۃ کے مطابق رجم کا حکم دیا (تفصیل ان واقعات کی دوسرے حصوں میں آئے گی)

بعض مورخین کے نزدیک شراب کی حرمت کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا لیکن اس میں روایتیں نہایت مختلف ہیں، پوری تحقیق احکام شرعیہ کے ذکر میں آئے گی۔

★

ف طبری صفحہ ۱۴۳۰ و طبقات ابن سعد، اشعار اور اکثر جزئیات واقعہ صحیح بخاری غزوۃ الرجیع سے لئے گئے ہیں نیز صحیح بخاری ہل یستاسر ومن لم یستاسر وصلی رکعتین عند القتل ؎ اس نماز کے استحباب کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خبیبؓ کے اس فعل کی اطلاع ملی تو آپؐ نے اس کو پسند فرمایا (شرح سیر کبیر سرخسی اول صفحہ ۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس استحسان نے اس نماز کو استحباب کا درجہ عطا فرمایا (الروض الانف ج ۲ ص ۱) محدثین کی اصطلاح میں اس صورت حال کو تقریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں یعنی حضورؐ کے سامنے کوئی فعل کیا گیا ہو یا حضورؐ کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہو اور حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی ہو، مگر آپؐ نے اس پر انکار نہ فرمایا ہو تو اس سے بھی اس فعل کا مسنون ومستحب یا جائز ہونا سمجھا جائے گا (ن) ؎ نسطاس نے بعد کو اسلام قبول کیا، زرقانی ج ۲ ص ۷۴ وص ۷۵۔

یہودیوں کے ساتھ معاہدہ اور جنگ

۲ھ و ۳ھ و ۴ھ

اوپر گزر چکا ہے کہ یہود مدت دراز سے مدینہ پر فرماں روا تھے۔ انصار نے آکر ان کے ساتھ تعلقات پیدا کئے اور رفتہ رفتہ حریفانہ اقتدار حاصل کیا۔ لیکن جنگِ بعاث نے اُن کی قومی طاقت توڑ دی اور اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ یہود سے ہمسری کا دعویٰ کرسکتے۔

یہود کے تین قبیلے تھے، قینقاع، نضیر، قریظہ۔ یہ سب مدینہ کے اطراف اور حوالی میں آباد تھے اور عموماً زمیندار دولت مند، تجارت پیشہ اور صناع تھے۔ قینقاع زرگری کا پیشہ کرتے تھے اور چونکہ سب میں زیادہ بہادر اور شجاع تھے اس لئے ہمیشہ اُن کے پاس اسلحہ جنگ کے ذخیرے تیار رہتے تھے۔ انصار عموماً اُن کے مقروض اور زیر بار رہتے تھے، ملکی اور تجارتی افسری کے ساتھ اُن لوگوں کا مذہبی اور علمی اثر بھی تھا۔ انصار عموماً بت پرست اور جاہل تھے اس بنا پر وہ یہود کو عزت کی آنکھ سے دیکھتے اور اُن کو اپنے سے زیادہ مہذب اور شائستہ سمجھتے تھے جن لوگوں کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے وہ منت مانتے تھے کہ ہمارا بیٹا زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنادیں گے، چنانچہ مدینہ میں اس قسم کے بہت سے جدید الیہودیۃ موجود تھے۔

یہود میں امتداد زمانہ سے نہایت اخلاقِ ذمیمہ پیدا ہو گئے تھے، ان کے امتیازی خصائص زندگی یہ تھے کہ ہر طرف لین دین کا کاروبار پھیلا رکھا تھا اور تمام آبادی اُن کے قرضوں میں زیر بار تھی اور چونکہ تنہا وہی صاحب دولت تھے اس لئے نہایت بے رحمی سے سود کی بڑی شرحیں مقرر کرتے تھے اور قرضہ کی کفالت میں لوگوں کے بال بچے یہاں تک کہ مستورات کو رہن رکھواتے تھے۔ کعب اشرف نے خود اپنے انصاری دوستوں سے یہی درخواست کی تھی اور مختلف طریقوں سے لوگوں کے مال اور جائیداد پر تصرف کرتے تھے۔

طامعی اور حرص کی شدت سے یہ حالت تھی کہ معصوم بچوں کو دو چار روپے کے زیور کے لئے پتھر سے مار ڈالتے تھے۔ دولت کی بہتات سے زنا اور بدکاری کا عام رواج تھا اور چونکہ زیادہ تر امراء اس کے مرتکب ہوتے تھے اس لئے ان کو سزا نہیں دے سکتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہاری شریعت میں زنا کی سزا صرف دُرّہ مارنا ہے؟ اس نے کہا نہیں بلکہ سنگسار کرنا ہے لیکن ہمارے شرفاء میں زنا کی کثرت ہوگئی اور جب کوئی شریف اس جرم میں پکڑا جاتا تو ہم اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ البتہ عام آدمیوں کو یہ

؎ ابوداؤد (ج ۲ ص ۹) کتاب الجہاد باب الاسیر ؎ بخاری ومسلم ذکر قتل کعب اشرف ؎ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۱۰ (کتاب الدیات، باب اذا قتل بحجر او بعصاء۔

سزا دیتے تھے۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ سنگسار کرنے کی سزا دُرّہ سے بدل دی جائے تاکہ شریف اور رذیل سب کو یکساں سزا دی جاسکے۔

اسلام مدینہ میں آیا تو یہود کو نظر آیا کہ اب اُن کا جابرانہ اور خود غرضانہ اقتدار قائم نہیں رہ سکتا، اسلام جس قدر روز بروز مدینہ میں پھیلتا جاتا تھا۔ اسی قدر یہودیوں کے مذہبی وقار کو جو اُن کو مدتوں سے حاصل تھا زوال ہوتا جاتا تھا۔ مدینہ کے مشرکین میں یہودیت جو تدریجاً پھیل رہی تھی دفعۃً رک گئی۔ نئے نئے فتوحات کی بدولت انصار جس قدر دولت مند ہوتے جاتے تھے، یہودیوں کے قرض کے شکنجوں سے آزاد ہوتے جاتے تھے۔ یہودیوں میں جو اخلاق بدعموماً پھیلے ہوئے تھے اور جن پر دولت مندی اور مذہبی پیشوائی نے پردہ ڈال رکھا تھا، اب ان کا راز فاش ہونے لگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ ان سے معاہدہ کیا تھا کہ اُن کے جان و مال سے کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا اور اُن کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ لیکن منصبِ نبوت کی حیثیت سے ذمائم اخلاق پر وعظ اور تذکیر آپ کا فرض نبوت تھا۔ قرآن مجید میں اُن کے اخلاق کی پردہ دری پر صاف صاف آیتیں نازل ہوتی تھیں۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔ (مائدہ-۶)	وہ جھوٹ باتوں کے سننے والے اور مالِ حرام کے بڑے کھانے والے ہیں۔
وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (مائدہ-۹)	اور تو ان میں سے اکثروں کو دیکھے گا کہ گناہ اور تعدی کی طرف تیزی سے بڑھتے ہیں۔
وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ (نساء-۲۲)	اور چونکہ یہ سود خوری کرتے ہیں حالانکہ ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا اور چونکہ یہ لوگوں کا مال خورد برد کر جاتے ہیں۔

ان اسباب نے تمام یہود میں اسلام کی طرف سے سخت ناراضی پھیلا دی، انھوں نے طرح طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں دینی اور اسلام کے خلاف کوششیں کرنی شروع کیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا کہ ان کی ہر طرح کی ایذا رسانیوں کو برداشت کریں۔

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (آل عمران ۱۹)	اور اہل کتاب اور مشرکوں سے تم بہت سی ایذا کی باتیں سنو گے اور اگر صبر کئے رہو اور پرہیزگاری پر قائم رہو تو یہ ہمت کے کام ہیں۔

یہودیوں نے معمول کر لیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سَلَامٌ عَلَيْكُمْ کرتے تو بجائے اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ کے اَلسَّامُ عَلَيْكَ کہتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ "تجھ کو موت آئے"۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں انھوں نے سُنا تو ان کو سخت غصہ آیا اور بے اختیار ہو کر بول اٹھیں کہ کم بختو! تم کو موت آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ

---

[1] اسباب النزول، واحدی صفحہ ۱۴۵ معہ و صحیح مسلم ص ۴۹ ذکر رجم الیہود ۱۲۔

وسلم نے فرمایا کہ نرمی سے کام لو۔ حضرت عائشہؓ نے کہا۔ آپ نے کچھ سُنا بھی کہ لوگوں نے کیا کہا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں، لیکن یہ کافی ہے کہ میں نے علیک کہہ دیا۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف معاملات اور درگزر ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، اکثر معاشرت کی باتوں میں یہود کے ساتھ اتفاق فرماتے اور ان کی مذہبی توقیر قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ بالوں میں مانگ نکالتے تھے، بخلاف اس کے یہودی بالوں کو یوں ہی چھوڑ دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہودیوں ہی کی موافقت کرتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے۔

وکان یحب موافقۃ اھل الکتاب فیما لم یؤمر فیہ بشیءٍ (ج ۲ ص ۸۷۵ کتاب اللباس باب الفرق) (بخاری)	اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن چیزوں میں جن میں کوئی خاص حکم الٰہی نہیں ہوتا تھا اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھتے ہیں آپ نے بھی حکم دیا کہ لوگ عاشورہ کا روزہ رکھیں۔[2] کسی یہودی کا جنازہ گزرتا تو آپ تعظیماً کھڑے ہو جاتے۔[3]

ایک دفعہ ایک یہودی نے حضرت موسیٰؑ کی فضیلت اس طرح بیان کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہیں۔ اس پر ایک انصاری کو غصہ آگیا۔ انھوں نے اس کو تھپڑ مارا۔ یہودی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپ نے فرمایا۔ مجھ کو اور پیغمبروں پر (ایسی) فضیلت نہ دو (جس سے ان کا نقص لازم آئے) قیامت کے دن لوگ بے ہوش ہو جائیں گے اور سب سے پہلے مجھ کو ہوش آئے گا، اس وقت میں دیکھوں گا کہ موسیٰؑ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں۔[4]

احکامِ الٰہی جو قرآن مجید میں نازل ہو رہے تھے سرتاپا اہلِ کتاب کے ساتھ مدارات اور معاشرت کی ترغیب میں تھے۔

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ (مائدہ-۱)	اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔

عموماً ان کی قدر و منزلت کا خیال دلایا جاتا تھا۔

يٰبَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْۤ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (بقرہ-۱۵)	اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کا خیال کرو، جو میں نے تم کو دیں اور یہ کہ میں نے تم کو تمام عالم پر فضیلت دی ہے۔

تبلیغِ اسلام کی حیثیت سے جو کچھ اس وقت اُن کے سامنے پیش کیا جاتا تھا صرف اس قدر تھا۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ	کہہ دو کہ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جس کو ہم تم دونوں یکساں مانتے ہیں، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ

---

[1] یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے [2] بخاری جلد اول صفحہ ۵۶۲ (باب اتیان الیہود النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین قدم المدینۃ) [3] بخاری (ج ۱ ص ۱۷۵) کتاب الجنائز [4] بخاری ج ۲ ص ۶۶۸ تفسیر سورۂ اعراف۔

شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران-۷)

پوجیں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی خدا کو چھوڑ کر کسی کو اپنا رب نہ بنائے تو اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ اچھا تم گواہ رہو، ہم تو مسلمان ہیں۔

ان باتوں میں سے ایک بھی اُن کے معتقدات اور مزعومات کے خلاف نہ تھی، لیکن ان تمام مہربانیوں اور اظہارِ لطف و مدارۃ کا جو صلہ تھا یہ تھا کہ انہوں نے ہر طرح سے اسلام کی خانہ براندازی کا عزم کر لیا، اسلام کی عظمت اور وقار کم کرنے کے لئے مشرکوں سے کہتے تھے کہ مذہب میں مسلمانوں سے تو تم ہی اچھے ہو۔

وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (نساء-۸)

اور کافروں کی نسبت کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے یہ زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔

مذہب اسلام کی بے اعتباری پھیلانے کے لئے یہاں تک آمادہ ہوتے کہ مسلمان ہو کر پھر مرتد ہو جائیں تاکہ لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا؟

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (آل عمران-۸)

اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو اترا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ شاید کہ وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائیں۔

ان باتوں کے علاوہ اسلام کی بربادی کی مُلکی تدبیریں اختیار کیں، وہ یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو جو قوت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ انصار کے دو قبیلے اوس اور خزرج جو باہم لڑتے بھڑتے رہتے تھے، اسلام نے باہم ان کو متحد کر دیا ہے۔ ان دونوں کو اگر پھر لڑوا دیا جاتے تو اسلام خود بخود فنا ہو جاتے گا۔ عرب میں پچھلی کینہ آوریوں کو تازہ کر دینا نہایت آسان کام تھا۔ ایک دفعہ دونوں قبیلوں کے بہت سے آدمی جلسہ میں بیٹھ کر بات چیت کر رہے تھے، چند یہودیوں نے اس صحبت میں جا کر جنگِ بعاث کا تذکرہ چھیڑا، یہ وہ لڑائی تھی جس میں انصار کے یہ دونوں قبیلے آپس میں لڑے تھے اور اسی لڑائی نے ان کی تمام قوت برباد کر دی تھی، اس لڑائی کے تذکرہ نے دونوں کو پرانے واقعے یاد دلائے اور دفعۃً عداوت کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی، لعن طعن سے گزر کر تلواریں کھنچ گئیں۔ حسن اتفاق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو گئی۔ آپؐ نے فوراً موقع پر پہنچ کر وعظ و پند سے دونوں فریق کو ٹھنڈا کیا، اس پر یہ آیت اتری۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ (آل عمران-۱۰)

مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے بعض لوگوں کا کہنا مانو گے تو وہ تم کو ایمان لاتے بعد پھر کافر بنا دیں گے۔

منافقین کا ایک گروہ پہلے سے موجود تھا، جو اگرچہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا لیکن درحقیقت اسلام کا سخت

---

[۱] اصابہ فی احوال الصحابہ علامہ حافظ ابن حجر العسقلانی، مطبوعہ مصر ج ۱ صفحہ ۸۸۔

دشمن تھا، اس گروہ کا سردار عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا، یہودیوں نے اس کو نہایت آسانی سے در پردہ ملا لیا اور اُن کے ساتھ مل کر سازش شروع کی۔ اتفاق یہ کہ عبداللہ بن ابی پہلے سے بھی بنی نضیر کا حلیف اور ہم پیمان تھا۔

قریش نے بدر سے پہلے عبداللہ بن اُبی کو لکھا تھا کہ مسلمانوں کو نکال دو، ورنہ ہم آکر تمہارا استیصال کر دیں گے لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ تو بدر کے بعد انہوں نے یہود کو خط لکھا۔

انکم اهل الحلقة والحصون وانکم تقاتلن صاحبنا او لنفعلن کذا وکذا ولا یحول بیننا وبین خدم نسائکم شیء[۱].

تم لوگوں کے پاس اسلحۂ جنگ اور قلعہ جات ہیں، تم ہمارے حریف (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑو، ورنہ ہم تمہارے ساتھ یہ یہ کریں گے اور یہ کوئی چیز ہم کو تمہاری عورتوں کے کڑوں تک پہنچنے سے روک نہ سکے گی۔

ابوداؤد نے چونکہ بنو نضیر کے ذکر میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، اس لئے صرف بنو نضیر کا نام لیا ہے ورنہ قریش کا خط عالم یہود کے نام تھا اور نتیجہ بھی عام تھا، اسی بنا پر محدث حاکم نے بنو نضیر اور قینقاع دونوں کے واقعہ کو ایک ہی واقعہ خیال کیا ہے۔ غرض اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو گھر سے نکلتے تھے تو یہودیوں کی وجہ سے جان کا خطرہ رہتا تھا۔ حضرت طلحہؓ بن براء ایک صحابی تھے، انہوں نے انتقال کے وقت وصیت کی کہ اگر میں رات کے وقت مروں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہ کرنا۔ اس لئے کہ یہود کی طرف سے ڈر ہے، ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپؐ پر حادثہ گزر جاتے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابوداؤد وغیرہ کی سند سے پورا واقعہ نقل کیا ہے[۲]۔

شوال ۲ھ غزوۂ بنی قینقاع

بدر کی فتح نے یہود کو زیادہ اندیشہ ناک کر دیا، ان کو علانیہ نظر آیا کہ اسلام اب ایک طاقت بنا جاتا ہے اور چونکہ قبائل یہود میں سب سے زیادہ جری اور بہادر بنو قینقاعؑ تھے، اس لئے سب سے پہلے انہی نے اعلانِ جنگ کی جرأت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معاہدہ کیا تھا، سب سے پہلے ان ہی نے اس کی عہد شکنی کی، ابن ہشام و طبری نے ابن اسحاق کی روایت سے عاصم بن قتادہ انصاری کی روایت نقل کی ہے۔

ان بنی قینقاع کانوا اول یهود نقضوا ما بینهم وبین رسول الله صلی الله علیه وسلم وحاربوا فیما بین بدر واُحد۔

بنو قینقاع پہلے یہود تھے جنہوں نے اس معاہدہ کو جو اُن میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا توڑ ڈالا اور بدر اور اُحد کے درمیانی زمانہ میں مسلمانوں سے لڑائی کی۔

ابن سعد نے غزوہ بنو قینقاع کے ذکر میں لکھا ہے۔

فلما کانت وقعة بدر اظهروا البغی والحسد ونبذوا العهد والمرة (زرقانی جلد ۱ ص ۵۳۶)

واقعہ بدر میں یہودیوں نے شورش اور حسد ظاہر کیا اور عہد کو توڑ ڈالا۔

---

[۱] سنن ابی داؤد ذکر نضیر کتاب الخراج والامارۃ۔ [۲] دیکھو اصابہ ترجمہ طلحہ بن براء۔ [۳] طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول صفحہ ۱۹۔

ایک اتفاقیہ سبب پیش آگیا جس نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ایک انصاری (کی بیوی) مدینہ کے بازار میں ایک یہودی کی دکان میں (نقاب پوش) آئیں۔ یہودیوں نے ان کی بے حرمتی کی، ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بیتاب ہوگیا اور اس نے یہودی کو مار ڈالا، یہودیوں نے مسلمان کو قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو اُن کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ خدا سے ڈرو، ایسا نہ ہو تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب آئے۔ بولے کہ ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے، چونکہ ان کی طرف سے نقضِ عہد اور اعلانِ جنگ ہوگیا تھا مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی کی۔ وہ قلعہ بند ہوئے۔ پندرہ دن تک محاصرہ رہا۔ بالآخر اسی پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ کریں گے اُن کو منظور ہوگا۔ عبداللہ بن اُبی ان کا حلیف تھا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ وہ جلاوطن کر دیئے جائیں۔ غرض وہ اذرِعات میں جو شام کے علاقہ میں ہے جلاوطن کر دیئے گئے۔ یہ سات سو شخص تھے جن میں تین سو زرہ پوش تھے۔ یہ شوال ۲ھ کا واقعہ ہے۔

قتل کعب بن اشرف ربیع الاول ۳ھ

یہودیوں میں کعب بن اشرف ایک مشہور شاعر تھا اس کے باپ اشرف نے جو قبیلہ طے سے تھا مدینہ میں بنو نضیر کا حلیف ہو کر اس قدر عزت اور اعتبار کیا کہ ابو رافع بن ابی الحقیق جو یہود کے مقتدا، اور تاجر الحجاز جس کا خطاب تھا اس کی لڑکی سے شادی کی۔ کعب اس کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس دو طرفہ رشتہ داری کی بنا پر کعب یہود اور عرب سے برابر کا تعلق رکھتا تھا اور شاعری کی وجہ سے قوم پر اس کا عام اثر تھا۔ رفتہ رفتہ دولت مندی کی وجہ سے تمام یہودیانِ عرب کا رئیس بن گیا، یہودی علماء اور پیشوایانِ مذہب کی تنخواہیں مقرر کیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے اور علمائے یہود اس سے ماہواریں لینے آئے تو اس نے ان لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق رائے دریافت کی اور جب اپنا ہم خیال بنا لیا تب ان کے مقررہ روزینہ جاری کئے۔

اس کو اسلام سے سخت عداوت تھی۔ بدر کی لڑائی میں سردارانِ قریش مارے گئے تو اس کو نہایت صدمہ ہوا۔ تعزیت کے لئے مکہ گیا۔ کشتگانِ بدر کے پُر درد مرثیے جن میں انتقام کی ترغیب تھی لوگوں کو جمع کر کے نہایت درد سے پڑھتا اور روتا اور رُلاتا تھا۔ ابن ہشام نے ان واقعات کے ساتھ اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے اشعار اکثر مصنوعی ہیں تاہم جہاں تک اس زمانے کی زبان معلوم ہوتی ہے ہم ایک دو شعر نقل کرتے ہیں۔

---

[1] عام اربابِ سیر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قتل کر دینا چاہتے تھے عبداللہ بن ابی کے اصرار سے مجبور ہوگئے، لیکن سنن ابی داؤد میں جس طرح یہ واقعہ مذکور ہے اس سے اس قیاس کی غلطی ثابت ہوتی ہے
[2] صحیح بخاری باب قتل الغائم المشرک [3] الخمیس صفحہ ۴۶۴ [4] زرقانی (ج ۲ ص ۹) بہ حوالہ ابن اسحاق وغیرہ۔

طحنت رحی بدر لمھلک اھلہ — جنگِ بدر کی چکی نے اہلِ بدر کو پیس ڈالا۔
ولمثل بدر تستھل وتدمع — بدر جیسے واقعات کے لئے رونا پیٹنا چاہیئے
کم قد اصیب بہ من ابیض ماجد — کتنے شریف سپید و بارونق چہرے جن کے یہاں
ذی بھجۃ تاوی الیہ الضیع — اہلِ حاجت پناہ لیتے تھے، مارے گئے۔

مدینہ میں واپس آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہنا اور لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برخلاف برانگیختہ کرنا شروع کیا۔ عرب میں شاعری کا وہ اثر تھا جو آج یورپ میں بڑے بڑے ملکی مدبروں کی پرجوش تقریروں اور نامور اخبارات کی تحریروں کا ہوتا ہے، تنہا ایک شاعر قبیلہ کے قبیلہ میں شعر کہہ کر آگ لگا دیتا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں چالیس آدمی لے کر گیا، وہاں ابوسفیان سے ملا اور اس کو بدر کے انتقام پر برانگیختہ کیا اور ابوسفیان سب کو لے کر حرم میں آیا، سب نے حرم کا پردہ تھام کر معاہدہ کیا کہ بدر کا انتقام لیں گے۔

اس پر اکتفا نہ کر کے قصد کیا کہ چپکے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرا دے۔ علامہ یعقوبی اپنی تاریخ میں بنو نضیر کے واقعہ میں لکھتے ہیں۔

کعب بن الاشرف الیھودی الذی اراد ان یمکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ — کعب بن اشرف یہودی جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکے میں قتل کر دینا چاہا۔

اس روایت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں (ذکرِ کعب بن اشرف میں) عکرمہ کی سند سے نقل کی ہے کہ کعب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت میں بلایا اور لوگوں کو متعین کر دیا کہ جب آپ تشریف لائیں تو دھوکے سے آپ کو ہلاک کر دیں۔ حافظ ابن حجر نے گو لکھا ہے کہ اس روایت کی سند میں ضعف ہے لیکن جب قرائن اور دیگر شواہد موجود ہیں تو یہ ضعف رفع ہو جاتا ہے۔

فتنہ انگیزی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو آپ نے بعض صحابہؓ سے شکایت کی اور آپ کی مرضی سے حضرت محمد بن مسلمہ نے بمشورہ رؤسائے اوس جا کر اس کو ربیع الاول ۳ھ میں قتل کر دیا۔ اربابِ روایت نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہ نے آپ کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہم کو کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔ اربابِ سیر نے اس کے معنی یہ لگائے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ باتیں کہنے کی اجازت مانگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی، کیونکہ اَلْحَرْبُ خُدْعَۃٌ یعنی لڑائی میں دھوکہ دینا جائز ہے لیکن بخاری کی روایت میں صرف یہ لفظ ہے۔

فاذن لی ان اقول۔ — ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم گفتگو کریں۔

---

[1] ابوداؤد میں ہے وکان کعب بن الاشرف یھجو النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویحرض علیہ کفار قریش (ابوداؤد ج ۲ باب کیف کان اخراج الیھود کتاب الخراج والامارۃ) [2] ابن سعد میں ہے کان رجلا شاعرا یھجو النبی واصحابہ ویحرض علیہ (تفسیر ابن جریر طبری ج ۵ ص ۸۵) میں ہے ان کعب بن الاشرف انطلق الی المشرکین من کفار قریش فاستجاشھم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وامرھم ان یغزوہ [3] خمیس ص ۴۱۵ غالباً یہ وہی پہلا واقعہ ہے۔ ابن خمیس نے اس کے متعلق مزید تفصیل بیان کی ہے [4] ج ۲، ص ۲۵۹ [5] ابن سعد مغازی ص ۲۱۔

اس سے غلط گوئی کی اجازت کہاں نکلتی ہے؟ (لیکن جو گفتگو ہوئی اس سے کعب اور عموماً یہود کے اخلاق اور دلی خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت محمدؐ بن مسلمہ نے کہا۔ ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دے کر تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا اور ہم سے بار بار صدقہ مانگا جاتا ہے۔ اب تم سے کچھ رکھ کر قرض لینا ہے۔ کعب نے کہا تم خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتا جاؤ گے۔ اچھا قرض کے لئے اپنی بیویوں کو رہن رکھو۔ محمدؐ بن مسلمہ نے کہا۔ تمہارے اس حسن وجمال کے سبب سے ہم کو اپنی بیویوں پر وفاداری کا یقین نہیں۔ اس نے کہا۔ اچھا اپنے بچوں کو گرو رکھو۔ انہوں نے کہا اس سے تو تمام عرب میں ہماری بدنامی ہوگی۔ ہم اپنے ہتھیار گرو رکھیں گے اور تم جانتے ہو آج کل ان کی جیسی ضرورت ہے[1]۔

صحیح بخاری میں جو روایت ہے اس میں قتل کا واقعہ اس طرح منقول ہے کہ ان لوگوں نے دوستانہ طریقے سے اس کو گھر سے بلایا، پھر بال سونگھنے کے بہانہ سے اس کی چوٹی پکڑ لی اور قتل کر ڈالا۔ لیکن روایت میں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کی اجازت دی تھی۔ اس وقت تک عرب میں ان طریقوں سے قتل کرنا معیوب بات نہ تھی۔ آگے چل کر نہایت مفصل طور سے ایک مستقل عنوان میں یہ بحث آئے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح تدریج کے ساتھ عرب کے ان طریقوں کی اصلاح کی۔

غزوہ بنو نضیر ربیع الاول ۴ھ

حضرت عمرو بن امیہ نے قبیلۂ عامر کے (جو) دو آدمی قتل کر دیئے تھے اور جن کا خون بہا اب تک واجب الادا تھا اور جس کا ایک حصہ معاہدہ کی رُو سے یہود بنی نضیر پر واجب الادا تھا۔ اس کے مطالبہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے انھوں نے قبول کیا لیکن درپردہ یہ سازش کی کہ ایک شخص چپکے سے بالاخانہ پر چڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر گرا دے۔ اتفاق سے اس وقت آپؐ بالاخانہ کی دیوار کے سایہ میں کھڑے تھے۔

عمرو بن جحاش ایک یہودی اس ارادہ سے کوٹھے پر چڑھا۔ آپؐ کو اس کے ارادہ کا حال معلوم ہو گیا اور آپؐ فوراً مدینہ واپس چلے آئے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ قریش نے بنو نضیر کو کہلا بھیجا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دو، ورنہ ہم خود آکر تمہارا استیصال کر دیں گے۔ بنو نضیر پہلے سے اسلام کے دشمن تھے، قریش کے پیغام نے ان کو اور زیادہ آمادہ کیا۔ بنو نضیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپؐ تیس آدمیوں کو لے کر آئیں، ہم بھی اپنے احبار کو لے کر آئیں گے۔ آپؐ کا کلام

---

[1] زرقانی ج ۲ ص ۱۳ و صحیح بخاری قتل کعب بن اشرف۔ [2] صحیح بخاری باب قتل کعب (کتاب المغازی)۔ [3] بنی نضیر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے متعلق جو گفتگو کی اس کی دو تشریحیں کی گئی ہیں۔ ایک تشریح تو وہ ہے جس کو مصنف نے اختیار فرمایا ہے دوسری تشریح یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر سے جو گفتگو فرمائی تھی اس کا ماحصل یہ ہے کہ قبیلۂ عامر کو دیت کس طرح ادا کی جائے اور ان کے یہاں دیت کا دستور کیا ہے؟ بنی نضیر اور قبیلۂ عامر کے باہم تعلقات اچھے تھے اس لئے ان سے اس مسئلہ میں گفتگو قرین قیاس بھی ہے۔ سیرت حلبیہ ج ۲ ص ۲۶۴ [4] یہ روایت ابن ہشام وغیرہ میں مذکور ہے۔ زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے جو صحیح ترین مغازی ہے یہ عبارت نقل کی ہے وکانوا قد دسوا الی قریش فی قتالہ صلی اللہ علیہ وسلم فحضوھم علی القتال ودلوھم علی العورۃ (زرقانی ص ۷۹ ج ۲) یعنی ان لوگوں نے قریش سے درپردہ سازش کر کے ان کو آمادۂ جنگ کیا اور ان کو مخفی مواقع بتلائے۔

سن کر اگر ہمارے احبار آپؐ کی تصدیق کریں گے تو ہم کو بھی کچھ عذر نہ ہوگا۔ چونکہ وہ بغاوت کی تیاری کر چکے تھے۔ آپؐ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک معاہدہ نہ لکھ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ آپؐ یہود بنی قریظہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدید معاہدہ کی درخواست کی۔ انھوں نے تعمیل کی۔ بنو نضیر کے لئے یہ نظیر موجود تھی کہ ان کے برادران دینی نے معاہدہ لکھ دیا ہے لیکن وہ کسی طرح معاہدہ کرنے پر راضی نہ ہوتے۔ بالآخر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپؐ تین آدمی لے کر آئیں۔ ہم بھی تین عالم ساتھ لے کر آتے ہیں۔ یہ علما۔ اگر آپؐ پر ایمان لائیں گے تو ہم بھی لائیں گے۔ آپؐ نے منظور فرمایا۔ لیکن راہ میں آپؐ کو ایک ہیچ ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہود تلواریں باندھ کر تیار ہیں کہ جب آپؐ تشریف لائیں تو آپؐ کو قتل کر دیں[1]۔

بنو نضیر کی سرکشی کے مختلف اسباب تھے۔ وہ نہایت مضبوط قلعوں میں پناہ گزین تھے جن کا فتح کرنا آسان نہ تھا، اس کے ساتھ عبداللہ بن اُبی نے کہلا بھیجا تھا کہ تم اطاعت نہ کرنا۔ بنو قریظہ تمہارا ساتھ دیں گے۔ اور میں دو ہزار آدمی لے کر تمہاری اعانت کروں گا۔ قرآن مجید میں ہے۔

> أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ (حشر-۲)

تم نے دیکھا منافق اپنے کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ تم نکلو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمہارے باب میں کسی کا کہنا نہ مانیں گے اور اگر تم سے کوئی لڑا تو ہم بھی تمہاری مدد کو آئیں گے۔

لیکن بنو نضیر کے تمام خیالات غلط نکلے۔ بنو قریظہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور منافق اعلانیہ اسلام کے مقابل میں آ نہیں سکتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کیا، قلعہ کے گرد جو ان کے نخلستان تھے ان کے چند درخت کٹوا دیئے۔ سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ سب نخلستان نہیں کاٹا گیا بلکہ صرف لینہ جو ایک خاص قسم کی کھجور ہے اور عرب کی عام خوراک نہیں ہے اس کے درخت کٹوا دیئے گئے تھے۔ قرآن مجید میں بھی اسی کا ذکر ہے۔

> مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَى أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ (سورہ حشر-۱)

تم نے لینہ کے جو درخت کٹوائے اور جس قدر قائم رہنے دیئے سب خدا کے حکم سے تھا تاکہ خدا فاسقوں کو رسوا کرے۔

ممکن ہے کہ درختوں کے جھنڈ سے کمین گاہ کا کام لیا جاتا ہو اس لئے وہ صاف کرا دیئے گئے کہ محاصرہ

---

[1] یہ تمام تفصیل سنن ابی داؤد (خبر النضیر کتاب الخراج والامارہ ص ۲) میں ہے تعجب ہے کہ ارباب سیرت ابو داؤد کی اس روایت سے بالکل بے خبر ہیں۔ [2] فتح الباری واقعہ غزوہ بنو نضیر جلد سابع صفحہ ۲۵۵ فتح الباری میں یہ روایت ابن مردویہ سے نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ صحیح بخاری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنو نضیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی قسم کی عیاری کا ارادہ کیا تھا۔ بخاری میں ترجمۃ الباب یہ ہے۔ باب حدیث بنی النضیر ومخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیہم فی دیۃ الرجلین وما ارادوا من الغدر برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔

بالآخر بنو نضیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ جس قدر مال واسباب اونٹوں پر لے جاسکیں لے جائیں اور مدینہ سے باہر نکل جائیں چنانچہ سب گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے۔ ان میں سے معزز رؤسا مثلاً سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن الربیع، حیئ بن اخطب خیبر چلے گئے۔ وہاں لوگوں نے ان کا اس قدر احترام کیا کہ خیبر کا رئیس تسلیم کرلیا، اس واقعہ کو اس غرض سے یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ غزوہ خیبر کی داستان کا دیباچہ ہے۔

بنو نضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے لیکن اس شان سے نکلے کہ جشن کا دھوکہ ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے، ساتھ ساتھ باجا بجتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں، عروۃ بن الورد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا وہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ اہل مدینہ کا بیان ہے کہ اس سروسامان کی سواری کبھی ان کی نظر سے نہیں گزری تھی ہتھیار[1] کا ذخیرہ جو ان لوگوں نے چھوڑا، اس میں پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں۔ ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنھوں نے یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا اور یہودی ان کو اتحادِ مذہب کی وجہ سے ساتھ لئے جاتے تھے انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے۔ اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری۔

لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ۔ یعنی مذہب میں زبردستی نہیں ہے۔

ابوداؤد نے کتاب الجہاد باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام کے عنوان کے نیچے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

*

[1] مصنف کے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام احمد کے نزدیک درخت وغیرہ میدانِ جنگ میں اسی وقت کاٹے جاتے ہیں، جب کہ کاٹے بغیر چارہ کار نہ ہو۔ محدثین نے امام احمد کا یہ قول اسی واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے، نیز اس موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ اسحاق کا قول ہے کہ اگر دشمن درختوں کی آڑ میں ہو تو ان میں آگ لگا دینا سنت ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان ائمہ کے نزدیک اس موقع پر درخت کا کاٹنا جنگی ضرورت کا تقاضا۔ تھا عمدۃ القاری ج ۷ ص ۱۴۷ [2] طبری ص ۱۴۵۲ [3] یہ تفصیل طبری میں ہے (ص ۱۴۵۲) (س)۔

۵ھ

غزوۂ مریسیع، واقعۂ افک و غزوۂ احزاب

قریش اور یہود کی متفقہ سازش نے اب مکہ سے لے کر مدینہ تک آگ لگا دی، جس قدر قبائل تھے سب نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ سب سے پہلے انمار اور ثعلبہ نے یہ ارادہ کیا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوگئی۔ ۱۰ المحرم ۵ھ کو آپ مدینہ سے چار سو صحابہ کو لے کر نکلے اور ذات الرقاع تک تشریف لے گئے لیکن آپ کی آمد سن کر وہ پہاڑوں میں بھاگ گئے[1]۔

ربیع الاول ۵ھ میں یہ خبر آئی کہ دومۃ الجندل میں کفار کی ایک عظیم الشان فوج جمع ہو رہی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار جمعیت لے کر مدینہ سے نکلے، ان کو خبر ہوئی تو وہ بھاگ گئے۔

غزوۂ مریسیع یا بنی مصطلق شعبان ۵ھ

خزاعہ ایک قبیلہ تھا جو قریش کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ قریش کو ایک زمانہ میں یہ خیال آیا کہ ہم ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں۔ اس لئے ہم کو اوروں سے ہر باب میں ممتاز ہونا چاہیئے۔ حج کا ایک بڑا رکن عرفات کے میدان میں قیام کرنا ہے لیکن چونکہ یہ میدان حرم کی حدود سے باہر ہے۔ قریش نے یہ قاعدہ قرار دیا کہ لوگ عرفات جائیں لیکن ہم کو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں ٹھہرنا چاہیئے جو حدودِ حرم کے اندر ہے۔ اسی قسم کی اور امتیازی باتیں قائم کیں، ان خصائص کی بنا پر اپنا لقب احمس رکھا، لیکن اس قدر فیاضی کی کہ جو لوگ ان پابندیوں کو قبول کر لیتے تھے ان کو بھی یہ لقب دے دیتے اور ان سے رشتہ ناطہ کرتے تھے۔ قبیلۂ خزاعہ کو بھی یہ شرف عطا کیا تھا۔

خزاعہ کا ایک خاندان بنو المصطلق کہلاتا تھا، وہ مقام مریسیع میں جو مدینہ منورہ سے ۹ منزل ہے، آباد تھا، اس خاندان کا رئیس حارث بن ابی ضرار تھا۔ اس نے قریش کے اشارہ سے یا خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ہوئی تو مزید تحقیقات کے لئے حضرت زیدؓ بن خصیب کو بھیجا، انہوں نے واپس آکر خبر کی تصدیق کی۔ آپؐ نے صحابہؓ کو تیاری کا حکم دیا۔ ۲ شعبان کو فوجیں مدینے سے روانہ ہوئیں۔ مریسیع میں خبر پہنچی کہ حارث کی جمعیت منتشر ہوگئی اور وہ خود بھی کسی طرف نکل گیا۔ لیکن مریسیع میں جو لوگ آباد تھے انھوں نے صف آرائی کی اور دیر تک

[1] ابن سعد غزوہ ذات الرقاع صفحہ ۴۳ (صحیح بخاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزوہ ذات الرقاع خندق کے بعد واقع ہوا۔ صلوٰۃ الخوف سب سے پہلے اسی غزوہ میں ادا کی گئی) [2] ابن اسحٰق نے جس کی پیروی طبری اور ابن ہشام نے کی ہے، اس غزوہ کو ۵ھ میں ذکر کیا ہے۔ موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے کہ ۴ھ میں واقع ہوا۔ امام بخاری نے بھی صحیح میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے لیکن غلطی سے ۴ھ کے بجائے ابن عقبہ کی طرف ۵ھ کی نسبت کی ہے۔ علامہ ابن حجر نے فتح الباری (جلد ۷، صفحہ ۳۳۲) میں بیہقی، حاکم، موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر کی روایتوں سے ۵ھ کو ترجیح دی ہے۔ ابن سعد نے بھی ۵ھ ہی لکھا ہے تنقیہ۔ [3] دیکھو فتح الباری ص [4] یہ واقعات ابن ہشام نے تفصیل سے لکھے ہیں۔

جم کر تیر برساتے رہے۔ مسلمانوں نے دفعۃً ایک ساتھ حملہ کیا تو اُن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دس آدمی مارے گئے اور باقی گرفتار ہو گئے جن کی تعداد تقریباً ۶۰۰ تھی۔ غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور چار پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔

یہ ابن سعد کی روایت ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو المصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ بالکل بے خبر اور غافل تھے اور اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ ابن سعد نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے لیکن لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اس پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ صحیحین کی روایت پر سیرت کی روایتوں کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحیحین کی روایت بھی اصول حدیث کی رو سے حجت نہیں ہے کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف نافع نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بھی نہ تھا۔ اس لئے یہ روایت اصطلاح محدثین میں منقطع ہے۔[ع]

یہ لڑائی ایک معمولی لڑائی تھی۔ لیکن اتفاق سے بعض شہرت پذیر واقعات ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے اس لڑائی کا خاص عنوان قائم کیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی فوج میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ بدباطن ہر موقع پر فتنہ گری کی کوشش کرتے تھے۔ ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا۔ انصاری نے عرب کے قدیم طریقہ پر یا للانصار کا نعرہ مارا (انصار کی جے)، مہاجر نے بھی یا معاشر المہاجرین کے نعرہ سے جواب دیا۔ نعرے سُن کر قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے۔ لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ عبداللہ بن اُبی جو رئیس المنافقین تھا، اس کو موقع ہاتھ آیا۔ انصار سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم نے یہ بلا خود مول لی، مہاجرین کو تم نے بلا کر اتنا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وقت اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے، تم دستگیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے"۔

یہ واقعہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر کہا حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، غصہ سے بے تاب ہو گئے اور عرض کی کہ کسی کو ارشاد ہو اس منافق کی گردن اڑا دے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چرچا پسند کرتے ہو کہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں۔[۴]

یہ عجیب بات ہے کہ عبداللہ بن اُبی جس درجہ کا منافق اور دشمن اسلام تھا اس کے صاحبزادے کہ ان کا نام بھی عبداللہ تھا اسی قدر اسلام کے جاں نثار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپ عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دینے والے ہیں۔ یہ سُن کر وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گزار ہوں، لیکن اگر یہ مرضی ہے تو مجھ ہی کو حکم ہو، میں ابھی اس کا سر کاٹ لاتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کسی اور کو حکم دیں اور میں غیرت و محبت کے جوش میں آکر قاتل کو قتل کر دوں۔ آپ

---

[۱] باب العتق [۲] کتاب الجہاد والسیر [۳] طبقات ابن سعد جلد مغازی صفحہ ۴۵، ۴۶ [ع] معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صرف آغاز سند کو ملاحظہ فرما کر اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے ورنہ متن حدیث کے بعد تصریح ہے کہ حدثنی ہذا الحدیث عبداللہ ابن عمر وکان فی ذالک الجیش یعنی نافع نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سنا جو اس لڑائی میں شریک تھے (مسلم کتاب الجہاد و بخاری کتاب العتق) اس تصریح کے بعد یہ روایت منقطع نہیں باقی رہتی ہے"۔ س۔ [۴] دیکھو صحیح بخاری صفحہ ۷۲۸۔

نے اطمینان دلایا کہ قتل کی بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا۔ یہ ارشاد اس طرح پورا ہوا کہ جب وہ مرا تو کفن کے لئے آپ نے خود پیراہن مبارک عنایت فرما کر جنازہ کی نماز پڑھائی۔ حضرت عمرؓ نے دامن تھام لیا کہ منافق کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں؟ لیکن دریائے کرم کا بہاؤ کون روک سکتا تھا۔

حضرت جویریہؓ کا واقعہ

لڑائی میں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں جو حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں۔ ابن اسحاق کی روایت ہے جو بعض حدیث کی کتابوں میں بھی ہے کہ تمام اسیران جنگ لونڈی، غلام بنا کر تقسیم کر دیئے گئے۔ حضرت جویریہؓ، حضرت ثابتؓ بن قیس کے حصہ میں آئیں۔ انھوں نے حضرت ثابتؓ سے درخواست کی کہ مکاتبت کر لو یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑ دو۔ حضرت ثابتؓ نے منظور کیا، حضرت جویریہؓ کے پاس روپیہ نہ تھا۔ چاہا کہ لوگوں سے چندہ مانگ کر یہ رقم ادا کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی آئیں۔ حضرت عائشہؓ بھی وہاں موجود تھیں۔

ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ کی زبانی روایت کی ہے جو یقیناً اُن کی ذاتی رائے ہے کہ چونکہ حضرت جویریہؓ نہایت شیریں ادا تھیں، میں نے اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے دیکھا تو سمجھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ان کے حسن و جمال کا وہی اثر ہو گا جو مجھ پر ہوا۔ غرض وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں (آپ نے فرمایا اگر اس سے بہتر برتاؤ تمہارے ساتھ کیا جائے تو قبول کرو گی؟ انھوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا تمہاری طرف سے میں روپیہ ادا کر دوں اور تم کو اپنی زوجیت میں لے لوں۔ حضرت جویریہؓ نے کہا۔ میں نے منظور کیا، آپ نے تنہا وہ تمام رقم ادا کر دی اور ان سے شادی کر لی۔

یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جو ابن ہشام اور ابوداؤد دونوں میں موجود ہے لیکن دوسرے طریق روایت میں اس سے زیادہ واضح بیان مذکور ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت جویریہؓ کا باپ (حارث) رئیس عرب تھا۔ حضرت جویریہؓ جب گرفتار ہوئیں تو حارث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی۔ میری شان اس سے بالاتر ہے۔ آپ اس کو آزاد کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ خود جویریہؓ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ حارث نے جا کر جویریہ سے کہا کہ محمدؐ نے تیری مرضی پر رکھا۔ دیکھنا مجھ کو رسوا نہ کرنا۔ انھوں نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے شادی کر لی۔

یہ روایت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں، ابن مندہ سے نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ ابن سعد میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت بھی کی ہے کہ حضرت جویریہؓ کے والد نے اُن کا زرِ فدیہ ادا کیا اور جب وہ آزاد ہو گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا۔

اس نکاح کا اثر

حضرت جویریہؓ سے جب آپ نے نکاح کیا تو تمام اسیران جنگ جو اہل فوج کے

---

[۱] یہ تمام واقعات نہایت تفصیل سے ابن سعد اور طبری نے لکھے ہیں اور صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں بھی مذکور ہیں۔ [۲] ابوداؤد کتاب العتاق۔

حصہ میں آگئے تھے دفعۃً رہا کر دیئے گئے۔ فوج نے کہا کہ جس خاندان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کر لی وہ غلام نہیں ہو سکتا[1]

واقعۂ افک

واقعۂ افک یعنی حضرت عائشہؓ پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی وہ اسی لڑائی سے واپسی میں پیش آیا تھا۔ احادیث اور سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا ہے لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سننے کے ساتھ لوگوں نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ "بالکل افترا ہے"؛ اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ اس واقعہ سے یہ اندازہ کرنا چاہیئے کہ محض جھوٹ اور بے ہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی، لیکن بعض مسلمان بھی دھوکہ میں آگئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

آج کل کے عیسائی مورخوں نے بھی قدیم منافقوں کی طرح اس واقعہ کو اس جوش مسرت سے لکھا ہے کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آگئی ہے لیکن ہم ان سے توقع بھی یہی کر سکتے تھے۔ یہ تمام لڑائیاں اس عام جنگ کا پیش خیمہ تھیں جو تمام عرب اور یہود متفقہ قوت سے کرنا چاہتے تھے اور جس کو جنگ احزاب کہتے ہیں۔

غزوۂ احزاب یعنی عرب کی متحدہ جنگ ذوقعدہ ۵ھ

بنو نضیر[2] مدینہ سے نکل کر خیبر پہنچے تو انھوں نے ایک نہایت عظیم الشان سازش شروع کی۔ ان کے رؤسا میں سے سلام بن ابی الحقیق، حیی بن اخطب، کنانہ بن الربیع وغیرہ مکہ معظمہ گئے اور قریش سے مل کر کہا اگر ہمارا ساتھ دو تو اسلام کا استیصال کر دیا جا سکتا ہے۔ قریش اس کے لئے ہمیشہ تیار تھے۔ قریش کو آمادہ کر کے یہ لوگ قبیلۂ غطفان کے پاس گئے اور ان کو لالچ دیا کہ خیبر کا نصف محاصل ان کو ہمیشہ دیا کریں گے (اور یہ پہلے سے بھی تیار تھے، قصۂ غزوہ معونہ میں یاد ہوگا کہ عامر رئیس قبیلہ نے اسی غطفان کے حملہ کی دھمکی دی تھی[3] اسلئے یہ فوراً تیار ہو گئے، بنو اسد غطفان کے حلیف تھے، غطفان نے ان کو لکھ بھیجا کہ تم بھی فوجیں لے کر آؤ۔ قبیلۂ بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی اس تعلق سے انھوں نے بھی ساتھ دیا۔ بنو سعد کا قبیلہ یہود کا حلیف تھا، اس بنا پر یہود نے ان کو بھی آمادہ کیا۔ غرض تمام قبائل عرب سے لشکر گراں تیار ہو کر مدینہ کی طرف بڑھا۔ فتح الباری میں تصریح ہے کہ ان کی تعداد (دس ہزار) تھی[4]۔

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب العتق (باب فی بیع المکاتب اذا فسخت المکاتبۃ) [2] طبری میں ہے فان الذی جر غزوۃ رسول اللہ الخندق فیما قیل ما کان من اجلاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی النضیر عن دیارہم (ج ۳ ص ۱۴۶۳) مغازی کی سب سے زیادہ معتبر کتاب مغازی موسیٰ بن عقبہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری (ج ۷، ص ۳۰۱) غزوہ احزاب کے ذکر میں اس کی یہ عبارت نقل کی ہے۔ خرج حیی بن اخطب بعد قتل بنی النضیر الی مکۃ یحرض قریشا علی حرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وخرج کنانۃ بن الربیع بن ابی الحقیق یسعی فی بنی غطفان ویحضہم علی قتال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ان لہم نصف ثمر خیبر فاجابہ عیینۃ بن حصن بن حذیفۃ بن بدر الفزاری الی ذلک وکتبوا الی حلفائہم من بنی اسد فاقبل الیہم طلحۃ بن خویلد فیمن اطاعہ الخ [3] صحیح بخاری غزوۃ الرجیع [4] طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول ص ۴۷ و فتح الباری ج ۷، ص ۳۰۳۔

یہ لشکر تین مستقل فوجوں میں تقسیم تھا، غطفان کی فوجیں، عیینہ بن حصن فزاری کی کمان میں تھیں جو عرب کا مشہور سردار تھا۔ بنو اسد طلیحہ کی افسری میں تھے اور ابو سفیان (بن حرب) سپہ سالار کل تھا[1]۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبریں سنیں تو صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایرانی ہونے کی وجہ سے خندق کے طریقہ سے واقف تھے۔ انھوں نے رائے دی کہ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا مصلحت نہیں ایک محفوظ مقام میں لشکر جمع کیا جائے اور گرد خندق کھود لی جائے۔ خندق دراصل فارسی کندہ کا معرب ہے جس کے معنی کھودے گئے کے ہیں۔ کاف "خ" سے اور ہائے ہوز قاف سے بدل گئی ہے، جس طرح پیادہ سے بیدق ہو گیا ہے

تمام لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کیے گئے۔ مدینہ میں تین جانب مکانات اور نخلستان کا سلسلہ تھا جو شہر پناہ کا کام دیتا تھا، صرف شامی رخ کھلا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار صحابہؓ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اسی مقام میں خندق کی تیاریاں شروع کیں۔ یہ ذوقعدہ ۵ھ کی ۸ تاریخ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود خود قائم کئے۔ داغ بیل ڈال کر دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم کی۔ خندق کا عمق پانچ گز رکھا گیا۔ بیس دن میں ۳ ہزار متبرک ہاتھوں سے انجام پائی۔[3]

یاد ہوگا کہ جب مسجد نبوی بن رہی تھی تو سرور دو جہاں مزدوروں کی صورت میں تھے۔ آج بھی وہی عبرت انگیز منظر ہے۔ جاڑے کی راتیں ہیں، تین تین دن کا فاقہ ہے۔ مہاجرین اور انصار اپنی پیٹھوں پر مٹی لاد لاد کر پھینکتے ہیں اور جوش محبت میں ہم آواز ہو کر کہتے ہیں،

نحن الذین بایعوا محمدا | علی الجہاد ما بقینا ابدا

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مٹی پھینک رہے ہیں، شکم مبارک پر گرد اٹ گئی ہے۔ اسی حالت میں یہ رجز زبان پر ہے۔

واللہ لولا اللہ ما اہتدینا | ولا تصدقنا ولا صلینا
فانزلن سکینۃ علینا | وثبت الاقدام ان لاقینا
ان الالی قد بغوا علینا | اذا ارادوا فتنۃ ابینا

اَبَینا کا لفظ جب آتا تھا تو آواز زیادہ بلند ہو جاتی تھی اور مکرر کہتے تھے،[4] اس کے ساتھ انصار کے حق میں دعا بھی دیتے جاتے تھے اور یہ موزوں الفاظ زبان پر آتے تھے

اللّٰہم انہ لا خیر الا خیر الاخرۃ | فبارک فی الانصار والمہاجرۃ[5]

پتھر کھودتے کھودتے اتفاقاً ایک سخت چٹان آگئی۔ کسی کی ضرب کام نہیں دیتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول ص ۴۷ [2] ان افسروں کی یہ تفصیل پورے لشکر کی نہیں ہے بلکہ مصنف نے صرف مشہور قبائل کے فوجی افسروں کا تذکرہ کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مورخین نے دوسرے قبائل کے فوجی افسروں کے نام بھی بتائے ہیں چنانچہ بنو سلیم سفیان بن عبد شمس کی افسری میں تھے، قبیلہ اشجع کا سردار مسعود بن رخیلہ تھا بنو مرۃ حارث بن عوف کے ماتحت تھے، حارث اور طلیحہ بعد کو مسلمان ہو گئے تھے، زرقانی ج ۲ ص ۱۰۴ [3] طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول ص ۴۷ [4] ایضاً [5] صحیح بخاری غزوۃ احزاب۔

علیہ وسلم تشریف لائے، تین دن کا فاقہ تھا اور پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ آپؐ نے دستِ مبارک سے پھاوڑا مارا تو چٹان ایک تودۂ خاک تھی[1]۔

سلع کی پہاڑی کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی گئی۔ مستورات شہر کے محفوظ قلعوں میں بھیج دی گئیں اور چونکہ بنو قریظہ کے حملہ کا اندیشہ تھا۔ اس لئے حضرت سلمہؓ بن اسلم ۲۰۰ آدمیوں کے ساتھ متعین کئے گئے کہ ادھر سے حملہ نہ ہونے پائے۔

بنو قریظہ کے یہود اب تک الگ تھے، لیکن بنو نضیر نے ان کے ملا لینے کی کوشش کی، حیی بن اخطب (حضرت صفیہؓ کا باپ) خود قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا، اس نے ملنے سے انکار کیا، حیی نے کہا میں فوجوں کا دریائے بے کراں لایا ہوں، قریش اور تمام عرب اُمنڈ آیا ہے اور ہر ایک محمدؐ کے خون کا پیاسا ہے یہ موقع ہاتھ سے جانے دینے کے قابل نہیں، اب اسلام کا خاتمہ ہے، کعب اب بھی راضی نہ تھا اس نے کہا، میں نے محمدؐ کو ہمیشہ صادق الوعد پایا اُن سے عہد شکنی کرنا خلاف مروت ہے لیکن حیی کا جادو رائیگاں نہیں جا سکتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال معلوم ہوا تو تحقیق اور اتمام حجت کے لئے سعدؓ بن معاذ اور حضرت سعدؓ بن عبادۃ کو بھیجا اور فرمایا کہ اگر درحقیقت بنو قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے تو وہاں سے آکر اس خبر کو مبہم لفظوں میں بیان کرنا کہ لوگوں میں بے دلی نہ پھیلنے پائے۔ دونوں صاحبوں نے بنو قریظہ کو معاہدہ یاد دلایا تو انھوں نے کہا ہم نہیں جانتے محمدؐ کون ہیں اور معاہدہ کیا چیز ہے؟

غرض بنو قریظہ نے اس بے شمار فوج میں اور اضافہ کر دیا۔ قریش، یہود اور قبائل عرب کی دس ہزار فوجیں تین حصوں میں تقسیم ہو کر مدینہ کی تین طرف اس زور و شور سے حملہ آور ہوئیں کہ مدینہ کی زمین دہل گئی۔

اس معرکہ کی تصویر خود اللہ تعالے نے کھینچی ہے۔

إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ۔ (سورۂ احزاب ۔ ۲)

جب دشمن اوپر کی طرف اور نشیب کی طرف سے آپڑے اور جب آنکھیں ڈگنے لگیں اور کلیجے منہ میں آگئے اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے تب مسلمانوں کی جانچ کا وقت آیا اور وہ بڑے زور کے زلزلے میں ڈال دیئے گئے۔

فوجِ اسلام میں منافقوں کی تعداد بھی شامل تھی جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھے لیکن موسم کی سختی، رسد کی قلت متواتر فاقے، راتوں کی بے خوابی، بے شمار فوجوں کا ہجوم ایسے واقعات تھے جنھوں نے اُن کا پردہ فاش کر دیا۔ آآ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگنی شروع کی کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں، ہم کو شہر میں واپس چلے جانے کی اجازت دی جائے۔

يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا (احزاب ۲)

کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اور وہ کھلے نہیں بلکہ ان کو بھاگنا مقصود ہے۔

---

[1] صحیح بخاری غزوہ احزاب۔

لیکن جاں نثاران اسلام کا طلائے اخلاص اسی کسوٹی پر آزمانے کے قابل تھا۔

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ۔ (احزاب ۔ ۳)

جب مسلمانوں نے قبائل کی فوجیں دیکھیں تو بول اٹھے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ خدا نے اور اسکے رسول نے کیا تھا اور خدا اور اس کا رسول دونوں سچے تھے اور اس بات نے انکے یقین اور اطاعت کو اور بھی بڑھا دیا۔

قریباً ایک مہینہ تک اس سختی سے محاصرہ قائم رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ پر تین تین فاقے گزر گئے۔ ایک دن صحابہؓ نے بے تاب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں، لیکن جب آپؐ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے۔ محاصرہ اس قدر شدید اور پرخطر ہو گیا تھا کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ کوئی ہے جو باہر نکل کر محاصرین کی خبر لائے؟ تین دفعہ آپؐ نے یہ الفاظ فرمائے، لیکن حضرت زبیرؓ کے سوا اور کوئی صدا نہیں آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر حضرت زبیرؓ کو حواری کا لقب[1] دیا۔

محاصرین نے ادھر تو خندق کا محاصرہ کر رکھا تھا، اُدھر دوسری سمت اس غرض سے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے اہل و عیال یہیں قلعوں میں پناہ گزین تھے۔

محاصرین خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے اس لئے دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے مختلف حصوں پر فوجیں تقسیم کر دی تھیں جو محاصرین کے حملوں کا مقابلہ کرتی تھیں۔ ایک حصہ خود آپؐ کے اہتمام میں تھا۔

محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپؐ کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ انصار ہمت ہار جائیں، اس لئے آپؐ نے غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ان کو دے دیا جائے حضرت سعد بن عبادۃ اور حضرت سعد بن معاذ کو جو رؤسائے انصار تھے بلا کر مشورہ کیا۔ دونوں نے عرض کی اگر یہ خدا کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں، لیکن اگر رائے ہے تو یہ عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج مانگنے کی جرأت نہ کر سکا اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔ یہ استقلال دیکھ کر آپ کو اطمینان ہوا حضرت سعدؓ نے معاہدہ کا کاغذ ہاتھ میں لے کر تمام عبارت مٹا دی اور کہا ان لوگوں سے جو بن آئے کر دکھائیں۔

اب مشرکوں کی طرف سے حملہ کا یہ انتظام کیا گیا کہ قریش کے مشہور جنرل یعنی ابوسفیان، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، ضرار بن الخطاب، ہبیرہ کا ایک ایک دن مقرر ہوا۔ ہر جنرل اپنی باری کے دن پوری فوج کو لے کر لڑتا

---

[1] شمائل ترمذی، عرب کی عادت تھی کہ سخت بھوک میں پیٹ پر پتھر باندھتے تھے جس سے کمر نہیں جھکنے پاتی تھی [1] صحیح بخاری ذکر غزوہ احزاب (و صحیح مسلم کتاب الفضائل)، لیکن ابن ہشام میں اس موقع پر حضرت حذیفہ بن یمان کا نام ہے، اس لئے محدثین میں ان دونوں ناموں کے واقعوں کی تطبیق میں اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر اور زرقانی نے بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ محاصرین میں سے قریش کی تحقیق حال کے لئے حضرت حذیفہؓ اور بنو قریظہ کی تحقیق خبر کے لئے حضرت زبیرؓ گئے تھے، یہ تفصیل واقدی اور نسائی کی بعض روایتوں میں کی ہے۔ فتح الباری ج ۷، صفحہ ۳۱۴، زرقانی ج ۲، صفحہ ۱۳۵ تا ۱۳۸ و طبری صفحہ ۱۴۷۹، ۱۴۸۰ (۳)

تھا خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، لیکن خندق کا عرض چونکہ زیادہ نہ تھا اس لئے باہر سے پتھر اور تیر برسلتے تھے۔ چونکہ اس طریقہ میں کامیابی نہیں ہوئی اس لئے قرار پایا کہ اب عام حملہ کیا جائے۔ تمام فوجیں یکجا ہوئیں، قبائل کے تمام سردار آگے آگے تھے۔ خندق ایک جگہ سے اتفاقاً کم عریض تھی۔ یہ موقع حملہ کے لئے انتخاب کیا گیا عرب کے مشہور بہادروں یعنی ضرار، جبیرہ، نوفل، عمرو بن عبدِ ود نے خندق کے اس کنارے سے گھوڑوں کو مہمیز کیا تو اس پار تھے۔ اُن میں سب سے زیادہ مشہور بہادر عمرو بن عبدِ ود تھا وہ ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا۔ جنگِ بدر میں زخمی ہو کر واپس چلا گیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک انتقام نہ لوں گا بالوں میں تیل نہ ڈالوں گا اس وقت اس کی عمر نوے برس کی تھی۔ تاہم سب سے پہلے وہی آگے بڑھا اور عرب کے دستور کے موافق پکارا کہ مقابلہ کو کون آتا ہے؟ حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا "میں"۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا کہ یہ عمرو بن عبد ود ہے حضرت علیؓ بیٹھ گئے۔ لیکن عمرو کی آواز کا اور کسی طرف سے جواب نہیں آتا تھا، عمرو دوبارہ پکارا اور پھر وہی ایک صدا جواب میں تھی۔ تیسری دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ عمرو ہے تو حضرت علیؓ نے عرض کی ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے۔ غرض آپؐ نے اجازت دی، خود دستِ مبارک سے تلوار عنایت کی، سر پر عمامہ باندھا۔

عمرو کا قول تھا کہ کوئی شخص دنیا میں اگر مجھ سے تین باتوں کی درخواست کرے تو ایک ضرور قبول کروں گا۔ حضرت علیؓ نے عمرو سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ تیرا قول ہے۔ پھر حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

حضرت علیؓ
میں درخواست کرتا ہوں کہ تو اسلام لا۔

عمرو
یہ نہیں ہو سکتا۔

حضرت علیؓ
لڑائی سے واپس چلا جا۔

عمرو
میں خاتونانِ قریش کا طعنہ نہیں سن سکتا۔

حضرت علیؓ
مجھ سے معرکہ آرا ہو۔

عمرو ہنسا اور کہا مجھ کو امید نہ تھی کہ آسمان کے نیچے یہ درخواست بھی میرے سامنے پیش کی جائے گی۔ حضرت علیؓ پیادہ تھے۔ عمرو کی غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا۔ گھوڑے سے اُتر آیا اور پہلی تلوار گھوڑے کے پاؤں پر ماری کہ کونچیں کٹ گئیں۔ پھر پوچھا کہ تم کون ہو؟ آپ نے نام بتایا۔ اس نے کہا میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "ہاں لیکن میں چاہتا ہوں۔ عمرو اب غصہ سے بے تاب تھا۔ پر تلے سے تلوار نکالی اور آگے بڑھ کر وار کیا۔ حضرت علیؓ نے سپر پر روکا، لیکن تلوار سپر میں ڈوب کر نکل آئی اور پیشانی پر لگی، گو زخم کاری نہ تھا تاہم یہ طغرا آپؐ کی پیشانی پر یادگار رہ گیا۔ قاموس میں لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کو ذوالقرنین بھی کہتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ آپؓ کی پیشانی پر دو زخموں کے نشان تھے، ایک عمرو کے ہاتھ کا اور ایک ابن ملجم کا۔ دشمن کا وار ہو چکا تو حضرت علیؓ نے وار کیا ان کی تلوار شانہ کاٹ کر نیچے اتر آئی۔ ساتھ ہی حضرت علیؓ نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہو گیا۔ عمرو کے بعد ضرار اور جبیرہ نے حملہ کیا لیکن جب ذوالفقار کا ہاتھ بڑھا تو پیچھے ہٹنا پڑا۔ حضرت عمرؓ نے ضرار کا تعاقب کیا۔ ضرار نے مڑ کر برچھے کا وار کرنا چاہا لیکن روک لیا اور کہا۔ عمرؓ! اس احسان کو یاد رکھنا۔

نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گرا، صحابہ نے تیر مارنے شروع کئے اس نے کہا مسلمانو! میں شریفانہ موت چاہتا ہوں، حضرت علیؓ نے درخواست منظور کی اور خندق میں اُتر کر مارا کہ شریفوں کے شایانِ شان تھا۔

حملہ کا یہ دن بہت سخت تھا۔ تمام دن لڑائی رہی۔ کفار ہر طرف سے تیر اور پتھروں کا مینہ برسا رہے تھے۔ اور ایک دم کے لئے یہ بارش تھمنے نہ پاتی تھی۔ یہی دن ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متصل چار نمازیں قضا ہوئیں، متصل تیر اندازی اور سنگ باری سے جگہ سے ہٹنا ناممکن تھا۔

مستورات جس قلعہ میں تھیں بنو قریظہ کی آبادی سے متصل تھا۔ یہودیوں نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے قلعہ پر حملہ کیا۔ ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ حضرت صفیہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی) نے دیکھ لیا۔ مستورات کی حفاظت کے لئے حضرت حسانؓ (شاعر) متعین کر دیئے گئے تھے۔ حضرت صفیہؓ نے ان سے کہا کہ اُتر کر اس کو قتل کر دو، ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتہ دے گا۔ حضرت حسانؓ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا جس نے ان میں اس قدر جبن پیدا کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس بنا پر اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا میں اس کام کا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا؟ حضرت صفیہؓ نے خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ لی اور اُتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ سر پھٹ گیا۔ حضرت صفیہؓ چلی آئیں اور حسانؓ سے کہا کہ ہتھیار اور کپڑے چھین لاؤ۔ حسانؓ نے کہا جانے بھی دیجئے مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت صفیہؓ نے کہا اچھا جاؤ اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دو کہ یہودی مرعوب ہو جائیں۔ لیکن یہ خدمت بھی حضرت صفیہؓ ہی کو انجام دینا پڑی۔ یہودیوں کو یقین ہوا کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج متعین ہے اس خیال سے پھر انہوں نے حملہ کی جرأت نہ کی۔

محاصرہ کو جس قدر طول ہوتا جاتا تھا محاصرہ کرنے والے ہمت ہارتے جاتے تھے۔ دس ہزار آدمیوں کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا، پھر باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی کہ طوفان آگیا۔ خیموں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ گئیں۔ کھانے کے دیگچے چولہوں پر الٹ الٹ جاتے تھے، اس واقعہ نے فوجوں سے بڑھ کر کام دیا۔ اسی بنا پر قرآن مجید نے اس بادِ صرصر کو عسکرِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا (احزاب-۲)

مسلمانو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب کہ تم پر فوجیں آ پڑیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور فوجیں بھیجیں جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

نعیم بن مسعود اشجعی ایک غطفانی رئیس تھے۔ قریش اور یہود دونوں اُن کو مانتے تھے وہ اسلام لا چکے تھے

[1] یہ حالات اگرچہ اجمالاً تمام کتابوں میں ہیں، لیکن ہم نے جو تفصیل لکھی ہے ابن سعد اور خمیس سے ماخوذ ہے۔

[2] اس امر میں محدثین میں سخت اختلاف ہے کہ چار نمازیں قضا ہوئیں یا ایک، اور چار قضا ہوئیں تو ایک ہی دن یا کئی دن، یا کئی دن کی ملا کر، زرقانی میں یہ بحث مفصل ہے۔

[3] زرقانی بحوالہ طبرانی و بزار و ابو یعلی بسند حسن، دیکھو صفحہ ۱۲۹ جلد ۲، و ابن ہشام۔

لیکن کفار کو ابھی اس کا علم نہ تھا انھوں نے قریش اور یہود سے الگ الگ جاکر اس قسم کی باتیں کہیں جس سے دونوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ نعیم نے اس تفرقہ اندازی میں دونوں سے ایسی باتیں کہیں جن سے دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو جائیں اور اس بنا پر کہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الحرب خدعۃ کی تعلیم کی تھی۔ لیکن ابن اسحاق نے روایت کی سند نہیں نقل کی اور اگر کرتے بھی تو ابن اسحاق کا یہ پایہ نہیں کہ ایسا واقعہ محض ان کی سند سے قبول کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ واقعات اس قسم کے جمع تھے کہ دونوں فریقوں کا اتحاد بغیر اس کے توڑ دیا جا سکتا تھا کہ کوئی غلط بات بیان کی جائے۔ ابن اسحاق کی روایت میں بھی اس قدر مذکور ہے کہ نعیم نے یہود سے کہا کہ قریش تو چار دن کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے، تمہارا اور مسلمانوں کا ہم وطنی کا ساتھ ہے اس لئے تم کیوں بیچ میں پڑ کر ہمیشہ کے لئے لڑائی مول لیتے ہو، اور اگر اس پر آمادہ ہی ہو تو قریش سے کہو کہ وہ کچھ معزز آدمی ضمانت کے طور پر تمہارے ہاں بھجوا دیں کہ اگر قریش لڑائی کا فیصلہ کئے بغیر جانا چاہیں تو تم ان لوگوں کو روک لینا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہود بنو قریظہ اول اول نقض عہد پر راضی نہ تھے اور کہتے تھے کہ ہم محمدؐ سے معاہدہ کیوں توڑیں؟ لیکن حیی بن اخطب نے اسی شرط پر ان کو راضی کیا تھا کہ قریش چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر تمہارے پاس آجاؤں گا، قریش اس قسم کی ضمانت نہیں منظور کر سکتے تھے اس لئے جب انھوں نے انکار کیا ہو گا تو دونوں میں خود بخود پھوٹ پڑ گئی ہو گی۔ اس کے لئے ایک صحابی کو دروغ بیانی کی کیا ضرورت تھی۔[1]

بہر حال موسم کی سختی، محاصرہ کا امتداد، آندھی کا زور، رسد کی قلت، یہود کی علیحدگی، یہ تمام اسباب ایسے جمع ہو گئے تھے کہ قریش کے پائے ثبات اب ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ ابو سفیان نے فوج سے کہا رسد ختم ہو چکی، موسم کا یہ حال ہے، یہود نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اب محاصرہ بے کار ہے۔ یہ کہہ کر طبل رحیل بجنے کا حکم دیا، غطفان بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ بنو قریظہ محاصرہ چھوڑ کر اپنے قلعوں میں چلے آئے اور مدینہ کا افق ۲۰، ۲۲ دن تک

[1] مصنف کے اس قیاس کی تائید مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کو مختصراً مصنف ابن ابی شیبہ میں اور تفصیل کے ساتھ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ اس روایت کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں شرکت اسی شرط کے ساتھ کی تھی کہ قریش ضمانت کے طور پر اپنے کچھ معزز آدمی بنو قریظہ کے سپرد کریں گے لیکن انھوں نے اپنی یہ شرط پوری نہیں کی اور اس لئے ان کے دل میں قریش کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہوئی اور انھوں نے خفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کے ساتھ مصالحت کا پیغام بھیجا کہ بنو نضیر کو جو خیبر کو جلاوطن کر دیئے گئے تھے پھر مدینہ آنے کی اجازت دے دی جائے۔ نعیم بن مسعود ثقفی جو اسی موقع پر مسلمان ہونے آئے تھے ایک ایسے آدمی تھے جو پیٹ کے ہلکے تھے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دانستہ راز کے طور پر بنو قریظہ کے اس مخفی پیغام کا ذکر فرما دیا، انھوں نے جاکر یہ قریش تک پہنچا دیا۔ اس سے قریش کو بنو قریظہ سے بدگمانی پیدا ہو گئی اور اس طرح قریش اور بنو قریظہ کے اتفاق کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب غزوۂ خندق والبدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۴

غبار آلود رہ کر صاف ہو گیا۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ (احزاب - ۳)	اور خدا نے کافروں کو غصہ میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کو کچھ ہاتھ نہ آیا اور مسلمانوں کو لڑنے کی نوبت نہ آنے دی

اس معرکہ میں فوج اسلام کا جانی نقصان کم ہوا لیکن انصار کا سب سے بڑا بازو ٹوٹ گیا۔ یعنی حضرت سعدؓ بن معاذ جو قبیلہ اوس کے سردار تھے زخمی ہوئے اور پھر جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے زخم کھانے کا واقعہ مؤثر اور عبرت انگیز ہے۔ حضرت عائشہؓ جس قلعہ میں پناہ گزین تھیں، حضرت سعدؓ بن معاذ کی ماں بھی وہیں ان کے ساتھ تھیں۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں قلعہ سے نکل کر باہر پھر رہی تھی، عقب سے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ مڑ کر دیکھا سعدؓ ہاتھ میں حربہ لئے جوش کی حالت میں بڑی تیزی سے بڑھے جا رہے ہیں اور یہ شعر زبان پر ہے

لبث قليلا تدرك الهيجا جمل	لا باس بالموت اذا الموت نزل
ذرا ٹھہر جا کہ لڑائی میں ایک اور شخص پہنچ جائے	وقت جب آ گیا تو موت سے کیا ڈر ہے

حضرت سعدؓ کی ماں نے سنا تو پکاریں بیٹا دوڑ کر جا تو نے دیر لگا دی۔ سعدؓ کی زرہ اس قدر چھوٹی تھی کہ دونوں ہاتھ باہر تھے، حضرت عائشہؓ نے سعدؓ کی ماں سے کہا کاش سعدؓ کی زرہ لمبی ہوتی۔ اتفاق یہ کہ ابن العرقہ نے تاک کر کھلے ہوئے ہاتھ پر تیر مارا جس سے اکحل کی رگ کٹ گئی۔ خندق کا معرکہ ہو چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے مسجد کے صحن میں ایک خیمہ کھڑا کرایا اور ان کی تیمارداری شروع کی۔ اس لڑائی میں رفیدہ ایک خاتون شریک تھیں جو اپنے پاس دوائیں رکھتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ یہ خیمہ انہی کا تھا اور وہ علاج کی نگران تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دست مبارک میں مشقص لے کر داغا لیکن پھر ورم کر آیا، دوبارہ داغا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ کئی دن کے بعد یعنی بنو قریظہ کی ہلاکت کے بعد زخم کھل گیا اور انھوں نے وفات پائی۔

بنو قریظہ کا خاتمہ

اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز قیام میں یہود کے ساتھ معاہدہ کیا تھا اور ان کو جان و مال و مذہب ہر چیز میں امن و آزادی بخشی لیکن جب قریش نے ان کو تحریص و تہدید کا خط لکھا تو وہ آمادہ بغاوت ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے تجدید معاہدہ کرنا چاہی۔ بنو نضیر نے انکار کیا اور جلاوطن کر دیئے گئے۔ لیکن بنو قریظہ نے نئے سرے سے معاہدہ کر لیا، چنانچہ ان کو امن دے دیا گیا۔ صحیح مسلم میں ان واقعات کو اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

[1] ابن ہشام وطبری و خمیس [2] یہ خمیس کا بیان ہے، حافظ ابن حجر نے اصابہ (ذکر رفیدہ) میں امام بخاری کی ادب المفرد سے نقل کیا ہے کہ رفیدہ ایک خاتون تھیں جو زخمیوں کا علاج کرتی تھیں، حضرت سعدؓ انہی کے پاس علاج کے لئے رکھے گئے تھے۔ ابن سعد نے رفیدہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کا ایک خیمہ مسجد نبوی کے پاس تھا اسی میں وہ بیماروں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔ صحیح بخاری میں بھی رفیدہ کے خیمہ اور ان کے جراح خانہ کا ذکر ہے [3] مسلم باب الفدادی [4] واقدی نے حیی بن اخطب کی زبانی بنو قریظہ کے اس معاہدہ سے پھر جانے کے واقعہ کو ان کی سازشی چال ظاہر کیا ہے۔ حیی بن اخطب نے کہا کہ وہ اس لئے ٹھہر گئے ہیں تاکہ موقع پاکر [illegible] سے مل کر مسلمانوں پر حملہ کر سکیں۔ مغازی واقدی صفحہ ۳۶۳ کلکتہ۔

عن ابن عمر ان یهود بنی النضیر و قریظة حاربوا رسول الله صلی الله علیه وسلم فاجلی رسول الله صلی الله علیه وسلم بنی النضیر واقر قریظة ومن علیهم (صحیح مسلم ذکر اجلاء الیهود من الحجاز)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ بنونضیر اور قریظہ کے یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کی تو آپ نے بنونضیر کو جلا وطن کر دیا اور قریظہ کو رہنے دیا اور ان پر احسان کیا۔

بنونضیر جب جلا وطن ہوئے تو ان کے رئیس الاعظم حیی بن اخطب، ابورافع سلام ابن ابی الحقیق خیبر میں جاکر آباد ہوئے اور وہاں ریاستِ عام حاصل کر لی۔ جنگِ احزاب اُن ہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ قبائلِ عرب میں دورہ کرکے تمام ملک میں آگ لگا دی اور قریش کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ اس وقت تک بنوقریظہ معاہدے پر قائم تھے، لیکن حیی بن اخطب نے ان کو بہکا کر توڑ لیا اور ان سے وعدہ کیا کہ خدانخواستہ اگر قریش حملے سے دست بردار ہو کر چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر یہیں آرہوں گا۔ چنانچہ اس نے یہ عہد وفا کیا۔

قریظہ نے احزاب میں علانیہ شرکت[1] کی اور شکست کھا کر ہٹ آئے تو اسلام کے سب سے بڑے دشمن حیی بن اخطب کو ساتھ لائے۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب سے فارغ ہو کر حکم دیا کہ ابھی لوگ ہتھیار نہ کھولیں اور قریظہ کی طرف بڑھیں۔ قریظہ اگر صلح و آشتی سے پیش آتے تو قابلِ اطمینان تصفیہ کے بعد اُن کو امن دیا جاتا، لیکن وہ مقابلہ کا فیصلہ کر چکے تھے۔ فوج سے آگے بڑھ کر جب حضرت علیؓ اُن کے قلعوں کے پاس پہنچے تو انھوں نے علانیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) گالیاں[2] دیں۔ غرض اُن کا محاصرہ کیا گیا اور تقریباً ایک مہینہ محاصرہ رہا۔ بالآخر انھوں نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعدؓ بن معاذ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔

حضرت سعدؓ بن معاذ اور ان کا قبیلہ (اوس) قریظہ کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ عرب میں یہ تعلق ہم نسبی سے بڑھ کر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست منظور کی۔

قرآن مجید میں جب تک کوئی خاص حکم نہیں آتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم توراۃ کے احکام کی پابندی فرماتے تھے، چنانچہ اکثر مسائل مثلاً قبلہ، نماز، رجم، قصاص، بالمثل وغیرہ وغیرہ میں جب تک خاص وحی نہیں آئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توراۃ ہی کی پابندی فرمائی۔ حضرت سعدؓ نے جو فیصلہ کیا یعنی یہ کہ لڑنے والے قتل کئے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں، مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے، توراۃ کے مطابق تھا۔ توراۃ کتاب

---

[1] سر ولیم میور صاحب ارباب سیر کی یہ روایت تسلیم نہیں کرتے کہ بنوقریظہ نے اس جنگ میں کوئی عملی حصہ لیا تھا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید میں جہاں احزاب کا ذکر ہے وہاں اس کا ذکر ضرور ہوتا، لیکن قرآن میں صاف الفاظ یہ ہیں وانزل الذین ظاہروہم من اہل الکتاب، مظاہرۃ (امداد) سے بڑھ کر اور کون لفظ درکار ہے۔ [2] طبری (ج ۳ صفحہ ۱۴۸۶) اس روایت ابن ہشام صفحہ ۶۹۶ ج دوم [3] طبری ج ۳ صفحہ ۱۴۸۵ اس میں ہے حتی اذا دنا من الحصون سمع منہا مقالۃ قبیحۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منہم [4] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۸۹، باب جواز قتال من نقض العہد وجواز انزال اہل الحصون علی حکم حاکم عدل اہل للحکم الخ، اور نیز بخاری (باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ

تثنیہ، اصحاح ۲۰۔ آیت ۱۰ میں ہے۔

"جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے، اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو اُن کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے باقی بچے عورتیں جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لئے مالِ غنیمت ہوں گے۔"

احادیث میں مذکور ہے کہ سعد نے جب یہ فیصلہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے یہ آسمانی فیصلہ کیا، یہ اسی توراۃ کے حکم کی طرف اشارہ تھا۔ یہودیوں کو جب یہ حکم سنایا گیا تو جو فقرے ان کی زبان سے نکلے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اسی فیصلہ کو حکم الٰہی کے موافق سمجھتے تھے۔

حیی بن اخطب جو ان تمام فتن کا بانی تھا مقتل میں لایا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس نے منہ اٹھا کر دیکھا اور یہ فقرے کہے۔

اما واللہ ما لمت نفسی فی عداوتک ولکن من یخذل اللہ یخذل۔

ہاں خدا کی قسم مجھ کو اس کا افسوس نہیں کہ میں نے کیوں تیری عداوت کی لیکن بات یہ ہے کہ جو شخص خدا کو چھوڑ دیتا ہے خدا بھی اسکو چھوڑ دیتا ہے۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

ایہا الناس انہ لا باس بامر اللہ کتاب وقدر وملحمۃ کتبہا اللہ علی بنی اسرائیل[1]۔

لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں، یہ ایک حکم الٰہی تھا، یہ لکھا ہوا تھا ایک سزا تھی جو خدا نے بنی اسرائیل پر لکھی تھی۔

حیی بن اخطب کی نسبت یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جب وہ جلاوطن ہو کر خیبر جا رہا تھا تو اس نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کسی کو مدد نہ دے گا، اس معاہدہ پر اس نے خدا کو ضامن کیا تھا لیکن احزاب میں اس نے اس معاہدہ کی جس طرح تعمیل کی اس کا حال ابھی گزر چکا۔

بنوقریظہ کے متعلق مخالفینِ اسلام نے بڑے زور کے ساتھ ظلم و بے رحمی کا اعتراض کیا ہے، لیکن واقعات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر ان کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا جس میں ان کے مذہب کو پوری آزادی دی گئی اور جان و مال کی حفاظت کا اقرار کیا گیا۔

۲۔ بنوقریظہ رتبہ میں بنونضیر سے کم تھے، یعنی بنونضیر کا کوئی آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کو صرف آدھا خون بہا دینا پڑتا تھا، بخلاف اس کے بنوقریظہ پورا خون بہا ادا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) علیہ وسلم من الاحزاب الخ) میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے۔ مسٹر مارگولیس صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ سعدؓ بن معاذ کو اس جنگ میں ایک قریظی نے تیر سے زخمی کیا تھا جس سے وہ بالآخر ہلاک ہو گئے اس لئے انہوں نے بنوقریظہ کی نسبت ایسا بیرحمانہ فیصلہ کیا لیکن وہ تیر انداز ابن عرقہ قریشی تھا قریظی نہ تھا۔ صحیح بخاری مسلم میں صاف تصریح ہے۔ [1] یہ دونوں عبارتیں ابن ہشام (غزوہ بنی قریظہ) میں ہیں۔ طبری میں بھی قریباً یہی الفاظ ہیں [2] بلاذری مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۱ یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب بنی قریظہ میں بھی مذکور ہے۔

نے بنو قریظہ پر یہ احسان کیا کہ ان کا درجہ بنو نضیر کے برابر کر دیا۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کی جلا وطنی کے وقت بنو قریظہ سے دوبارہ تجدید معاہدہ کی۔

۴۔ باوجود ان باتوں کے عہد شکنی کی اور جنگ احزاب میں شریک ہوئے۔

۵۔ ازواج مطہراتؓ قلعہ میں حفاظت کے لئے بھیج دی گئیں تھیں، ان پر حملہ کرنا چاہا۔

۶۔ حیی بن اخطب جو بغاوت کے جرم میں جلا وطن کر دیا گیا تھا جس نے تمام عرب کو برانگیختہ کر کے جنگ احزاب قائم کر دی تھی اس کو اپنے ساتھ لائے جو آتش جنگ کے اشتعال کا دیباچہ تھا۔

ان حالات کے ساتھ بنو قریظہ کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جا سکتا تھا۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ عرب میں مخالفت کا معاہدہ اخوت حقیقی کے برابر تھا۔ بنو قریظہ انصار کے حلیف تھے اور اسی بنا پر تمام انصار (اوس) نے ان کی نہایت الحاح کے ساتھ سفارش کی۔ حضرت سعدؓ بن معاذ اوس کے سردار تھے اور دراصل معاہدہ کے وہی ذمہ دار تھے۔ وہ سخت کشمکش میں تھے، ان کے حلیفوں کی موت و حیات کا مسئلہ تھا۔ جن کی حمایت پر کل انصار (اوس) مُصر تھے۔ لیکن حضرت سعدؓ بن معاذ اس فیصلہ کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

مقتولین کی تعداد ارباب سیر نے ۶۰۰ سے زائد بیان کی ہے لیکن صحاح میں ۴۰۰ ہے۔ ان میں صرف ایک عورت تھی اور وہ اس قصاص میں ماری گئی تھی کہ اس نے قلعہ پر سے ایک پتھر گرا کر ایک مسلمان (خلادؓ) کو قتل کر دیا تھا۔ اس عورت نے جس جرأت اور دلیری سے جان دی، سنن ابی داؤد میں وہ حسب ذیل حیرت انگیز طریقے سے مذکور ہے۔[1]

اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقتولین کی فہرست میں اس کا نام بھی ہے۔ قتل گاہ میں مجرم آتے اور عدم کو روانہ ہوتے جاتے تھے۔ ایک ایک کا نام پکارا جا رہا تھا اور یہ ہوش ربا صدا بار بار اس کے کانوں میں آتی تھی لیکن وہ بے تکلف حضرت عائشہؓ سے باتیں کرتی جاتی اور بات بات پہ ہنستی جاتی تھی۔ دفعۃً قاتل نے اس کا نام پکارا۔ وہ بے تکلف اٹھ کھڑی ہوئی۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہاں؟ بولی میں نے ایک جرم کیا تھا اس کی سزا اٹھانے جاتی ہوں۔ خوشی خوشی قتل گاہ میں آئی اور تلوار کے نیچے سر رکھ دیا۔ حضرت عائشہؓ جب اس واقعہ کو بیان کرتی تھیں تو نہایت حیرت کے لہجہ میں بیان کرتی تھیں۔

ریحانہ کا غلط واقعہ

متعدد ارباب سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ کے قیدیوں میں سے ایک یہودی عورت جس کا نام ریحانہ تھا اس کی نسبت حکم دیا کہ الگ کر لی جائے اور پھر چند روز کے بعد اس کو اپنے حرم میں داخل کر لیا چنانچہ جن مورخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لونڈیوں سے بھی متمتع ہوتے تھے انہوں نے دو مثالیں پیش کی ہیں۔ ایک یہی ریحانہ اور دوسری ماریہ قبطیہ۔ عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کو صحیح قرار دے کر نہایت ناگوار صورت میں دکھایا ہے۔ ایک مورخ نہایت طعن آمیز الفاظ میں لکھتا ہے کہ بانی اسلام جب سات سو مقتولین کی لاشوں کے تڑپنے کا تماشا دیکھ چکا تو گھر پر آکر تفریح خاطر کے لئے......

[1] ابو داؤد جلد ۲ کتاب الدیات باب النفس بالنفس۔ [2] ابن ہشام غزوۂ بنی قریظہ [3] ابو داؤد کتاب الجہاد، باب قتل النساء۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی غلط ہے۔

ریحانہ کے حرم میں داخل ہونے کی جس قدر روایتیں ہیں سب واقدی یا ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں لیکن واقدی نے بتصریح بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا تھا۔ ابن سعد نے واقدی کی جو روایت نقل کی ہے اس میں خود ریحانہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔

فاعتقنی وتزوج بی — پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آزاد کر دیا اور مجھ سے نکاح کر لیا

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں محمد بن الحسن کی تاریخ مدینہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے یہ الفاظ ہیں۔

وکانت ریحانۃ القرظیۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم تسکنہ۔ — اور ریحانہ قرظیہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ (محترم) تھیں اس مکان میں رہتی تھیں۔

حافظ ابن مندہ کی کتاب (طبقات الصحابہ) تمام محدثین مابعد کا ماخذ ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں۔[1]

واستسری ریحانۃ من بنی قریظۃ ثم اعتقہا فلحقت باھلھا واحتجبت وھی عند اھلھا۔ — ریحانہ کو گرفتار کیا اور پھر آزاد کر دیا تو وہ اپنے خاندان میں چلی گئیں اور وہیں پردہ نشین ہو کر رہیں۔

حافظ ابن حجر اس عبارت کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

وھذہ فائدۃ جلیلۃ اغفلھا ابن الاثیر

حافظ ابن مندہ کی عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا تھا اور وہ اپنے خاندان میں جا کر بیویوں کی طرح پردہ نشین ہو کر رہیں۔

ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے اور اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ حرم نبویؐ میں آئیں تو تب بھی قطعاً وہ منکوحات میں تھیں کنیز نہ تھیں۔[2]

حضرت زینبؓ سے نکاح

اس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا۔ نکاح ایک معمولی بات ہے اور اس کی تفصیل کا موقع ازواج مطہراتؓ کا عنوان ہے لیکن اس واقعہ میں ایسے حالات جمع ہو گئے جنھوں نے مخالفین کے نزدیک اس کو ایک مہتم بالشان مسئلہ بنا دیا

[1] دیکھو اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر ریحانہؓ ج ۴ ص ۳۰۹۔ [2] حضرت ریحانہؓ کے متعلق کتب سیر میں تین قسم کی روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان والوں کے پاس جا کر پردہ نشین ہو کر رہیں۔ یہ روایت ابن مندہ کی ہے۔ مگر اس کی تائید میں کوئی دوسری روایت نہیں۔ دوسری قسم کی روایت یہ ہے کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے مثل دیگر امہات المومنینؓ کے رکھنا چاہا، مگر انہوں نے اس کی غیر معمولی ذمہ داری محسوس کر کے باندی بن کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا قبول کیا۔ یہ روایت ابن اسحاق کی ہے۔ تیسری قسم کی روایت یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مختار بنا دیا تو انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو آپؐ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ یہ روایت واقدی کی ہے۔ ابن سعد نے واقدی سے مختلف سلسلوں سے اسی روایت کو ذکر کیا ہے اور واقدی نے اسی کو اثبت کہا ہے۔ دیکھئے کتاب البدایہ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۲۵ اور امام زہری نے بھی زوجیت ہی کی تائید کی ہے بحوالہ سابق تفصیل کے لئے دیکھئے اصابہ ذکر ریحانہ۔

عیسائی مؤرخوں نے اس واقعہ کو نہایت آب و رنگ سے لکھا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص و نکتہ چینی (عیاذاً باللہ) کے لئے ان کے نزدیک اور کوئی واقعہ بکار آمد نہیں ہو سکتا۔

ہم اس واقعہ کو تفصیل سے لکھتے ہیں جس سے اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ آنحضرت کے اخلاق و عادات پر نکتہ چینی کا موقع جو دشمنوں کو ہاتھ آتا ہے، اس کا اصلی مخرج کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کو جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے متبنّٰی بنا لیا تھا جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو آپؐ نے ان کی شادی حضرت زینبؓ سے کرنی چاہی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھیری بہن تھیں (ان کی ماں اُمیمہ عبد المطلب کی بیٹی تھیں) لیکن چونکہ وہ غلام رہ چکے تھے اس لئے حضرت زینبؓ کو یہ نسبت گوارا نہ تھی

وکان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اراد ان یزوجھا زید بن حارثہ مولاہ فکرھت ذلک[1]	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنے غلام زید سے کر دینا چاہا تو انھوں نے ناپسند کیا۔

لیکن بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیلِ ارشاد کے لحاظ سے راضی ہو گئیں۔ قریباً ایک سال تک حضرت زینبؓ کے نکاح میں رہیں، لیکن دونوں میں ہمیشہ شکر رنجی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ زیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکثر شکایت کی اور ان کو طلاق دینا چاہا۔

جاء زید بن حارثہ فقال یا رسول اللّٰہ ان زینب اشتد علی لسانھا وانا ارید ان اطلقھا[2]	زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ زینب مجھ سے زبان درازی کرتی ہیں اور میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اُن کو سمجھاتے تھے کہ طلاق نہ دیں۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ۔ (احزاب - ۵)	اور جب کہ تم اس شخص سے جس پر خدا نے اور تم نے احسان کیا تھا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو نکاح میں لئے رہو اور خدا سے خوف کرو۔

لیکن کسی طرح صحبت برآ نہ ہو سکے اور آخر حضرت زیدؓ نے اُن کو طلاق دے دی۔ حضرت زینب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بہن تھیں اور آپؐ ہی کی تربیت میں پلی تھیں۔ آپؐ کے فرمانے سے انھوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا جو اُن کے نزدیک اُن کے خلافِ شان تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو مساوات اسلامی قائم کرنا چاہتے تھے اس میں آزاد و غلام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہرحال جب وہ مطلقہ ہو گئیں تو آپؐ نے ان کی دلجوئی کے لئے خود ان سے نکاح کر لینا چاہا لیکن عرب میں اس وقت تک متبنّٰی اصلی بیٹے کے برابر سمجھا جاتا تھا، اس لئے عام لوگوں کے خیال سے آپؐ تامل فرماتے تھے لیکن چونکہ یہ محض جاہلیت کی رسم تھی اور اس کا مٹانا مقصود تھا، اسلئے یہ آیت نازل ہوئی۔

وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ۔ (احزاب - ۵)	اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے ہو جس کو خدا ظاہر کر دینے والا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ ڈرنا خدا سے چاہیئے۔

غرض آپؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیا اور جاہلیت کی ایک قدیم رسم کہ متبنّٰی اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے

[1] فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب بحوالہ ابن ابی حاتم۔ [2] فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب بحوالہ روایت عبد الرزاق از معمر از قتادہ۔

مٹ گئی۔ اس پر منافقوں اور بدگویوں نے بہت طعنے دیئے لیکن امرِ حق کے اجراء میں مطاعن کا آماجگاہ بننا لازمی ہے۔

واقعہ کی اصلی اور سادہ حقیقت یہ تھی، مخالفوں نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے گو سرتاپا کذب و افترا ہے لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے رنگ آرائی کے لئے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے۔

تاریخ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زید سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے، زید نہ تھے حضرت زینبؓ کپڑے پہن رہی تھیں، اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ لیا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے باہر نکل آئے۔

سبحان اللّٰہ العظیم سبحان اللّٰہ مصرف القلوب[1]	پاک ہے خدائے برتر، پاک ہے وہ خدا جو دلوں کو پھیر دیتا ہے۔

حضرت زیدؓ کو یہ حالات معلوم ہوتے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ زینبؓ اگر آپؐ کو پسند آ گئی ہوں تو میں اُن کو طلاق دے دوں۔

میں نے یہ بے ہودہ روایت اپنے دل پر سخت جبر کر کے نقل کی ہے۔ نقلِ کفر کفر نہ باشد، یہی روایت ہے جو عیسائی مؤرخوں کا مایۂ استناد ہے، لیکن ان غریبوں کو یہ معلوم نہیں کہ اصولِ فن کے لحاظ سے یہ روایت کس پایہ کی ہے، مؤرخ طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعہ سے نقل کی ہے جو مشہور کذاب اور دروغ گو ہے اور جس کا مقصد اس قسم کی بے ہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آتے۔

طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسی قسم کی بے ہودہ روایتیں نقل کی ہیں لیکن محدثین نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے تعرض کیا جائے۔ حافظ ابن حجر سخت روایت پرست ہیں۔ تاہم فتح الباری (سورۂ احزاب) کی تفسیر میں جہاں اس واقعہ سے بحث کی ہے لکھتے ہیں،

ووردت اٰثار اخریٰ اخرجھا ابن ابی حاتم والطبری ونقلھا کثیر من المفسرین لاینبغی التشاغل بھا۔	اور، اور بہت سی روایتیں آئی ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور اکثر مفسرین نے اُن کو نقل کر دیا ہے ان روایتوں میں مشغول نہ ہونا چاہیئے۔

حافظ ابن کثیر جو مشہور محدثین میں ہیں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

ذکر ابن ابی حاتم وابن جریر ھٰھنا اٰثارا عن بعض السلف رضی اللّٰہ عنھم احببنا ان نضرب عنھا صفحا لعدم صحتھا فلا نوردھا وقد روی الامام احمد ھٰھنا ایضا من روایۃ حماد بن زید عن ثابت عن انس رضی اللّٰہ عنہ فیہ غرابۃ ترکنا سیاقہ۔ ایضاً۔	ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض اسلاف سے چند روایتیں نقل کی ہیں۔ جن کو ہم اس لئے نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ غلط ہیں اور امام احمد نے بھی اس واقعہ کے متعلق انسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جو غریب ہے ہم نے اس کا ذکر بھی چھوڑ دیا ہے۔

[1] تاریخ طبری آغاز واقعات ۵ھ ہجری۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت منافقوں کا بہت زور تھا حضرت عائشہؓ پر لوگوں نے جو تہمت لگائی وہ بھی اسی سال کا واقعہ ہے۔ منافقین ان خبروں کو اس طرح پھیلاتے تھے کہ بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جاتی تھیں یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کی تہمت میں خود چند مسلمان بھی آلودہ ہو گئے جن کو شریعت کے موافق قذف کی سزا دی گئی۔ یہی روایتیں ہیں جو کچھ کچھ غیر محتاط کتابوں میں باقی رہ گئیں۔ لیکن وہ محدثین جن کا معیارِ تحقیق بلند ہے اور جو فنِ روایت کے حاکمانِ مجاز ہیں، مثلاً امام بخاری، امام مسلم وغیرہ، اُن کے ہاں ان روایتوں کا ذکر تک نہیں آتا۔

واقعات متفرقہ سنہ ۵ھ

اس سال کی تاریخ مذہبی میں سب سے اہم واقعات عورتوں کے متعلق متعدد اصلاحی احکام کا نزول ہے۔ اب تک مسلمان عورتیں عام جاہلانہ طریق سے چلتی پھرتی تھیں اور اسی قسم کے لباس و زیور پہنتی تھیں۔ اب حکم ہوا کہ شریف عورتیں گھر سے نکلیں تو ایک بڑی چادر اوڑھ کر گھونگھٹ نکال لیا کریں، جس سے منہ بھی چھپ جائے، آنچل سینہ پر ڈال کر چلیں، پاؤں جھنک جھنک کر نہ چلیں، پردہ کی اوٹ سے بولیں، تصنع اور بناؤ کی بولی نہ بولیں۔ ازواج مطہراتؓ کے لئے غیر مردوں کے سامنے آنا قطعاً ممنوع ہوا۔

منہ بولے لڑکے کی بیوی سے جاہلیت میں بیاہ ناجائز تھا۔ اس رسم کی اصلاح بھی اسی سال ہوئی۔

زنا کی سزا سو کوڑے بھی اسی سال نازل ہوئی۔ عفیف عورتوں پر الزام لگانا جاہلیت کا ایک معمولی فعل تھا اور ان کمزوروں کے پاس اس حملہ کے روکنے کے لئے کوئی قانونی سپر نہ تھی۔ اس سال حدِ قذف نازل ہوئی جس کی رُو سے بغیر شہادت کے تنہا اتہام جرم قرار دیا گیا۔ بصورتِ عدمِ وجودِ شہادت لعان کا طریقہ بتایا گیا یعنی زن و شو دونوں اپنی سچائی اور فریقِ ثانی کی دروغ گوئی کا بحلف اظہار کریں اور اس کے بعد ان میں تفرقہ کر دیا جائے۔

عرب میں ایک قسم کی طلاق جاری تھی جس کو ظہار کہتے ہیں۔ اس سال اس قسم کی طلاق غیر مؤثر قرار دی گئی اور اس کے لئے کفارہ مقرر کیا گیا۔

پانی نہ ملنے کی حالت میں تیمم کی مشروعیت بھی اسی سال کا حکم ہے، بروایتِ صحیح نمازِ خوف کا حکم قرآن مجید میں اسی سال نازل ہوا۔ جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔[1]

*

[1] بخاری جلد ۲ ص ۷۰۰، و سیرت گازرونی قلمی، ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۱۲ نیز فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۱۰۶ دیکھنا چاہئے۔ یہ تمام احکام سورۂ نور میں بتقریب واقعہ افک سنہ ۵ھ میں نازل ہوئے۔

سنہ ۶ھ

صُلح حُدیبیہ و بیعتِ رضوان

ذوقعدہ سنہ ۶ھ

مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ایک کنواں ہے جس کو حدیبیہ کہتے ہیں، گاؤں بھی اسی کنویں کے نام سے مشہور ہو گیا، چونکہ معاہدہ صلح یہیں لکھا گیا اس لئے اس واقعہ کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔

تاریخ اسلام میں یہ واقعہ نہایت اہم یعنی اسلام کی تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ ہے اور اسی بنا پر باوجود اس کے کہ وہ صرف ایک صلح کا معاہدہ تھا اور صلح بھی بظاہر مغلوبانہ تھی تاہم خدا نے قرآن مجید میں اس کو فتح کا لقب دیا ہے۔ کعبہ اسلام کا اصلی مرکز تھا، اسلام کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے قائم کی تھی اور یہ لقب اسلام بھی ان ہی کی ایجاد ہے۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج ۱۰) ابراہیم ہی ہے جس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شریعت ملی وہ کوئی نئی شریعت نہ تھی بلکہ وہی ابراہیمی شریعت تھی۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (الحج ۱۰) تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔

زمانہ کے امتداد سے گو انہی کی اولاد بُت پرست بن گئی تھی تاہم کعبہ جو ابراہیمی یادگار تھا عرب کا قبلہ گاہِ عام تھا، تمام عرب اس کو اپنا مشترک ورثہ آبائی سمجھتا تھا۔ نہ صرف وہ لوگ جو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے تھے بلکہ وہ بھی جو قحطانی تھے اور جن کا سلسلہ نسب اس خاندان سے الگ تھا۔ عرب کے قبائل سال بھر آپس میں لڑتے رہتے تھے اور یہی غارت گریاں ان کی بقائے زندگانی کا ذریعہ تھیں کیونکہ اُن کی معاش بھی اسی پر منحصر تھی تاہم چار مہینے تک جو اشہرِ حرم کہلاتے تھے، تمام لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں۔ قبائل عرب دُور دُور سے سفر کر کے آتے اور اس قبلہ گاہِ عام میں عبادت اور عقیدت کے رسوم بجا لاتے تھے۔ وہ قبائل جن میں سے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہوتا تھا اب یکجا جمع نظر آتے تھے اور شیر و شکر ہو کر ملتے تھے کہ گویا بھائی بھائی ہیں۔ مسلمان بہ جبر مکہ سے نکالے گئے تھے لیکن یہ خیال ان کے دل سے نہیں گیا تھا اور نہ جا سکتا تھا کہ کعبہ پر ان کا بھی کم از کم اسی قدر حق ہے جس قدر اور قبائل کا ہے۔ اس کے ساتھ مکہ سے مسلمانوں کو گوناگوں تعلقات تھے اور وہ ان کا قدیم اور محبوب وطن تھا۔

مکہ کی یاد ایک پھانس تھی جو ہر وقت اُن کے کلیجے میں کھٹکتی رہتی تھی۔ حضرت بلالؓ مکہ میں اس قدر ستائے گئے تھے، تاہم ان کو جب مکہ یاد آتا تو روتے تھے اور پکار کر یہ اشعار پڑھتے تھے۔[1]

[1] یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی مذکور ہیں (باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ المدینۃ)۔ ش ن

الالیت شعری ھل ابیتن لیلۃ — آہ! کیا پھر کبھی وہ دن آسکتا ہے کہ میں مکہ کی وادی میں
بواد وحولی اذخر و جلیل — ایک رات بسر کروں اور میرے پاس اذخر اور جلیل ہوں
وھل اردن یوما میاہ مجنۃ — اور کیا وہ دن بھی ہوگا کہ میں مجنہ کے چشموں پر اتروں
وھل یبدون لی شامۃ وطفیل — اور شامہ و طفیل مجھ کو دکھائی دیں۔

اکثر مہاجرین جان بچا کر نکل آئے تھے لیکن خاندان اور بال بچے وہیں رہ گئے تھے۔

اسلام کے فرائض چہارگانہ میں حج کعبہ ایک رکن اعظم ہے۔ غرض مختلف اسباب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر مکہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور احتمال نہ ہو عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لیے۔ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے صرف تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی جائے۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام میں بند ہو۔

چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے، ۱۴۰۰ شخص اس سفر میں ہمرکاب ہوئے مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہوگئیں، یعنی قربانی کے اونٹ ساتھ تھے، ان کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگا دیئے گئے۔

احتیاط کے لیے قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیج دیا گیا کہ قریش کے ارادہ کی خبر لائے۔ جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا اس نے آکر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو یکجا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمدؐ مکہ میں کبھی نہیں آسکتے۔ غرض قریش نے بڑے زور و شور سے مقابلہ کی تیاری کی، قبائل متحدہ کے پیغام بھیجا وہ جمعیت عظیم لے کر آئے، مکہ سے باہر بلدح ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں۔ خالد بن ولید جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے۔ دو سو سوار لے کر جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش نے خالد کو طلیعہ بنا کر بھیجا ہے اور وہ مقام غمیم تک آگئے ہیں اس لئے کترا کر داہنی طرف سے چلو۔ فوج اسلام جب غمیم کے قریب پہنچ گئی تو خالد کو گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی، وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے اور قریش کو خبر کی کہ لشکر اسلام غمیم تک آگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر مقام کیا۔ یہاں پانی کی قلت تھی۔ ایک کنواں تھا وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہوگیا، لیکن اعجاز نبویؐ سے اس میں اس قدر پانی آگیا کہ سب سیراب ہوگئے۔

قبیلہ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا لیکن اسلام کے حلیف اور رازدار تھے۔ قریش اور عام کفار جو منصوبے اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے وہ ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے رئیس اعظم بدیل بن ورقا۔ تھے (فتح مکہ میں اسلام لائے) اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا معلوم ہوا تو چند آدمی ساتھ لے کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب

لھوساق معہ الھدی واحرم بالعمرۃ لیامن الناس من حربہ (ابن ہشام)

آرہا ہے، وہ آپ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم عمرہ[1] کی غرض سے آئے ہیں، لڑنا مقصود نہیں، جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے اور ان کو سخت نقصان پہنچایا ہے، ان کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک مدت معین کے لئے معاہدہ صلح کر لیں اور مجھ کو عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اس پر بھی اگر وہ راضی نہیں تو اس خدا کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو کر دے۔ بدیل نے جا کر قریش سے کہا کہ محمدؐ کے پاس سے پیغام لے کر آیا ہوں، اجازت دو تو کہوں۔ چند شریر بول اٹھے کہ ہم کو محمدؐ کے پیغام سننے کی ضرورت نہیں لیکن سنجیدہ لوگوں نے اجازت دی۔ بدیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرطیں پیش کیں۔ عروۃ بن مسعود ثقفی نے اٹھ کر کہا۔ کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں۔ بولے ہاں۔ عروۃ نے کہا میری نسبت تم کو کوئی بدگمانی تو نہیں، سب نے کہا نہیں۔ عروۃ نے کہا، اچھا تو مجھ کو اجازت دو کہ میں خود جا کر معاملے کروں، محمدؐ نے معقول شرطیں پیش کی ہیں۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے قریش کا پیغام سنایا اور کہا محمدؐ فرض کرو کہ تم نے قریش کا استیصال کر دیا تو کیا اس کی اور بھی کوئی مثال ہے کہ کسی نے اپنی قوم کو خود برباد کر دیا ہو؟ اس کے سوا اگر لڑائی کا رخ بدلا تو تمہارے ساتھ یہ جو بھیڑ ہے گرد کی طرح اڑ جائے گی۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس بدگمانی پر اس قدر غصہ آیا کہ گالی دے کر کہا کیا ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟ عروۃ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا ابوبکر۔ عروۃ نے کہا، میں ان کی سخت کلامی کا جواب دیتا لیکن ان کا ایک احسان میری گردن پر ہے جس کا بدلا ابھی تک میں ادا نہیں کر سکا۔

عروۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے تکلفانہ طریقہ سے گفتگو کر رہا تھا اور جیسا کہ عرب کا قاعدہ ہے کہ بات کرتے کرتے مخاطب کی داڑھی پکڑ لیتے ہیں، وہ ریش مبارک پر بار بار ہاتھ ڈالتا تھا۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ جو ہتھیار لگائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر کھڑے تھے، اس جرأت کو گوارہ نہ کر سکے۔ عروۃ سے کہا اپنا ہاتھ ہٹا لے ورنہ یہ ہاتھ بڑھ کر واپس نہ جا سکے گا۔ عروۃ نے حضرت مغیرہؓ کو پہچانا اور کہا او دغاباز! کیا میں تیری دغابازی کے معاملہ میں تیرا کام نہیں کر رہا ہوں (حضرت مغیرہؓ نے چند آدمی قتل کر دیئے تھے جن کا خون بہا عروۃ نے اپنے پاس سے ادا کیا تھا)

عروۃ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اس نے اس کے دل پر عجب اثر کیا، قریش سے جا کر کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے۔ کوئی شخص اُن کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا وہ وضو کرتے ہیں تو پانی جو گرتا ہے اُس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے، بلغم یا تھوک گرتا ہے تو عقیدت کیش

---

[1] عمرہ گویا ایک چھوٹا سا حج ہے جس میں حج کی اکثر رسمیں ادا کی جاتی ہیں (یعنی اس میں حرم کے باہر میقات سے احرام باندھ کر صفا اور مروہ کے درمیان سعی اور کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے اور بال منڈوائے یا کتروائے جاتے ہیں)

ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور چہرہ اور ہاتھوں میں مل لیتے ہیں۔

چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خراشؓ بن امیہ کو قریش کے پاس بھیجا لیکن قریش نے اُن کی سواری کے اونٹ کو جو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا تھا مار ڈالا اور خود اُن پر بھی یہی گزرنے والی تھی لیکن قبائل متحدہ کے لوگوں نے بچا لیا اور وہ کسی طرح جان بچا کر چلے آئے۔

اب قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو، لیکن یہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ گو یہ سخت شرارت تھی لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامنِ عفو اس سے زیادہ وسیع تھا، آپ نے سب کو چھوڑ دیا اور معافی دے دی۔ قرآن مجید میں اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ[1] ہے۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ (فتح-۳)

اور وہ وہی خدا ہے جس نے مکہ میں ان لوگوں کا ہاتھ تم سے اور تمہارا ہاتھ ان سے روک دیا، بعد اس کے کہ تم کو اُن پر قابو دے دیا تھا۔

بیعتِ رضوان

بالآخر آپ نے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عمرؓ کو انتخاب کیا لیکن انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھ کو بچا سکے۔ آپ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں مکہ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا قریش نے ان کو نظر بند کر لیا لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے۔ یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہؓ نے جن میں مرد و زن دونوں شامل تھے، ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دستِ مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اس بیعت کا نام بیعۃ الرضوان ہے سورۂ فتح میں اس واقعہ کا اور درخت کا ذکر ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا۔

خدا مسلمانوں سے راضی تھا جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا تو خدا نے ان پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی۔

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی۔

قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے، چنانچہ لوگوں نے ان کو خطیبِ قریش[2] کا خطاب دیا تھا، قریش نے اُن سے کہہ دیا صلح صرف اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں۔

سہیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک صلح کے شرائط پر گفتگو رہی۔ بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلم بند کریں۔ حضرت علیؓ نے عنوان پر بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ لکھا۔

---

[1] بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب وکتابۃ الشروط[1] ان آیتوں کی شان نزول میں سخت اختلاف ہے لیکن زیادہ معتبر یہی روایت ہے [2] زرقانی ج ۲ صفحہ ۲۲۳ ۔

عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوط کی ابتداء میں باسمک اللّٰھم لکھتے تھے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے وہ آشنا نہ تھے۔ اس بنا پر سہیل بن عمرو نے کہا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بجائے وہی قدیم الفاظ لکھے جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمایا۔ آگے کا فقرہ تھا۔ ھٰذا ما قاضیٰ علیہ محمد رسول اللہ۔ یعنی وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم کیا۔ سہیل نے کہا، اگر ہم آپ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا۔ آپ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گو تم تکذیب کرتے ہو لیکن خدا کی قسم! میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو۔ حضرت علیؓ سے زیادہ کون فرمان گزار ہو سکتا تھا۔ لیکن عالمِ محبت میں ایسے مقام بھی پیش آتے ہیں جہاں فرمانبری سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا میں ہرگز آپ کا نام نہ مٹاؤں گا۔ آپ نے فرمایا اچھا مجھ کو دکھاؤ میرا نام کہاں ہے؟ حضرت علیؓ نے اس جگہ پر انگلی رکھ دی۔ آپ نے "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دیا[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا نہیں آتا تھا اسی بنا پر آپ کو "اُمّی" کہتے ہیں۔ یہ واقعہ مسلم میں جہاں منقول ہے لکھا ہے کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر "ابن عبد اللہ" لکھ دیا۔ بخاری میں چونکہ یہ واقعہ عام روایت کے خلاف ہے اس لئے ایک معرکۃ الآرا مباحثہ بن گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام روزمرہ جب نظر سے گزرتا رہتا ہے تو ناخواندہ شخص بھی اپنے نام سے حرف آشنا ہو جاتا ہے اس سے اُمیّت میں فرق نہیں آتا۔ بے شبہ اُمّی ہونا آپ کا فخر ہے اور خود قرآن مجید میں یہ وصف شرف و عزت کے موقع پر استعمال ہوا ہے۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ (اعراف-۱۹)

شرائطِ صلح یہ تھیں۔

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

۲۔ اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ لائیں، وہ بھی نیام میں اور نیام بھی جُلبّان (تھیلا وغیرہ) میں۔

۴۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے تو واپس نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں، اتفاق یہ کہ عین اس وقت جب کہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا سہیل کے صاحبزادے (حضرت ابوجندلؓ) جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ میں کافروں نے ان کو قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی

---

[1] صحیح بخاری کی اس روایت میں حضرت علیؓ کا نام اور ان کی گفتگو مذکور نہیں، یہ تصریح بخاری کی اس روایت میں ہے جو کہ کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء میں مذکور ہے، صحیح مسلم میں بھی یہ واقعہ منقول ہے [2] یہ تمام شرائط کتب سیر کے علاوہ صحیح مسلم (صلح حدیبیہ) میں بھی ہیں۔

اذیتیں دیتے تھے۔ کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے، سہیل نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے۔ اس (ابو جندلؓ) کو شرائط صلح کے مطابق مجھ کو واپس دے دو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابھی معاہدہ قلم بند نہیں ہو چکا۔ سہیل نے کہا، تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا ان کو یہیں رہنے دو۔ سہیل نے نامنظور کیا۔ آپ نے چند دفعہ اصرار کیا، لیکن سہیل کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرنا۔ ابو جندلؓ کو کافروں نے اس طرح مارا تھا کہ ان کے جسم پر نشان تھے، مجمع کے سامنے تمام زخم دکھائے اور کہا برادرانِ اسلام! کیا پھر مجھ کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ میں اسلام لا چکا ہوں۔ کیا پھر مجھ کو کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہو؟ تمام مسلمان تڑپ اٹھے، حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا ہاں ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کیا ہم حق پر نہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا، ہاں ہم حق پر ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ آپ نے فرمایا، میں خدا کا پیغمبر ہوں اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا خدا میری مدد کرے گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے۔ حضرت عمرؓ اٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا، وہ پیغمبر خدا ہیں جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں[1]۔ حضرت عمرؓ کو اپنی ان گستاخانہ معروضات کا جو بے اختیاری میں اُن سے سرزد ہوئیں تمام عمر سخت رنج رہا اور اس کے کفارہ کے لئے انھوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، خیرات کی، غلام آزاد کئے۔ بخاری میں اگرچہ ان اعمال کا ذکر اجمالاً ہے، لیکن ابن اسحاق نے تفصیل سے یہ تمام باتیں گنائی ہیں۔

اس حالت کا گوارا کرنا گو صحابہ کی اطاعت شعاری کا سخت خطرناک امتحان تھا، ایک طرف (بظاہر) اسلام کی توہین ہے، حضرت ابو جندلؓ بیڑیاں پہنے، ۱۴ سو جاں نثارانِ اسلام سے استغاثہ کرتے ہیں، سب کے دل جوش سے لبریز ہیں اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذرا ایما ہو جائے تو تلوار فیصلہ قاطع کے لئے موجود ہے، دوسری طرف معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں اور ایفائے عہد کی ذمہ داری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو جندلؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

یا ابا جندل اصبر واحتسب فان اللّٰہ جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجا ومخرجا انا عقدنا بیننا وبین القوم صلحا وانا لا نغدر بھم (ابن ہشام)	ابو جندل، صبر اور ضبط سے کام لو، خدا تمہارے لئے اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکالے گا، صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔

غرض حضرت ابو جندلؓ کو اسی طرح پابزنجیر واپس جانا پڑا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں لیکن لوگ اس قدر دل شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا، یہاں تک کہ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے، تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہوا۔ آنحضرت

[1] صحیح بخاری کتاب الشروط ص ۳۸۰ کتاب الشروط ج ۱

صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے اور ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے کہا آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائیں۔ آپ نے باہر آکر خود قربانی کی اور بال منڈائے۔ اب جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اتارا۔ صلح کے بعد تین دن تک آپ نے حدیبیہ میں قیام فرمایا۔ پھر روانہ ہوئے تو راہ میں یہ سورہ اتری۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (فتح-۱)	ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔

تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھتے تھے، خدا نے اس کو فتح کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ فتح ہے؟ ارشاد ہوا کہ ہاں! (صحیح مسلم میں ہے کہ) حضرت عمرؓ کو تسکین ہو گئی اور مطمئن ہو گئے، نتائج مابعد نے اس رازِ سربستہ کی عقدہ کشائی کی۔ اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے، اب صلح کی وجہ سے آمد و رفت شروع ہوئی، خاندان اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ میں آتے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے۔ باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسن عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاقی کی ایک زندہ تصویر تھا جو مسلمان مکہ جاتے تھے ان کی صورتیں بھی مناظر پیش کرتی تھیں، اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ اس معاہدہ صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ کبھی نہیں لائے تھے حضرت خالدؓ (فاتح شام) اور حضرت عمروؓ بن عاص (فاتح مصر) کا اسلام بھی اسی زمانے کی یادگار ہے، معاہدہ صلح میں یہ جو شرط تھی کہ جو مسلمان مکہ سے چلا آئے گا وہ پھر مکہ کو واپس کر دیا جائے گا۔ اس میں صرف مرد داخل تھے عورتیں نہ تھیں، عورتوں کے متعلق خاص یہ آیت اتری۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۭ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۭ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۭ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (ممتحنہ-۲)	مسلمانو! جب تمہارے پاس عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو جانچ لو خدا ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے اب اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو اُن کو کافروں کے ہاں واپس نہ بھیجو، نہ وہ عورتیں کافروں کے قابل ہیں اور نہ کافر اُن عورتوں کے قابل ہیں اور ان عورتوں پر ان لوگوں نے جو خرچ کیا ہو وہ تم ان کو دے دو اور تم ان سے شادی کر سکتے ہو بشرطیکہ اُن کے مہر ادا کر دو اور کافرہ عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو۔

جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے، چونکہ کفار اُن کو سخت تکلیفیں دیتے تھے اس لئے وہ بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے تھے، سب سے پہلے حضرت عتبہؓ بن اسید (ابو بصیر) بھاگ کر مدینہ آئے۔ قریش نے آنحضرت

[1] صلح حدیبیہ کے واقعات صحیح بخاری میں نہایت تفصیل سے مذکور ہیں لیکن اصل موقع یعنی غزوات کے ذکر میں نہیں بلکہ کتاب الشروط میں اس بنا پر ارباب سیر کی نگاہ سے یہ واقعات رہ گئے۔ غزوات میں جستہ جستہ واقعات ہیں۔ ہم نے ان کو بھی لیا ہے۔ باقی جزئیات صحیح مسلم اور ابن ہشام سے ماخوذ ہیں۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو شخص بھیجے کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتبہؓ سے فرمایا کہ واپس جاؤ۔ عتبہ نے عرض کی کہ کیا آپ مجھ کو کافروں کے پاس بھیجتے ہیں کہ مجھ کو کفر پر مجبور کریں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، خدا اس کی کوئی تدبیر نکالے گا۔ حضرت عتبہؓ مجبوراً دو کافروں کی حراست میں واپس گئے لیکن مقام ذوالحلیفہ پہنچ کر انہوں نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا۔ دوسرا شخص جو بچ رہا اس نے مدینے میں آکر آنحضرت صلی اللہ سے شکایت کی۔ ساتھ ہی ابوبصیر بھی پہنچے اور عرض کی کہ آپؐ نے عہد کے موافق اپنی طرف سے مجھ کو واپس کر دیا اب آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ یہ کہہ کر مدینہ سے چلے گئے اور مقام عیص میں جو سمندر کے کنارے ذو مروۃ کے پاس ہے رہنا اختیار کیا۔ مکہ کے بیکس اور ستم رسیدہ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ جان بچانے کا ایک ٹھکانہ پیدا ہو گیا ہے تو چوری چھپے بھاگ بھاگ کر یہاں آنے لگے۔ چند روز کے بعد اچھی خاصی جمعیت ہو گئی، اور اب ان لوگوں نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ قریش کا کاروانِ تجارت جو شام کو جایا کرتا تھا، اس کو روک لیتے تھے۔ ان حملوں میں جو مالِ غنیمت مل جاتا تھا وہ ان کی معاش کا سہارا تھا۔

قریش نے مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھ بھیجا کہ معاہدہ کی اس شرط سے ہم باز آتے ہیں۔ اب جو مسلمان چاہے مدینہ جا کر آباد ہو سکتا ہے۔ ہم اس سے تعرض نہ کریں گے، آپؐ نے آوارہ وطن مسلمانوں کو لکھ بھیجا کہ یہاں چلے آؤ، چنانچہ ابوجندلؓ اور اُن کے ساتھی مدینہ میں آکر آباد ہو گئے اور کاروانِ قریش کا راستہ بدستور کھل گیا۔

مستورات میں سے حضرت ام کلثومؓ جو رئیس مکہ (عقبہ بن ابی معیط) کی صاحبزادی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں، مدینہ ہجرت کر کے آئیں لیکن اُن کے ساتھ ان کے دونوں بھائی عمارۃ اور ولید بھی آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کو واپس دے دیجیے۔ آپؐ نے منظور نہیں فرمایا۔ صحابہؓ میں سے جن لوگوں کی ازواج مکہ میں رہ گئی تھیں اور اب تک کافرہ تھیں، صحابہ نے ان کو طلاق دے دی۔

✶

ے یہ تفصیل اکتفا۔ کلاعی سے خمیس نے نقل کی ہے۔

سلاطین کو اسلام کی دعوت

(آخر ۶ھ یا شروع ۷ھ)

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

حدیبیہ کی صُلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا کے کانوں میں پہنچا دیا جائے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور خطبہ دیا۔ ایھا الناس! خدا نے مجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، دیکھو حواریینِ عیسیٰؑ کی طرح اختلاف نہ کرنا، جاؤ میری طرف سے پیغامِ حق ادا کرو۔ اس کے بعد آپؐ نے قیصرِ روم، شہنشاہِ عجم، عزیزِ مصر اور رؤسائے عرب کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط ارسال فرمائے۔ جو لوگ خطوط لے کر گئے اور جن کے نام لے کر گئے اُن کی تفصیل یہ ہے۔[1]

حضرت دحیہؓ کلبی۔	قیصرِ روم۔
حضرت عبداللہؓ بن حذافہ سہمی۔	خسرو پرویز کجکلاہِ ایران۔
حضرت حاطبؓ بن (ابی) بلتعہ۔	عزیزِ مصر۔
حضرت عمروؓ بن امیہ۔	نجاشی بادشاہ حبش۔
حضرت سلیطؓ بن عمر بن عبد شمس۔	رؤسائے یمامہ۔
حضرت شجاعؓ بن وہب الاسدی۔	رئیس حدودِ شام، حارث غسانی۔

ایرانیوں نے چند برس پہلے بلادِ شام پر حملہ کر کے رومیوں کو شکست دی تھی جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں غُلِبَتِ الرُّوْمُ میں ہے، ہرقل نے اس کے انتقام کے لئے بڑے سرو سامان سے فوجیں تیار کیں اور ایرانیوں پر حملہ کر کے اُن کو سخت شکست دی تھی اس کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے وہ حمص سے بیت المقدس آیا تھا اور اس شان سے آیا تھا کہ جہاں چلتا تھا زمین پر فرش اور فرش پر پھول بچھائے جاتے تھے۔[2]

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیر حکومت رہا کرتا تھا وہ غسانی خاندان تھا اور اس کا پایۂ تخت بصریٰ تھا جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آج کل حوران کہلاتا ہے، اس زمانہ میں اس خاندان کا تخت نشین حارث غسانی تھا دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک یہیں بصریٰ میں حارث غسانی کو لا کر دیا، اس نے قیصر کے پاس

[1] طبری (ج ۳ ص ۱۵۵۹) اور ابن ہشام (باب خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الملوک)۔ [2] ہرقل کا پورا واقعہ فتح الباری (ج اول ص ۳۵) شرح صحیح بخاری سے لیا گیا ہے۔ اصل صحیح بخاری (بخاری کیف کان بدء الوحی و کتاب الجہاد باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الاسلام والنبوۃ) میں مجمل واقعہ ہے۔ زائد تفصیلیں حافظ ابن حجر نے اور کتابوں سے بڑھائی ہیں۔

بیت المقدس میں بھیج دیا۔ قیصر کو خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ۔ اتفاق یہ کہ ابوسفیان تجارِ عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھے۔ قیصر کے آدمی اُن کو غزہ سے جا کر لائے۔

قیصر نے بڑے سامان سے دربار منعقد کیا، خود تاجِ شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا تخت کے چاروں طرف بطارقہ، قیس اور رہبان کی صفیں قائم کیں۔ اہلِ عرب کی طرف مخاطب ہو کر کہا تم میں سے اس مدعیٔ نبوت کا رشتہ دار کون ہے۔ ابوسفیان نے کہا "میں"۔ پھر حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

قیصر   مدعیٔ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان   شریف ہے۔

قیصر   اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان   نہیں۔

قیصر   اس خاندان میں کوئی بادشاہ بھی گزرا ہے؟

ابوسفیان   نہیں۔

قیصر   جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحبِ اثر؟

ابوسفیان   کمزور لوگ ہیں۔

قیصر   اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان   بڑھتے جاتے ہیں۔

قیصر   کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟

ابوسفیان   نہیں۔

قیصر   وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟

ابوسفیان   ابھی تک تو نہیں کی، لیکن اب جو نیا معاہدہ صلح ہوا ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں؟

قیصر   تم لوگوں نے کبھی اس سے جنگ بھی کی؟

ابوسفیان   ہاں۔

قیصر   نتیجۂ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان   کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔

قیصر   وہ کیا سکھاتا ہے؟

ابوسفیان   کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے کہا کہ تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر ہمیشہ اچھے

خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں، کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے، پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اُس نے کبھی فریب نہیں کیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے، تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ و عفاف کی ہدایت کرتا ہے، اگر یہ سچ ہے تو میری قدمگاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا، مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا، اگر وہاں جا سکتا تو خود اُس کے پاؤں دھوتا۔

اس گفتگو کے بعد حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھا جائے۔

فرمانِ رسالت کے یہ الفاظ تھے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد عبد اللہ و رسولہ الی ھرقل عظیم الروم، سلام علی من اتبع الھدیٰ، اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یؤتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فان علیک اثم الاریسیین وَيَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمدؐ کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے اس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے، اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں اسلام لا تو سلامت رہے گا خدا تجھ کو دگنا اجر دے گا اور اگر تو نے نہ مانا تو اہلِ ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا، اے اہلِ کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کو چھوڑ کر خدا نہ بنائے اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم ماننے والے ہیں۔

قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی، اس سے بطارقہ اور اہلِ دربار سخت برہم ہو چکے تھے، نامۂ مبارک کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہوئے، یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہلِ عرب کو دربار سے اٹھا دیا اور گو اس کے دل میں نورِ اسلام آچکا تھا لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی۔[1]

---

[1] یہ پوری گفتگو صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں منقول ہے، ابتدائے کتاب میں بھی اور باب الجہاد میں بھی، مسند ابن حنبل صفحہ ۴ جلد ۳ میں ہے کہ حضرت دحیہؓ کے ساتھ قیصر نے اپنا ایک سفیر خط کا جواب دے کر خدمتِ نبویؐ میں بھیجا تھا اور سفیر کو نبوت کے چند سوالات بتا دیئے تھے، اس نے سوالات پوچھے، آپ نے جوابات دیئے اور آخر بغیر اسلام لائے وہ واپس گیا لیکن یہ حدیث صحیح نہیں، اس میں ہے کہ قیصر کا خط پڑھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ کو بلایا اور انھوں نے پڑھ کر سنایا حالانکہ وہ اس وقت اسلام بھی نہیں لائے تھے (جامع کے نزدیک حسب تحقیق ابن حجر فتح الباری ج ۸ صفحہ ۹ و زرقانی ج ۳ ص ۸۸ و ۸۹ یہ واقعہ دوسرا ہے اور اس کے بعد کا ہے اور خود اس حدیث میں تصریح ہے کہ یہ تبوک کا واقعہ ہے اور غزوۂ تبوک فتح مکہ کے بعد رجب ۹ھ میں پیش آیا ہے اور حضرت معاویہؓ اس سے ایک یا دو سال پہلے حدیبیہ یا فتح مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے مگر تبوک میں حضرت معاویہؓ

خسرو پرویز شہنشاہِ ایران کے نام جو نامۂ مبارک حضرت عبد اللہ بن حذافہ لے کر گئے تھے، یہ تھا،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس سلام علی من اتبع الھدیٰ وآمن باللہ ورسولہ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ الی الناس کافۃ لینذر من کان حیا اسلم تسلم فان ابیت فعلیک اثم المجوس۔

خدائے رحمٰن ورحیم کے نام سے محمد پیغمبر کی طرف سے کسریٰ (رئیسِ فارس) کے نام سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور خدا اور پیغمبر خدا پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کہ خدا صرف ایک خدا ہے اور یہ کہ خدا نے محمد کو تمام دنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے تو اسلام قبول کر تو سلامت رہے گا ورنہ مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔

خسرو پرویز بڑی شوکت وشان کا بادشاہ تھا، اس کی سلطنت میں دربار کو جو عظمت وجلال حاصل ہوا کبھی نہیں ہوا تھا، عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے، ان میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا، نامۂ مبارک میں پہلے خدا کا نام اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تھا، خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا کہ میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے،[1] پھر نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا، لیکن چند روز کے بعد خود سلطنتِ عجم کے پرزے اڑ گئے۔

نظامی نے شیریں خسرو میں یہ داستان مفصل لکھی ہے اور اسلامی جوش سے لکھی ہے۔ ہم اس کے چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں:۔

دراں دوراں کہ گیتی رام او بود ۔۔۔ زمشرق تا بہ مغرب نام او بود
رسولِ ما بہ حجت ہائے قاہر ۔۔۔ نبوت در جہان می کرد ظاہر
گہے باسنگ خارا راز می گفت ۔۔۔ گہے ریگش حکایت باز می گفت
خلائق راز دعوت جام در داد ۔۔۔ بہ ہر کشور صلائے عام در داد
بفرمود از عطا عطرے سرشتند ۔۔۔ بہ نام ہر یکے سطرے نوشتند
چو از نامِ نجاشی باز پرداخت ۔۔۔ زمہر نام خسرو نامہ ساخت
چو قاصد عرضہ کرد آں نامۂ نو ۔۔۔ بجوشید از غضب اندام خسرو
زتیزی گشت ہر مویش سنانی ۔۔۔ زگرمی ہر رگش آتش فشانی
سوادے دید روشن ہیبت انگیز ۔۔۔ نوشتہ از محمد سوئے پرویز
چو عنوان گاہ عالم تاب را دید ۔۔۔ تو گفتی سگ گزیدہ آب را دید
غرور بادشاہی بردش از راہ ۔۔۔ کہ گستاخی کرا یارو؟ باچو من شاہ
کہ از ہرہ کہ با ایں احترامم ۔۔۔ نویسد نام خود بالائے نامم
زرخ از گرمی چو آتش گاہ خود کرد ۔۔۔ بخود اندیشۂ بد کرد، و بد کرد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی شرکت کہیں مذکور نہیں، یہ روایت اسی سند کے ساتھ کتاب الاموال ابو عبیدہ القاسم بن سلام ص ۲۵ مصر میں بھی موجود ہے۔ [1] استیعاب خسرو مراد ہے۔

درید آں نامہ گردن شکن را ۔۔۔ نہ نامہ بلکہ نام خویشتن را
فرستادہ چو دید آں خشمناکی ۔۔۔ بہ رجعت پائے خود را کرد خاکی
ازاں آتش کہ آں دودِ تہی داشت ۔۔۔ چراغِ آگہاں[1] را آگہی داشت
زگرمی آں چراغِ گردن افراز ۔۔۔ دعا را داد چوں پروانہ پرواز
عجم رازاں دعا کسریٰ در افتاد ۔۔۔ کلاہ از تارکِ کسریٰ در افتاد
نہ بے شاہنشہے کز بیم و امید ۔۔۔ قلم رانده بر افریدون جمشید

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد خسرو پرویز نے گورنر یمن کو جس کا نام باذان تھا فرمان بھیجا کہ کسی شخص کو حجاز بھیجو کہ اس نئے مدعیٔ نبوت کو پکڑ کر میرے دربار میں لائے۔ باذان نے دو شخصوں کو جن میں سے ایک کا نام بابویہ اور دوسرے کا خرخسرہ تھا، مدینہ منورہ روانہ کیا۔ ان دونوں نے بارگاہِ رسالت میں آکر عرض کی کہ شہنشاہِ عالم (کسریٰ) نے تم کو بلایا ہے، اگر تعمیل حکم نہ کرو گے تو وہ تم کو اور تمہارے ملک کو برباد کر دے گا۔ آپ نے فرمایا تم واپس جاؤ اور کہہ دینا کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی۔ یہ لوگ پیغام پہنچا کر یمن میں آئے تو خبر آئی کہ شیرویہ (خسرو پرویز کا بیٹا) نے خسرو پرویز کو قتل کر ڈالا۔[2]

نجاشی (بادشاہِ حبش) کو آپ نے دعوتِ اسلام کا جو خط بھیجا تھا اس کے جواب میں اس نے عریضہ بھیجا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے سچے پیغمبر ہیں، حضرت جعفر طیارؓ جو ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے یہیں موجود تھے۔ نجاشی نے اُن کے ہاتھ پر بیعتِ اسلام کی۔ ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ نجاشی نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں عرض نیاز کے لئے بھیجا، لیکن جہاز سمندر میں ڈوب گیا اور یہ سفارت ہلاک ہو گئی۔[3]

عام اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے ۹ھ میں وفات پائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور یہ خبر سن کر آپ نے غائبانہ اُس کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ لیکن یہ غلط ہے، صحیح مسلم میں تصریح کی ہے کہ جس نجاشی کی نمازِ جنازہ آپ نے پڑھی وہ یہ نہ تھا، لیکن ابن قیم نے اربابِ سیر کی روایت کی تائید کی ہے اور مسلم کی روایت کے اس ٹکڑا کو راوی کا وہم بتایا ہے۔[4]

جو لوگ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے، ان میں حضرت ام حبیبہؓ (حضرت امیر معاویہؓ کی بہن) بھی تھیں، اُن کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو لکھ بھیجا کہ ام حبیبہؓ کو شادی کا پیغام سنا دو اور میرے پاس بھیج دو۔ نجاشی نے خالدؓ بن سعید ابن العاص کو مقرر کیا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایجاب وقبول ادا کیا۔ نجاشی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مہر ادا کیا جس کی تعداد چار سو اشرفیاں تھیں، نکاح کے بعد حضرت ام حبیبہؓ جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوئیں اور مدینہ کی بندرگاہ میں اتریں، آنحضرت

[1] آگہاں یعنی اربابِ علم، چراغِ آگہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ "آگہی داشت" یعنی خبر کی۔ [2] طبری ج ۳ ص ۱۵۷۲۔ [3] طبری ج ۳ ص ۱۵۶۹۔ [4] زاد المعاد۔ "س ن"۔

صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خیبر میں تشریف رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر نجاشی کے حالات حضرت ام حبیبہؓ سے پوچھا کرتے تھے۔[1]

عزیز مصر (مقوقس) کو آپ نے جو خط لکھا تھا اس کے جواب میں اس نے عربی زبان میں یہ خط لکھا۔

لمحمد بن عبد الله من المقوقس عظیم القبط سلام علیك، اما بعد فقد قرأت کتابك وفهمت ماذکرت فیه وما تدعو الیه وقد علمت ان نبیا بقی وکنت اظن ان یخرج من الشام وقد اکرمت رسولك وبعثت الیك بجاریتین لهما مکان من القبط عظیم وکسوة واهدیت الیك بغلة لترکبها والسلام علیك۔

محمد بن عبد اللہ کے نام مقوقس رئیس قبط کی طرف سے سلام علیک کے بعد، میں نے آپ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا، مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے میں نے آپ کے قاصد کی عزت کی اور دو لڑکیاں[2] بھیجتا ہوں جن کی قبطیوں میں (مصر کی قوم) بہت عزت کی جاتی ہے اور میں آپ کے لئے کپڑا اور سواری کا ایک خچر بھیجتا ہوں۔

بایں ہمہ عزیز مصر اسلام نہیں لایا، دو لڑکیاں جو بھیجی تھیں، ان میں ایک ماریہ قبطیہ تھیں جو حرم نبوی میں داخل ہوئیں، دوسری سیرین تھیں جو حضرت حسانؓ کی ملک میں آئیں۔ خچر کا نام دلدل تھا جس کا ذکر اکثر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے، جنگِ حنین میں آپ اسی پر سوار تھے۔ طبری نے لکھا ہے کہ ماریہ اور سیرین حقیقی بہنیں تھیں اور حضرت حاطبؓ ابن بلتعہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقوقس کے پاس خط دے کر بھیجا تھا۔ ان کی تعلیم سے دونوں خاتونیں خدمتِ نبویؐ میں پہنچنے سے پہلے اسلام قبول کر چکی تھیں۔ اس واقعہ کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ یہ دونوں خاتونیں لونڈیاں نہ تھیں اور اسلام قبول کر چکی تھیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہؓ سے نکاح کیا ہوگا نہ کہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپ کے حرم میں آئیں۔

رؤسائے عرب کو جو خط لکھے گئے تھے اُن کے بھی جواب مختلف آئے۔ ہوذہ ابن علی رئیس یمامہ نے لکھا تم جو باتیں کہتے ہو وہ نہایت اچھی ہیں۔ اگر حکومت میں کچھ میرا بھی حصہ ہو تو میں تمہاری اقتدا کے لئے تیار ہوں اسلام ہوسِ ملک کے لئے نہیں آیا تھا۔ آپ نے فرمایا "زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو میں نہ دوں گا"۔

حارث غسانی جو حدودِ شام کا رئیس تھا اور رومیوں کے ماتحت اطراف کے عربوں میں حکومت کرتا تھا، خط پڑھ کر برہم ہوا اور فوج کو تیاری کا حکم دیا، مسلمان اس جرم کی پاداش میں ہر وقت اس کے حملہ کے منتظر رہتے تھے اور آخر موتہ اور تبوک وغیرہ کی لڑائیاں پیش آئیں۔[3]

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ صفحہ ۱۵۷۰۔ [2] ہم نے جاریہ کا ترجمہ لڑکی کیا ہے، عربی میں جاریہ لڑکی کو بھی کہتے ہیں اور لونڈی کو بھی ارباب سیرت ماریہ قبطیہ کو لونڈی کہتے ہیں۔ لیکن مقوقس نے جو لفظ ان کی نسبت لکھا ہے یعنی کہ مصریوں میں بڑی عزت ہے، یہ لونڈیوں کی شان میں استعمال نہیں کئے جا سکتے [3] اور جن رؤسائے قبائل اور امرائے عرب کو دعوتی خطوط لکھے گئے تھے ان کی تفصیل دوسری جلد کے تبلیغی واقعات میں آئے گی۔

واقعات متفرقہ ۶ھ حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص کا اسلام

حدیبیہ کی صلح کو خدا نے فتح کہا ہے لیکن اجسام کی نہیں قلوب کی، اسلام کو اپنی اشاعت کے لئے امن درکار تھا اور وہ اس صلح سے حاصل ہو گیا، اس صلح کو خود دشمن فتح سمجھتے تھے۔ قریش اور مسلمانوں میں اب تک جو معرکے ہوئے فوجی حیثیت سے قریش کی صف میں ہر جگہ خالد بن ولید کا نام ممتاز نظر آتا ہے، جاہلیت میں رسالہ کی افسری ان ہی کے سپرد تھی۔ اُحد میں قریش کے اکھڑے ہوئے پاؤں ان ہی کی کوشش سے سنبھلے تھے، حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش کا طلایہ ان ہی کی زیر افسری نظر آیا تھا، لیکن قریش کا یہ سپہ سالار اعظم بھی آخر اسلام کے حملہ کاری سے نہ بچ سکا۔

صلح حدیبیہ کے بعد حضرت خالدؓ نے مکہ سے نکل کر مدینہ کا رُخ کیا۔ راستہ میں حضرت عمروؓ بن العاص ملے پوچھا کدھر کا قصد ہے؟ بولے اسلام لانے جاتا ہوں، آخر کب تک؟ حضرت عمروؓ بن العاص نے کہا۔ ہمارا بھی یہی ارادہ ہے۔ دونوں صاحب ایک ساتھ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے اور اب وہ جوہر جو اسلام کی مخالفت میں صرف ہو رہا تھا، اسلام کی محبت میں صرف ہونے لگا۔

فتح مکہ میں حضرت خالدؓ جب ایک مسلمان دستہ کے افسر بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے گزرے تو آپؐ نے پوچھا کون ہے؟ لوگوں نے کہا خالدؓ ہیں۔ آپ نے فرمایا "خدا کی تلوار ہے"۔[1]

غزوہ موتہ میں جب حضرت جعفرؓ، زیدؓ بن حارثہ اور عبد اللہؓ بن رواحہ کے بعد حضرت خالدؓ نے اپنے ہاتھ میں علم لیا تو مسلمان خطرہ سے باہر تھے۔

عہدِ خلافت میں ایک (خالدؓ) نے شام کا ملک قیصر سے چھین لیا اور دوسرا (عمروؓ بن العاص) مصر کا فاتح ہوا۔

---

[1] اصابہ ابن حجر بروایت ابن اسحاق ج اول ص ۴۱۳ [2] ترمذی، مناقب۔

۷ھ

خیبر

آخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ

خیبر غالباً عبرانی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں، یہ مقام مدینہ منورہ سے آٹھ منزل پر ہے۔ یورپین سیاحوں میں ڈاؤتی کئی مہینے تک یہاں ۱۸۷۷ء میں مقیم رہا، اس نے مدینہ سے اس مقام کا فاصلہ ۲۰۰ میل لکھا ہے[1] وہ نخلستان جس کے کنارے پر خیبر ہے نہایت زرخیز ہے۔ یہاں یہود نے نہایت مضبوط متعدد قلعے بنائے تھے جن میں سے بعض کے آثار اب تک باقی ہیں، عرب میں یہودی قوت کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا، مدینہ سے جب رؤسائے بنو نضیر جلا وطن ہو کر خیبر میں آباد ہوئے تو انھوں نے تمام عرب کو اسلام کی مخالفت پر برانگیختہ کر دیا جس کا پہلا مظہر احزاب کا معرکہ تھا۔ ان رؤسا میں سے حیی بن اخطب جنگ قریظہ میں قتل ہوا، جس کے بعد ابو رافع سلّام بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا۔ یہ بہت بڑا تاجر اور صاحب اثر تھا، قبیلۂ غطفان جو عرب کا بہت بڑا صاحب اثر قبیلہ تھا ان کی آبادی خیبر سے متصل تھی اور ہمیشہ سے یہودِ خیبر کے حلیف اور ہم عہد تھے۔[2] ۶ھ میں سلّام نے خود جا کر قبیلۂ غطفان اور اُن کے آس پاس کے قبیلوں کو اسلام کے مقابلہ کے لئے آمادہ کیا، یہاں تک کہ ایک عظیم الشان فوج لے کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کیں۔[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں معلوم ہوئیں تو آپ کے ایما سے (رمضان ۶ھ میں حضرت عبداللہ بن عتیک ایک خزرجی انصاری کے ہاتھ سے اپنے قلعہ خیبر میں سوتا ہوا مارا گیا) سلّام کے بعد یہودیوں نے اُسیر بن رزام کو مسندِ ریاست پر بٹھایا۔ اُس نے قبائلِ یہود کو جمع کر کے تقریر کی اور کہا کہ میرے پیش روؤں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلہ میں جو تدبیریں اختیار کیں وہ غلط تھیں صحیح تدبیر یہ ہے کہ خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دار الریاست پر حملہ کیا جائے اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا اس غرض سے اُسیر نے غطفان اور دیگر قبائل میں دورہ کیا اور ایک فوجِ گراں تیار کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے اس افواہ پر اعتماد نہیں کیا بلکہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجا کہ خود خیبر جا کر اصل

---

[1] مارگولوس ص۳۵۶، [2] ابن خلدون جلد۲ ذکر قبائل عرب و تاریخ خمیس ج۲ ص۴۳ باب غزوۂ خیبر۔ [3] ابن سعد ص۶۶ اصلی الفاظ یہ ہیں۔

کان ابو رافع بن ابی الحقیق قد اجلب فی غطفان ومن حولہ من مشرکی العرب وجعل لھم الجعل العظیم لحرب رسول اللہ

ابو رافع نے غطفان اور آس پاس کے مشرکین عرب کو جنگ پر آمادہ کیا تھا اور ایک بہت بڑی بھیڑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کیلئے جمع کیا

صحیح بخاری باب قتل ابی رافع میں ہے وکان ابو رافع یوذی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویعین علیہ یعنی ابو رافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچایا کرتا تھا اور آپ کے دشمنوں کو آپ کے مقابلہ میں مدد دیا کرتا تھا، اس امداد و اعانت کی تفصیل بروایت عروہ فتح الباری (ج۷، ص۲۴۳) تک میں مفصل مذکور ہے [4] زرقانی علی المواہب ج۲ ص۱۹۵ مصر [illegible]

واقعہ کی تحقیق کریں۔ چنانچہ وہ چند آدمیوں کو لے کر خیبر گئے اور چھپ کر خود اسیر کی زبانی اُس کے مشورے اور تدبیریں سنیں۔ یہ حالات آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کئے۔ آپ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو ۳۰ آدمی دے کر خیبر کو روانہ کیا۔ ان لوگوں نے اُسیر سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس لئے بھیجا ہے کہ اگر تم حاضر ہو جاؤ تو خیبر کی حکومت تم کو دے دی جائے، چنانچہ وہ ۳۰ آدمی لے کر خیبر سے نکلا اور احتیاط کی بنا پر یہ مخلوط قافلہ اس طرح چلا کہ دو دو شخص ہم رکاب چلتے تھے، جن میں ایک یہودی دوسرا مسلمان ہوتا تھا۔ قرقرہ پہنچ کر اُسیر کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی، اس نے ہاتھ بڑھا کر حضرت عبداللہؓ بن انیس سے تلوار چھیننی چاہی۔ انھوں نے کہا او دشمن خدا! بدعہدی کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہہ کر سواری بڑھائی اور جب اُسیر زد پر آگیا تو تلوار ماری کہ اُس کی ران کٹ گئی۔ وہ گھوڑے سے گرا، گرتے گرتے اس نے حضرت عبداللہؓ کو زخمی کیا اب مسلمان پیش دستی کر کے یہود پر ٹوٹ پڑے۔ نتیجۂ جنگ یہ تھا کہ یہود میں ایک کے سوا کوئی نہیں بچا یہ اخیر ۶ھ یا محرم ۷ھ کا واقعہ ہے۔[1]

خیبر اب اسلام کا سب سے بڑا حریف اور اسلام کے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ ان لوگوں نے مکہ جا کر قریش کے ذریعہ سے تمام عرب میں بغاوت کی ایک عالمگیر جنبش پیدا کر دی جس نے واقعۂ احزاب میں مرکز اسلام (مدینہ منورہ) کو متزلزل کر دیا تھا۔ یہ کوشش اگرچہ ناکام رہی لیکن جو دست و بازو کام کر رہے تھے اب بھی موجود تھے، جن لوگوں نے جنگِ احزاب برپا کرائی تھی ان میں زیادہ بااثر ابن ابی الحقیق کا خاندان تھا جو قبیلۂ بنی نضیر سے تھا اور مدینہ سے جلا وطن ہو کر آیا تھا اس نے خیبر کے مشہور قلعہ قموص پر قبضہ کیا تھا، سلّام بن ابی الحقیق جس کا ذکر ابھی اوپر گزر چکا ہے اسی خاندان کا رئیس تھا اس کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق خاندان کی ریاست پر ممتاز ہوا خیبر کے یہود ادھر تو غطفان سے اسلام کے مقابلہ کے لئے سازش کر رہے تھے ادھر مدینہ کے منافقین انکو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے اور ان کو ہمت دلاتے تھے کہ مسلمان تم سے سر بر نہیں ہو سکتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ ان لوگوں سے معاہدہ ہو جائے، اس بنا پر آپ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجا تھا لیکن ادھر تو یہود خود سخت دل اور ایک بدگمان قوم تھی، اُدھر منافقین ان کو ابھارتے تھے، اسی زمانہ میں راس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے اہل خیبر کے پاس کہلا بھیجا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں لیکن تم ان سے نہ ڈرنا ان کی ہستی کیا ہے مٹھی بھر آدمی ہیں جن کے پاس ہتھیار تک نہیں۔ یہود نے یہ سن کر کنانہ اور ہوذہ ابن قیس کو غطفان کے پاس بھیجا کہ ہمارے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرو تو ہم نخلستان کی نصف پیداوار تم کو دیں گے (ایک روایت میں ہے کہ) غطفان نے اس کو منظور کیا۔[2]

---

[1] یہ واقعات ابن سعد سے منقول ہیں، بہت سی کتابوں میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن انیس نے خود ابتداء کی اور اسیر بن رزام کو قتل کر ڈالا، لیکن صحیح واقعہ وہی ہے جو ابن سعد سے منقول ہے، اور وہی اس معرکہ کی وجہ ہو سکتا ہے۔ [2] تاریخ خمیس (ج۲ ص۴۳)۔ عام روایتوں میں گو یہ ہے کہ غطفان نے مسلمانوں کے خوف سے اس کو منظور نہیں کیا تاہم یہ ظاہر ہے کہ ان کی اس ناطرفداری پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ (ص۴۳)

غطفان کا ایک قوت ور قبیلہ بنو فزارہ تھا ان کو جب معلوم ہوا کہ خیبر والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود خیبر میں آئے کہ ہم تمہارے ساتھ شریک ہو کر لڑیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے بنو فزارہ کو خط لکھا کہ تم خیبر والوں کی مدد سے باز آؤ، خیبر فتح ہو جائے گا تو تم کو بھی حصہ دیا جائے گا، لیکن بنو فزارہ نے انکار کیا۔

ذی قرد محرم ۷ھ

غطفان کی شرکتِ جنگ کا دیباچہ یہ تھا کہ ذی قرد کی چراگاہ پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنیوں کی چراگاہ تھی (اس قبیلہ کے چند آدمیوں نے بسرداری عبد الرحمٰن ابن عیینہ) چھاپہ مارا اور بیس اونٹنیاں پکڑ کر لے گئے۔ حضرت ابوذرؓ کے صاحبزادے کو جو اونٹنیوں کی حفاظت پر متعین تھے قتل کر دیا اور ان کی بیوی کو گرفتار کر کے لے گئے (مسلمانوں نے جب تعاقب کیا تو وہ درہ میں گھس گئے وہاں) عیینہ بن حصن جو قبائل غطفان کا سپہ سالار تھا ان کی امداد کو موجود تھا، مسلمانوں میں حضرت سلمہؓ بن الاکوع ایک مشہور تیر انداز صحابی تھے سب سے پہلے ان کو اس غارت گری کا علم ہوا، انہوں نے واصباحاہ کا نعرہ مارا اور دوڑ کر حملہ آوروں کو جا لیا، وہ اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے، سلمہؓ نے تیر برسانے شروع کئے، حملہ آور بھاگ نکلے، انہوں نے تعاقب کیا اور لڑ بھڑ کر تمام اونٹنیاں چھڑا لائے، دربارِ نبوت میں آ کر عرض کی کہ میں دشمنوں کو پیاسا چھوڑ آیا ہوں، اگر سو آدمی مل جائیں تو ایک ایک کو گرفتار کر کے لاتا ہوں، آپؐ نے رحمتِ عام کے لحاظ سے فرمایا:

ملکت فاسجع۔ قابو پا جاؤ تو عفو سے کام لو۔

اس واقعہ کے تین دن[1] بعد خیبر کی جنگ پیش آئی۔

خیبر کا آغاز اور غزوات کی بہ نسبت ایک امتیازِ خاص رکھتا ہے اور اگرچہ اربابِ سیر کی نظر اس نکتہ پر نہیں پڑی

---

[1] یہ واقعہ معجم البلدان لفظ جنفاء کے ذیل میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے بالفاظہا نقل کیا ہے، اصل الفاظ یہ ہیں۔

روی موسیٰ بن عقبة عن ابن شهاب قال كانت بنو فزارة ممن قدم على اهل خيبر ليعينوهم فراسلهم رسول الله صلى الله عليه وسلم ان لا يعينوهم وسالهم ان يخرجوا عنهم۔ الخ ج ۳ ص ۱۵۲ معجم

[2] یہ واقعہ بخاری و مسلم میں بھی منقول ہے لیکن زیادہ تفصیل ابن سعد و ابن اسحاق سے لی گئی ہے [3] اربابِ سیر نے متفقاً اس واقعہ کو خیبر کے واقعہ سے ایک سال ماقبل بیان کیا ہے، لیکن طبری نے بروایت سلمہ جو اس غزوہ کے ہیرو تھے اور نیز امام بخاری نے صاف تصریح کی ہے کہ خیبر سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے، حافظ ابن حجر نے اربابِ سیر کا بیان لکھ کر لکھا ہے۔

فعلی هذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوة ذی قرد اصح مما ذكره اهل السير۔ تو اس بنا پر جو کچھ صحیح بخاری میں غزوۂ ذی قرد کے متعلق مذکور ہے وہ اربابِ سیر کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔

حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ عیینہ بن حصن نے ذو قرد پر دو دفعہ حملہ کیا تھا، عام اربابِ سیر جس کا تذکرہ کرتے ہیں وہ پہلا حملہ تھا اور یہ بالکل قرینِ قیاس ہے (فتح الباری ج ۷، ص ۳۵۲ باب غزوہ ذی قرد) [4] عام اربابِ سیر کو غزوہ خیبر بلکہ تمام غزوات کے متعلق چونکہ کسی سبب کی تلاش و جستجو نہیں اس لئے ان کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ واقعات کا تسلسل اور غزوات کے اسباب کیا ہیں، لیکن زیادہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

کہ اس امتیاز کے اسباب کیا تھے؟ تاہم واقعہ کی حیثیت سے امتیازی امور ان کی زبان سے بھی بلا قصد نکل گئے ہیں، سب سے مقدم یہ کہ جب آپؐ نے خیبر کا قصد کیا تو اعلانِ عام کر دیا کہ:

لا یخرج معنا الا راغب فی الجهاد (ابن سعد) ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ آئیں جو طالبِ جہاد ہوں

اب تک جو لڑائیاں واقع ہوئیں محض دفاعی تھیں۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا بنائے گئے طرزِ حکومت کی بنیاد قائم ہوئی۔ اسلام کا اصلی مقصد تبلیغِ دعوت ہے، اب اگر کوئی قوم اس دعوت کی سدِ راہ نہ ہو تو اسلام کو اس سے نہ تو جنگ ہے نہ اس کے رعایا بنانے کی ضرورت ہے صرف معاہدہ صلح کافی ہے جس کی بہت سی مثالیں اسلام میں موجود ہیں، لیکن جب کوئی قوم خود اسلام کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اس کو مٹا دینا چاہے تو اسلام کو مدافعت کے لئے تلوار ہاتھ میں لینا پڑتی ہے اور اس کو اپنے زیر اثر رکھنا پڑتا ہے، خیبر اس قاعدہ کے موافق اسلام کا پہلا مفتوحہ ملک تھا۔

غزوات کے خاتمہ کے بعد یہ بحث بہ تفصیل آئے گی کہ ایک مدت تک لوگ جہاد کو عرب کے قدیم طریقے کے موافق معاش کا ذریعہ سمجھتے رہے، اس لڑائی (خیبر) تک بھی یہ غلط فہمی رہی۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں یہ پردہ اٹھا دیا گیا اور اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اس لڑائی میں صرف وہ لوگ شریک ہوں جن کا مقصد محض جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔

غرض آپ غطفان اور یہود کے حملہ کی مدافعت کے لئے مدینہ سے محرم ۷ھ میں حضرت سباع بن عرفطہ غفاریؓ کو مدینہ کا افسر مقرر کر کے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ازواجِ مطہراتؓ میں سے حضرت اُمِّ سلمہؓ ساتھ تھیں۔ فوج کی تعداد سولہ سو تھی جن میں ۲۰۰ سوار اور باقی پیدل تھے، اس وقت تک لڑائیوں میں علم کا رواج نہ تھا، چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہوتی تھیں۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ آپ نے تین علم تیار کرائے۔ دو حضرت حباب بن منذر اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو عنایت ہوئے اور خاص علمِ نبوی جس کا پھریرا حضرت عائشہؓ کی چادر سے تیار ہوا تھا، جنابِ امیرؓ کو مرحمت ہوا۔ فوج جب روانہ ہوئی تو حضرت عامرؓ بن الاکوع (جو مشہور شاعر تھے یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے چلے۔

اللهم لولا انت ما اهتدینا — اے خدا! اگر تو ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت نہ پاتے
ولا تصدقنا ولا صلینا — نہ خیرات کرتے اور نہ روزہ رکھتے۔

---

[1] یہاں لوگوں سے مراد منافقین ہیں، یہ لوگ غزوات میں محض غنیمت کے لالچ میں شریک ہوتے تھے، جہاں سخت مقابلہ پیش آنے اور مالِ غنیمت کے نہ ملنے کا گمان ہوتا وہاں غزوات کی شرکت سے کتراتے تھے، چنانچہ ان ہی وجوہ سے وہ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے اور اس پر سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی ناراضی ظاہر فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ آئندہ غنیمت والے غزوہ میں بھی وہ شریک نہ کئے جائیں، اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اعلان فرمایا کہ اس غزوہ میں بھی وہی شرکت کا ارادہ کریں جن کی غرض محض جہاد و اعلاء کلمۃ اللہ ہو، دنیاوی مال و متاع نہ ہو (زرقانی و ابن سعد باب غزوہ خیبر) [2] ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۷۷، میں جمادی الاولیٰ ۷ھ ہے جو بہ تحقیق مذکورہ بالا صحیح نہیں۔

فاغفر فداء لك ما اتقينا — ہم تجھ پر فدا ہوں، ہم جو احکام نہیں بجا لاتے
والقين سكينة علينا — ان کو معاف کر دے اور ہم پر تسلی نازل کر
انا اذا صيح بنا اتينا — ہم جب فریاد میں پکارے جاتے ہیں تو پہنچ
وثبت الاقدام ان لاقينا — جاتے ہیں اور جب مڈ بھیڑ ہو تو ہم کو ثابت قدم
وبالصياح عولوا علينا — رکھ لوگوں نے پکار کر ہم سے استغاثہ چاہا ہے۔

یہ اشعار صحیح (مسلم و بخاری) میں نقل کئے ہیں، مسند ابن حنبل میں بعض اشعار زیادہ ہیں (پہلے دو مصرع کسی قدر اختلاف کے ساتھ صحیح مسلم (خیبر) میں بھی ہیں۔

ان الذين قد بغوا علينا — جن لوگوں نے ہم پر دست درازی کی ہے جب
اذا ارادوا فتنة ابينا — وہ کوئی فتنہ برپا کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان سے
ونحن عن فضلك ما استغنينا — دبتے نہیں اور اے خدا ہم تیری عنایت سے بے نیاز نہیں۔

راہ میں ایک میدان آیا، صحابہؓ نے تکبیر کے نعرے بلند کئے، چونکہ تعلیم و تلقین کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا اور بات بات میں نکات شریعت کی تعلیم ہوتی رہتی تھی، ارشاد ہوا کہ آہستہ، کیونکہ تم کسی بہرے اور دور دراز شخص کو نہیں پکار رہے ہو، تم جس کو پکارتے ہو وہ تمہارے پاس ہی ہے۔

اس غزوہ میں چند خاتونیں بھی اپنی خواہش سے فوج کے ساتھ ہو لی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے ان کو بلا بھیجا اور غضب کے لہجہ میں فرمایا، تم کس کے ساتھ آئیں اور کس کے حکم سے آئیں؟ بولیں کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اس لئے آئے ہیں کہ چرخہ کات کر کچھ پیدا کریں گے اور اس کام میں مدد دیں گے، ہمارے پاس زخمیوں کے لئے دوائیں بھی ہیں اس کے علاوہ ہم تیر اٹھا کر لائیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح کے بعد جب مال غنیمت تقسیم کیا تو ان کا بھی حصہ لگایا، لیکن یہ حصہ کیا تھا؟ زر و جواہر نہ تھے مال و اسباب نہ تھا، درہم و دینار نہ تھے، بلکہ صرف کھجوریں تھیں، تمام مجاہدین کو یہی ملا تھا اور ان پردہ نشینوں نے بھی یہی پایا تھا۔

یہ واقعہ ابوداؤد (باب فی المرأة والعبد يحذيان من الغنيمة) میں مذکور ہے، حدیث اور سیرت کی تمام کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر غزوات میں مستورات ساتھ رہتی تھیں جو زخمیوں کو مرہم پٹی کرتی اور پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں، جنگ اُحد میں حضرت عائشہؓ کا مشک میں پانی بھر بھر کر لانا اور زخمیوں کو پلانا اوپر گزر چکا ہے، لیکن یہ امر کہ عورتیں میدان جنگ سے تیر اٹھا اٹھا کر بھی لاتیں اور مجاہدین کو دیتی تھیں، صرف ابوداؤد نے ذکر کیا ہے لیکن سند صحیح متصل سے ذکر کیا ہے، اس لئے شک کی گنجائش نہیں، یوں بھی عرب کی مستورات سے کم سے کم یہی توقع کی جا سکتی ہے۔

---

[1] ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ تعدی اور حملہ کی ابتدا دشمنوں کی طرف سے تھی، اشعار کے بعض بعض الفاظ میں روایات کا اختلاف ہے [2] صحیح بخاری غزوہ خیبر۔

چونکہ معلوم تھا کہ غطفان اہل خیبر کی مدد کو آئیں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام رجیع میں فوجیں اتاریں جو غطفان اور خیبر کے بیچ میں ہے، اسباب بار برداری، خیمہ و خرگاہ اور مستورات یہاں چھوڑ دی گئیں[1]، اور فوجیں خیبر کی طرف بڑھیں، غطفان یہ سن کر کہ اسلامی فوجیں خیبر کی طرف بڑھ رہی ہیں، ہتھیار سج کر نکلے، لیکن آگے بڑھ کر جب ان کو معلوم ہوا کہ خود ان کا گھر خطرہ میں ہے تو واپس چلے گئے۔

خیبر میں چھ قلعے تھے، سالم، قموص، نطاۃ، قصارۃ، شق، مربط، اور جیسا کہ یعقوبی نے تصریح کی ہے، ان میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے، ان سب میں قموص نہایت مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا، مرحب عرب کا مشہور پہلوان جو ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا اسی قلعہ کا رئیس تھا، ابن ابی الحقیق کا خاندان جس نے مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر کی ریاست حاصل کر لی تھی یہیں رہتا تھا۔

لشکر اسلام جب خیبر کے قریب یعنی مقام صہبا میں پہنچا تو نماز عصر کا وقت آچکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ٹھہر کر نماز عصر ادا کی، پھر کھانا طلب فرمایا، رسد کا ذخیرہ صرف ستو تھا، وہی آپ نے بھی پانی میں گھول کر نوش فرمایا، رات ہوتے ہوتے فوج اسلام خیبر کے سواد میں پہنچ گئی، عمارتیں نظر آئیں تو آپ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ ٹھہر جاؤ، پھر خدا کا نام لے کر یہ دعا مانگی۔

انا نسئلك خير هذه القرية وخير اهلها وخير ما فيها ونعوذ بك من شرها وشر اهلها وشر ما فيها (ابن ہشام) — اے خدا! ہم تجھ سے اس گاؤں کی اور گاؤں والوں کی اور گاؤں کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ آپ کا معمول عام تھا، یعنی جب کسی مقام میں داخل ہوتے تھے تو پہلے یہ دعا مانگ لیتے تھے، چونکہ سنت نبویؐ یہ تھی کہ رات کو کسی مقام پر حملہ نہیں کیا جاتا تھا اس لئے رات یہیں بسر کی، صبح کو خیبر میں داخلہ ہوا، یہودیوں نے مستورات کو ایک محفوظ مقام میں پہنچا دیا، رسد اور غلہ قلعہ ناعم میں یکجا کیا اور فوجیں قلعہ نطاۃ اور قموص میں فراہم کیں، سلام بن مشکم بیمار تھا، تاہم اس نے سب سے زیادہ حصہ لیا اور خود قلعہ نطاۃ میں آکر فوج میں شرکت کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود جنگ نہ تھا، لیکن جب یہود نے بڑے سرو سامان کے ساتھ جنگ کی تیاری کی تو آپ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے وعظ فرمایا اور جہاد کی ترغیب دی۔ تاریخ خمیس میں اس موقع پر لکھا ہے:۔

ولما تيقن النبي صلى الله عليه وسلم ان اليهود تحاربه وعظ اصحابه ونصحهم وحرضهم على الجهاد — اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین ہو گیا کہ یہود لڑنے پر آمادہ ہیں تو آپ نے صحابہ کو نصیحت کی اور جہاد کی ترغیب دی۔

سب سے پہلے قلعہ ناعم پر فوجیں بڑھیں، حضرت محمودؓ بن مسلمہ نے بڑی دلیری سے حملہ کیا اور دیر تک لڑتے رہے، لیکن چونکہ سخت گرمی تھی، تھک کر دم لینے کے لئے قلعہ کی دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے، کنانہ بن الربیع نے

---

[1] یہ تفصیل معجم البلدان (ج ۴ ص ۲۲۹) ذکر رجیع میں ہے [2] طبری (ج ۲ ص ۱۵۷۵) اصل عبارت یہ ہے فبلغني ان غطفان لما سمعت بمنزل رسول الله صلى الله عليه وسلم خيبر جمعوا له ثم خرجوا ليظاهروا يهود عليه حتى اذا ساروا الخ [3] تاریخ یعقوبی (ج ۲ ص ۵۶) [4] صحیح بخاری۔

قلعہ کی فصیل سے چکی کا پاٹ اُن کے سر پر گرایا جس کے صدمہ سے وفات پائی۔ لیکن قلعہ بہت جلد فتح ہو گیا۔

ناعم کے بعد اور قلعے بہ آسانی فتح ہوتے گئے لیکن قلعہ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا۔ اس مہم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو بھیجا لیکن دونوں ناکام واپس آئے۔ طبری میں روایت ہے کہ جب خیبری قلعہ سے نکلے تو حضرت عمرؓ کے پاؤں نہ جم سکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے نامردی کی، لیکن فوج نے اُن کی نسبت خود یہی شکایت کی۔

اس روایت کو طبری نے جس سلسلہ سند سے نقل کیا ہے اس کے راوی عوف ہیں، ان کو بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے۔ لیکن بندار جب اُن کی روایت بیان کرتے ہیں تو کہتے تھے کہ وہ رافضی اور شیطان تھا۔ یہ لفظ بہت سخت ہے لیکن ان کی شیعیت سب کو تسلیم ہے اور گو شیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت میں حضرت عمرؓ کے بھاگنے کا واقعہ بیان کیا جائے شیعہ کی زبان سے اس روایت کا رتبہ کیا رہ جاتا ہے؟ اس کے علاوہ اوپر کے راوی عبداللہ بن بریدہ ہیں جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، لیکن محدثین کو اس بات میں شبہ ہے کہ اُن کی جو روایتیں باپ کے سلسلہ سے منقول ہیں صحیح بھی ہیں یا نہیں؟

تاہم اس قدر ضرور صحیح ہے کہ اس مہم پر پہلے اور بڑے بڑے صحابہ بھیجے گئے تھے لیکن فتح کا فخر کسی اور کی قسمت میں تھا۔ جب مہم میں زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن شام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر خدا فتح دے گا اور جو خدا اور خدا کے رسول کو چاہتا ہے اور خدا اور خدا کا رسول بھی اس کو چاہتے ہیں۔ یہ رات نہایت امید اور انتظار کی رات تھی۔ صحابہؓ نے تمام رات اس بے قراری میں کاٹی کہ دیکھئے یہ تاج فخر کس کے ہاتھ آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا پر کبھی حکومت اور سروری کی تمنا نہیں کی لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائل علی میں مذکور ہے، اُن کو خود اعتراف ہے کہ اس موقع کی تمنا میں ان کی خودداری بھی قائم نہ رہ سکی۔ صبح کو دفعتاً یہ آواز کانوں میں آئی کہ "علیؓ کہاں ہیں؟" یہ بالکل غیر متوقع آواز تھی کیونکہ جناب موصوف کی آنکھوں میں آشوب تھا اور سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگ سے معذور ہیں۔ غرض حسب طلب وہ حاضر ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا اور دعا فرمائی۔ جب اُن کو علم عنایت ہوا تو انھوں نے عرض کی کہ کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنا لیں، ارشاد ہوا کہ بہ نرمی ان پر اسلام کو پیش کرو۔ اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لائے تو سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ لیکن یہود اسلام یا صلح کے قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا باہر نکلا۔

قد علمت خیبر انی مرحب	خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، دلیر ہوں، تجربہ کار
شاکی السلاح بطل مجرب	ہوں، سلاح پوش ہوں۔

---

[1] ابن ہشام نے دو موقعوں پر اس واقعہ کا الگ تذکرہ لکھا ہے، یہ تفصیل خمیس سے لی گئی ہے [2] یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں [3] یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور صحیح بخاری میں منقول ہے۔

مرحب کے سر پر یمنی زرد رنگ کا مغفر اور اُس کے اوپر سنگی خود تھا۔ قدیم زمانہ میں گول پتھر بیچ سے خالی کر لیتے تھے یہی خود کہلاتا تھا مرحب کے جواب میں حضرت علیؓ نے یہ رجز پڑھا۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ	میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا تھا
کلیث غابات کریہ المنظرہ	میں شیر نیستاں کی طرح مہیب و بد منظر ہوں۔

مرحب بڑے طمطراق سے آیا لیکن حضرت علیؓ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اُتر آئی اور ضربت کی آواز فوج تک پہنچی۔[1] پہلوان کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا اس لئے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افواہیں پھیلا دیں۔ "معالم التنزیل" میں ہے کہ حضرت علیؓ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر روکا لیکن ذوالفقار خود اور سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی۔ مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا تو اتفاق سے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر گر پڑی۔ آپ نے قلعہ کا در جو سرتاپا پارۂ سنگ تھا اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا۔ اس واقعہ کے بعد ابو رافع نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اٹھانا چاہا تو جگہ سے بھی نہ ہل سکا۔ یہ روایتیں ابن اسحاق اور حاکم نے روایت کی ہیں لیکن بازاری قصے ہیں۔ علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں تصریح کی ہے کہ:

کلها واهیة	سب لغو روایتیں ہیں۔

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد فروخ کے حال میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ روایت منکر ہے۔ ابن ہشام نے جن سلسلوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں تو بیچ کے ایک راوی کا نام سرے سے چھوڑ دیا ہے اور دوسرے میں اس مشترک نقص کے ساتھ بریدہ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں جن کو امام بخاری اور ابو داؤد اور دار قطنی قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔[2]

ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے مارا تھا۔ مسند ابن حنبل اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے لیکن صحیح مسلم (اور حاکم ج ۳ ص ۳۹) میں حضرت علیؓ ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے اور یہی اصح الروایات ہے۔

غرض یہ قلعہ (قموص) ۲۰ دن کے محاصرہ کے بعد فتح ہو گیا۔ ان معرکوں میں ۹۳ یہود مارے گئے۔ جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر، عامر زیادہ مشہور ہیں، صحابہؓ میں سے ۱۵ بزرگوں نے شہادت حاصل کی جن کے نام ابن سعد نے بہ تفصیل لکھے ہیں۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضے میں رہنے دی جائے، ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کریں گے۔ یہ درخواست منظور ہوئی۔ بٹائی کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجتے تھے وہ غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہود سے کہتے تھے کہ اس میں سے جو حصہ چاہو

---

[1] طبری صفحہ ۱۵۸۰، یہ اشعار اور مختصر واقعات صحیح مسلم غزوۂ خیبر میں بھی ہیں۔

[2] میزان الاعتدال ترجمہ بریدہ بن سفیان۔

لے تو یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے تھے کہ زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں[1]۔ خیبر کی زمین تمام مجاہدین پر جو اس جنگ میں شریک تھے تقسیم کر دی گئی۔ اسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خمس بھی تھا۔

عام روایت ہے کہ مال غنیمت میں سے خمس کے علاوہ ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص طور پر کر لیا جاتا تھا جس کو صفی کہتے ہیں۔ اس بنا پر حضرت صفیہؓ (زوجہ کنانہ بن الربیع) کو آپؐ نے لے لیا اور آزاد کر کے اُن سے نکاح کر لیا

حضرت صفیہؓ کے واقعہ کی تحقیق

حضرت صفیہؓ کی نسبت بعض کتب حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ان کو دحیہ کلبیؓ کو دیا تھا، پھر کسی نے اُن کے حسن کی تعریف کی تو اُن سے مانگ لیا اور اس کے معاوضہ میں ان کو سات لونڈیاں دیں۔ مخالفین نے اس روایت کو نہایت بدنما پیرایہ میں ادا کیا ہے اور جب اصل روایت میں اتنی بات موجود ہے تو ظاہر ہے کہ مخالف اس سے کہاں تک کام لے سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ حضرت صفیہؓ کا یہ واقعہ حضرت انسؓ سے منقول ہے لیکن خود حضرت انسؓ سے متعدد روایتیں ہیں اور وہ باہم مختلف ہیں۔ بخاری کی جو روایت غزوۂ خیبر کے ذکر میں ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ جب قلعۂ خیبر فتح ہوا تو لوگوں نے آپؐ کے سامنے حضرت صفیہؓ کے حسن کا ذکر کیا، آپؐ نے اُن کو اپنے لئے لے لیا۔ اصلی الفاظ یہ ہیں۔

فلما فتح اللہ علیہ الحصن ذکر لہ جمال صفیۃ بنت حیی بن اخطب وقد قتل زوجہا وکانت عروسا فاصطفاہا النبی صلی اللہ علیہ وسلم لنفسہ	جب خدا نے قلعہ فتح کرا دیا تو لوگوں نے آپؐ سے صفیہ بنت حیی کے حسن و جمال کی تعریف کی، اُن کا شوہر اس جنگ میں مارا گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے لئے پسند کر لیا۔

لیکن بخاری کتاب الصلوٰۃ (باب ما یذکر فی الفخذ) (وصحیح مسلم باب فضل عتق الامۃ) میں خود حضرت انسؓ کی یہی روایت اس طریقہ سے منقول ہے کہ جب لڑائی کے بعد قیدی جمع کئے گئے تو حضرت دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان میں سے ایک لونڈی مجھ کو عنایت ہو، آپؐ نے ان کو اختیار دیا کہ خود جا کر کوئی لونڈی لے لو، انھوں نے حضرت صفیہؓ کو انتخاب کیا، لیکن لوگوں کو اعتراض ہوا۔ ایک شخص نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

یا نبی اللہ اعطیت دحیۃ صفیۃ بنت حیی سیدۃ قریظۃ والنضیر لا تصلح الا لک	اے پیغمبر خدا! آپؐ نے صفیہ کو دحیہ کے حوالہ کیا وہ قریظہ اور نضیر کی رئیسہ ہے اور آپؐ کے سوا اور کوئی اس کے لائق نہیں۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ ابوداؤد[3] میں یہ دونوں روایتیں ہیں

---

[1] فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۶) فتح خیبر وطبری ص ۱۵۸۹ (اصل روایت ابوداؤد باب المساقات میں موجود ہے [2] صحیح مسلم جلد اصفحہ ۲۰۵ باب فضل عتق الامۃ ثم تتزوج بہا۔ [3] ابوداؤد باب ما جاء فی سہم الصفی۔

اور دونوں حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ ابوداؤد کی شرح میں مازری (مشہور محدث) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہؓ کو اس لئے حضرت دحیہؓ سے لے کر ان سے عقد کیا کہ:

لما فیہ من انتہاکہا مع مرتبتہا وکونہا بنت سید ھم	چونکہ وہ عالی رتبہ اور رئیس یہود کی صاحبزادی تھیں اس لئے ان کا کسی اور کے پاس جانا اُن کی توہین تھی۔

حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں اس کے قریب قریب لکھا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہؓ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں، ان کا شوہر بھی قبیلۂ نضیر کا رئیس تھا۔ باپ اور شوہر دونوں قتل کئے جا چکے تھے، اس حالت میں اُن کے پاس خاطر، حفظ مراتب اور رفع غم کے لئے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے عقد میں لے لیں۔ وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی خاندانی عزت کے لحاظ سے اُن کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھایا (بلکہ مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپؐ نے ان کو اختیار دیا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائیں یا آپؐ کے نکاح میں آنا قبول کریں۔ انھوں نے دوسری صورت پسند کی یعنی یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آجائیں[1]) حسن خلق، رحم اور مصیبت زدہ کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی، اس قسم کے طرز عمل سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ورثہ کے ساتھ بھی کس قسم کا محسنانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتا ہے۔

غزوۂ بنی المصطلق میں حضرت جویریہؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور اس سلوک کا جو اثر ہوا وہ اوپر گزر چکا ہے۔

فتح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز خیبر میں قیام کیا۔ اگرچہ یہود کو کامل امن و امان دیا گیا، اور ان کے ساتھ ہر طرح کی مراعات کی گئی تاہم ان کا طرز عمل مفسدانہ اور باغیانہ رہا۔ پہلا دیباچہ یہ تھا کہ ایک دن زینب نے جو سلام بن مشکم کی بیوی اور مرحب کی بھاوج تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند صحابہ کے ساتھ دعوت کی۔ آپؐ نے فرط کرم سے قبول فرمایا۔ زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، آپؐ نے ایک لقمہ کھا کر ہاتھ کھینچ لیا، لیکن حضرت بشرؓ بن براء نے پیٹ بھر کر کھایا اور زہر کے اثر سے بالآخر ہلاک ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب کو بلا کر پوچھا، اس نے جرم کا اقبال کیا۔ یہود نے کہا۔ ہم نے اس لئے زہر دیا کہ اگر آپؐ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپؐ کے ہاتھ سے نجات مل جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے۔ اس بنا پر آپؐ نے زینب سے تعرض نہیں فرمایا لیکن جب دو تین دن کے بعد حضرت بشرؓ زہر کے اثر سے انتقال کر گئے تو وہ قصاص میں قتل کر دی گئی۔

ایک دفعہ صحابہ میں سے حضرت عبد اللہؓ بن سہل اور حضرت محیصہؓ قحط سالی کے زمانہ میں خیبر گئے، یہود نے حضرت عبد اللہؓ کو دھوکے سے قتل کر کے ایک نہر میں ڈال دیا۔ حضرت محیصہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۳۶ مصر۔ ن۔

خدمت میں آکر واقعہ بیان کیا، آپ نے فرمایا کہ تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے قتل کیا، عرض کیا کہ حضور وہ تو پچاس مسلمانوں کو قتل کر کے بھی جھوٹی قسم کھالیں گے، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تعرض نہیں کیا اور بیت المال سے مقتول کا خون بہا دلا دیا۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں یہود نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو سوتے میں کوٹھے پر سے گرا دیا کہ ان کا ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گیا۔ اس طرح ہمیشہ فساد انگیزیاں کرتے رہتے تھے۔ مجبور ہو کر حضرت عمرؓ نے ان کو شام کے اضلاع میں جلاوطن کر دیا (یہ جملہ معترضہ سلسلہ کلام میں آگیا تھا)

خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور وہ اکثر کتابوں میں منقول ہو کر مستند اول ہو گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اول آپ نے یہود کو اس شرط پر امن عام دیا تھا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں گے۔ لیکن جب کنانہ بن الربیع نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں حضرت زبیرؓ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی۔ بالآخر آپ نے کنانہ کو قتل کرا دیا اور تمام یہودی لونڈی غلام بنالئے گئے۔

اس روایت کا اس قدر حصہ صحیح ہے کہ کنانہ قتل کر دیا گیا، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ خزانہ بتلانے سے انکار کرتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا۔ طبری میں تصریح ہے۔

ثم دفعه رسول الله الی محمد بن مسلمة فضرب عنقه باخیه محمود بن مسلمة (ص ۱۵۸۲)

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کنانہ کو محمد بن مسلمہ کے حوالہ کیا انھوں نے اپنے بھائی محمود بن مسلمہ کے قصاص میں اس کو قتل کر دیا۔

باقی روایت کا یہ حال ہے کہ یہ روایت طبری اور ابن ہشام دونوں نے ابن اسحاق سے روایت کی ہے، لیکن ابن اسحاق نے اوپر کے کسی راوی کا نام نہیں بتایا۔ محدثین نے رجال کی کتابوں میں تصریح کی ہے کہ ابن اسحاق یہودیوں سے مغازی نبویؐ کے واقعات روایت کرتے تھے، اس روایت کو بھی انہی روایتوں میں سمجھنا چاہیئے اور یہی وجہ ہے کہ ابن اسحاق ان راویوں کا نام نہیں لیتے۔

کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لئے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے آگ جھاڑی جاتے۔ رحمۃ للعالمین کی شان اس سے بہت ارفع ہے۔ وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا، کیا چند سکوں کے لئے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے۔

اصل واقعہ اس قدر تھا کہ کنانہ بن ابی الحقیق کو اس شرط پر امان دی گئی تھی کہ کسی قسم کی بدعہدی اور خلاف بیانی نہ کرے گا (بلکہ ایک روایت میں ہے کہ) اس نے یہ بھی منظور کیا تھا کہ اگر اس کے خلاف اس نے کچھ کیا تو وہ قتل کا مستحق ہوگا۔

---

۱ فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۸) اور صحیح بخاری مطبوعہ مصطفائی جلد اول صفحہ ۳۰۷ (باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک) ۲ یہ پوری تفصیل تاریخ طبری میں مذکور ہے، ابن ہشام میں بھی اس کے قریب قریب ہے ۳ فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۴) ۴ ابوداؤد باب حکم ارض خیبر ۵ طبقات ابن سعد غزوہ خیبر ص سطر ۲۴۔

کنانہ نے بدعہدی کی اور جو امن اس کو دیا گیا تھا ٹوٹ گیا۔ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا۔ اب اس کے قصاص میں وہ قتل کر دیا گیا۔ جیسا کہ ابھی ہم نے طبری کی روایت سے نقل کیا ہے۔

اب دیکھو اس روایت میں کیا کیا واقعات اضافہ ہو گئے۔

(۱) قتل کا واقعہ کنانہ کے ساتھ خاص تھا، خزانہ کے چھپانے کا وہی مجرم تھا۔ محمود بن مسلمہ کو اسی نے قتل کیا تھا اس لئے وہی قتل بھی کیا جا سکتا تھا۔ اضافہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ابن سعد نے بکر بن عبدالرحمٰن سے جو روایت متصل نقل کی ہے۔ اس میں کنانہ کے ساتھ اس کے بھائی کا بھی نام بڑھا دیا ہے یعنی دونوں قتل کئے گئے۔

فضرب اعناقهما وسبی اهلیهما

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو قتل کرا دیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا۔

(۲) یہاں تک بھی خیریت تھی لیکن ابن سعد نے عفان بن مسلم سے جو روایت نقل کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی ہے۔ یعنی دونوں بھائیوں کے ساتھ تمام یہودی گرفتار اور لونڈی غلام بنالئے گئے۔

فلما وجد المال الذی غیبوه فی مسك الجمل سبی نساءهم۔

تو جب وہ خزانہ مل گیا جس کو انھوں نے اونٹ کی کھال میں چھپا رکھا تھا تو ان کی عورتیں گرفتار کیں اور لونڈیاں بنالیں۔

لیکن جب یہ روایتیں محدثانہ اصول تنقید سے جانچی جاتی ہیں تو چھلکے اترتے جاتے ہیں اور اصل حقیقت رہ جاتی ہے۔ یہود کا قتل اور زن و بچہ کا گرفتار ہونا ایک طرف خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ کنانہ کا بھائی تک قتل نہیں کیا گیا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت تک موجود تھا، صحیح بخاری میں ہے۔

فلما اجمع عمر علی ذلك اتاه احد بنی ابی الحقیق فقال یا امیر المؤمنین: تخرجنا وقد اقرنا محمد وعاملنا علی الاموال۔

پھر جب حضرت عمرؓ نے یہ ارادہ کر لیا تو ابو الحقیق کا ایک بیٹا ان کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المومنین آپ ہم کو نکالتے ہیں حالانکہ ہم کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنے دیا تھا اور خراج پر معاملہ کیا تھا۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ یہ وہی کنانہ بن ابی الحقیق کا بھائی تھا۔

حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں عام روایتوں کی وسعت کو گھٹا کر اس حد تک پہنچایا کہ:۔

ولم یقتل رسول الله صلی الله علیه وسلم بعد الصلح الا ابنی ابی الحقیق۔ (ذکر غزوہ خیبر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کے بعد ابن ابی الحقیق کے دونوں بیٹوں کے سوا اور کسی کو قتل نہیں کیا۔

لیکن حافظ موصوف کو اگر صحیح بخاری کی عبارت مذکورہ بالا پیش نظر ہوتی تو غالباً یہ تعداد اور بھی گھٹ جاتی۔ ابوداؤد میں جہاں ارض خیبر کا عنوان باندھا ہے۔ صرف ابن ابی الحقیق کا قتل کیا جانا لکھا ہے۔ یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ابوداؤد میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعیۃ (حیی بن اخطب کے چچا) سے پوچھا تھا کہ وہ

---

۱ طبقات ابن سعد غزوہ خیبر (صفحہ ۷۷ سطر ۲) ۲ طبقات ابن سعد غزوہ خیبر صفحہ ۸ ۳ صحیح بخاری ج ۱ مطبع مصطفائی صفحہ ۳۰۷۔ باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک۔

خزانہ کیا ہوا؟ اس نے کہا لڑائیوں میں صرف ہو گیا، باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف کنانہ کے قتل کا حکم دیا۔ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ کنانہ کا قتل محمود بن مسلمہ کے قصاص میں ہوا تھا، ورنہ اگر خزانہ کے چھپانے کا جرم قتل کا سبب ہوتا تو اس جرم کے مجرم اور بھی تھے۔

مورخین نے پہلی غلطی یہ کی کہ کنانہ کے قتل کا سبب اخفائے خزانہ سمجھے اور چونکہ اس جرم میں اور لوگ بھی شریک تھے اس لئے یہ تعمیم خود بخود پیدا ہو گئی کہ کنانہ کا تمام خاندان قتل کر دیا گیا۔

ایک اور نکتہ اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ خیبر کا واقعہ محرم میں پیش آیا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اس ارادہ سے مدینہ سے نکلے تو محرم کی اخیر تاریخیں تھیں، محرم میں لڑائی شرعاً ممنوع ہے اس لئے محدثین اور فقہا میں اس کی توجیہ کے متعلق اختلاف پیدا ہوا۔ بہت سے فقہاء کا یہ مذہب ہے کہ اوائل میں البتہ ان مہینوں میں لڑائی شرعاً ممنوع تھی لیکن پھر وہ حکم منسوخ ہو گیا۔ علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ حرمت کا پہلا حکم جو نازل ہوا تھا وہ اس آیت کی رُو سے تھا۔

قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (بقرہ ۲۷) — کہہ دو کہ اس مہینہ میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور خدا کی راہ سے روکنا ہے

پھر سورۂ مائدہ میں یہ آیت اتری۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ (مائدہ-۱) — مسلمانو! خدا کی حد بندیوں کی اور ماہِ حرام کی بے حرمتی نہ کرو۔

یہ پچھلی آیت پہلی آیت کے آٹھ برس بعد نازل ہوئی۔ اس وسیع زمانہ تک تو حرمت کا حکم باقی رہا۔ اب وہ کون سی آیت یا حدیث ہے جس سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

وَلَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا سُنَّةِ رَسُولِهٖ نَاسِخٌ لِحُكْمِهَا۔ — اور خدا کی کتاب اور حدیث میں ان آیتوں کے حکم کا کوئی ناسخ نہیں۔

مجوزین نے یہ استدلال کیا ہے کہ فتح حرم، طائف کا محاصرہ، بیعتِ رضوان، یہ سب ماہِ حرام میں ہوئے تھے اس لئے اگر ماہِ حرام میں لڑائی جائز نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کیونکر جائز رکھتے۔ حافظ ابن القیم نے جواب دیا ہے کہ ماہِ حرام میں ابتدءً جنگ کرنا حرام ہے لیکن اگر دشمن کا مدافعہ مقصود ہے تو بالاتفاق جائز ہے وہ سب واقعات دفاعی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش دستی نہیں کی تھی بلکہ دفاع کیا گیا تھا۔ بیعتِ رضوان اس لئے لی گئی تھی کہ یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ کفار نے حضرت عثمانؓ کو (جو سفیر ہو کر گئے تھے) قتل کر دیا۔ طائف کا محاصرہ کوئی مستقل جنگ نہ تھی بلکہ غزوۂ حنین کا بقیہ تھا جس میں خود کفار ہر طرف سے جمع ہو کر حملہ آور ہوئے تھے۔ فتحِ حرم کا واقعہ حدیبیہ کی شکست کا نتیجہ تھا جس کی ابتداء قریش نے کی تھی[1]۔

حافظ ابن القیم نے نہایت صحیح جواب دیا لیکن خاص خیبر کے معاملہ میں وہ اس گرہ کو نہ کھول سکے اور بحث نامفصل رہ گئی۔ حافظ ابن القیم کے استاد علامہ ابن تیمیہ کو بھی اس موقع پر اشتباہ ہوا، انہوں نے الجواب الصحیح لمن بدل

[1] زاد المعاد ذکر غزوۂ خیبر۔

دین المسیح میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر لڑائیاں کیں سب دفاعی تھیں، صرف بدر اور خیبر اس سے مستثنیٰ ہیں، لیکن اگر علامہ موصوف زیادہ استقصاء کرتے تو ثابت ہوتا کہ بدر اور خیبر بھی مستثنیٰ نہیں بدر کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔ خیبر کے ماسبق واقعات کو ترتیب دے کر دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ یہود اور غطفان مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

تقسیمِ زمین خیبر کی زمین دو برابر حصوں میں تقسیم کی گئی، نصف بیت المال، مہمانی اور سفارت وغیرہ کے مصارف کے لئے خاص کر لیا گیا، باقی نصف مجاہدین پر جو اس غزوہ میں شریک تھے، مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ کل فوج کی تعداد چودہ سو تھی، دو سو سوار تھے، سواروں کو گھوڑوں کے مصارف کے لئے پیدل سے دوگنا ملتا تھا، اس بناء پر یہ تعداد اٹھارہ سو کے برابر تھی، اس حساب سے کل جائداد کے اٹھارہ سو حصے کئے گئے اور ہر مجاہد کے حصہ میں ایک حصہ آیا۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عام مجاہدین کے برابر ایک ہی حصہ ملا[1]۔

ولرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل سہم واحد هم — اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی عام لوگوں کی طرح ایک حصہ تھا۔

ملکی حالت اور احکام فقہی خیبر کی فتح سے اسلام کی ملکی اور سیاسی حالت کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اسلام کے حقیقی دشمن صرف دو تھے، مشرکین اور یہود، اگرچہ مذہباً باہم مختلف تھے لیکن سیاسی اسباب کی بناء پر اُن میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا، مدینہ کے یہود عموماً انصار کے حلیف تھے، اسی طرح خیبر کے یہود غطفان کے حلیف تھے، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کے لئے مکہ اور مدینہ کے مشرکین اور منافقین سب مل کر کنفس واحدہ ہو گئے۔ خیبر کی فتح کے بعد یہود کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور مشرکین کا ایک بازو جاتا رہا۔

اب تک اسلام چاروں طرف سے نرغہ کی حالت میں تھا اس بناء پر بجز عقائد اور ضروری عبادت کے شریعت کے اور احکام کی تاسیس و تعلیم کا موقع نہ تھا۔ شریعت کے احکام جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہے حالات کے اقتضاء سے بتدریج آئے ہیں چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ خیبر کی فتح سے ادھر تو یہود کی فتنہ انگیزیوں سے نجات ملی اُدھر حدیبیہ کی صلح سے مشرکین کی طرف سے فی الجملہ اطمینان حاصل ہوا۔ اس بناء پر اب مسلمان جدید فقہی احکام کی تعمیل کے قابل ہو چکے تھے۔ اربابِ سیر نے غزوۂ خیبر کے تذکرہ میں عموماً ذکر کیا ہے کہ اس موقع پر متعدد جدید فقہی احکام نازل[2] ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تبلیغ کی۔ اُن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) پنجہ سے شکار کرنے والے پرند حرام ہوئے۔

(۲) درندہ جانور حرام کر دیئے گئے۔

(۳) گدھا اور خچر حرام کر دیا گیا۔

(۴) اب تک معمول تھا کہ لونڈیوں سے فوراً تمتع جائز سمجھا جاتا تھا۔ اب استبراء کی قید ہو گئی، یعنی اگر وہ حاملہ

[1] فتوح البلدان بلاذری، ذکر غزوۂ خیبر (ابوداؤد و حکم ارض خیبر میں ہے۔ النبی صلی اللہ علیہ وسلم معہم لہ سہم کسہم احدہم آ تح

[2] یہاں نزول سے وحی متلو یعنی قرآن مراد نہیں ہے۔

ہے تو وضع حمل تک ورنہ ایک مہینہ تک تمتع جائز نہیں۔

(۵) چاندی سونے کا بہ تفاضل خریدنا حرام ہوا۔

(۶) بعض روایتوں میں ہے کہ متعہ بھی اسی غزوہ میں حرام ہوا۔

وادی القریٰ اور فدک

تیما۔ اور خیبر کے درمیان ایک وادی ہے جس میں بہت سی بستیاں آباد ہیں اس کو وادی القریٰ کہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں عاد و ثمود یہاں آباد تھے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ عاد و ثمود کے آثارات اب بھی باقی ہیں۔ اسلام سے پہلے ان بستیوں میں یہود آ کر آباد ہوگئے اور زراعت اور آب رسانی کو بہت ترقی دی اور اب یہود کا مخصوص مرکز بن گیا تھا۔

خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی القریٰ کا رخ کیا لیکن لڑنا مقصود نہ تھا۔ مگر یہود پہلے سے تیار تھے، انھوں نے فوراً تیر اندازی شروع کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محمل آپ کے غلام (حضرت مدعم) اتار رہے تھے کہ ایک تیر آیا اور وہ جاں بحق ہوتے۔ عام مورخین نے یہود کی تیاری کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن امام بیہقی نے صاف تصریح کی ہے۔

وقد استقبلنا یهود بالرمی ولم نکن علی تصبیۃ[۳] — یہود ہمارے مقابلہ کو تیر چلاتے ہوئے نکلے اور ہم تیار نہ تھے۔

بہر حال جنگ شروع ہو گئی لیکن تھوڑے سے مقابلہ کے بعد یہود نے سپر ڈال دی اور خیبر کے شرائط کے موافق صلح ہو گئی۔

ادائے عمرہ

صلح حدیبیہ میں قریش سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگلے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں آ کر عمرہ ادا کریں گے اور تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں گے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال عمرہ ادا کرنا چاہا اور اعلان کرا دیا کہ جو لوگ واقعہ حدیبیہ میں شریک تھے ان میں سے کوئی رہ نہ جائے۔ چنانچہ بجز ان لوگوں کے جو اس اثنا میں مر چکے تھے، سب نے یہ سعادت حاصل کی۔ معاہدہ میں شرط تھی کہ مسلمان مکہ میں آئیں تو ہتھیار ساتھ نہ لائیں۔ اس لئے اسلحہ جنگ بطن یاجج میں جو مکہ سے آٹھ میل ادھر ہے چھوڑ دیئے گئے اور دو سو سواروں کا ایک دستہ اسلحہ کی حفاظت کے لئے متعین کر دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لبیک کہتے ہوئے حرم کی طرف بڑھے، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اونٹ کی مہار تھامے ہوئے آگے آگے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔[۴]

خلوا بنی الکفار عن سبیله	کافرو! سامنے سے ہٹ جاؤ!
الیوم نضربکم علی تنزیله	آج جو تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے
ضربا یزیل الهام عن مقیله	وہ وار جو سر کو خوابگاہ سر سے الگ کر دے
ویذهل الخلیل عن خلیله	اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلا دے۔

صحابہ کا ہجوم غفیر ساتھ تھا اور برسوں کی دیرینہ تمنا اور فرض مذہبی بڑے جوش کے ساتھ ادا کر رہا تھا

اہل مکہ کا

۱؎ معجم البلدان لفظ قریٰ ج ۷، ص ۳۰، س ۲؎ ۳؎ زرقانی بر مواہب بحوالہ بیہقی باب الجہاد ذکر غلول ج ۲ ص ۲۱۳
۴؎ یہ اشعار اور یہ واقعہ ترمذی نے شمائل میں نقل کیا ہے۔

خیال تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کی آب و ہوا نے کمزور کر دیا ہے، اس بنا پر آپ نے حکم دیا کہ لوگ طواف کے تین پہلے پھیروں میں اکڑتے ہوئے چلیں، عربی زبان میں اس کو رمل کہتے ہیں۔ چنانچہ آج تک یہ سنت باقی ہے۔

اہل مکہ نے اگرچہ چار و ناچار عمرہ کی اجازت دے دی تھی، تاہم ان کی آنکھیں اس منظر کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی تھیں۔ رؤسائے قریش نے عموماً شہر خالی کر دیا اور پہاڑوں پر چلے گئے۔ تین دن کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا، محمد سے کہہ دو کہ شرط پوری ہو چکی اب مکہ سے نکل جائیں۔ حضرت علیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، آپ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت حضرت حمزہؓ کی صغیر السن صاحبزادی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس "چچا چچا"[۱] کہتی دوڑی آئیں۔ حضرت علیؓ نے ہاتھوں میں اٹھا لیا، لیکن حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) اور زیدؓ بن حارثہ نے اپنے دعوے پیش کئے۔ حضرت جعفرؓ کہتے تھے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے۔ زیدؓ کہتے تھے کہ حمزہؓ میرے مذہبی بھائی تھے۔ اس رشتہ سے یہ میری بھتیجی ہے۔ حضرت علیؓ کو دعویٰ تھا کہ میری ہمشیرہ بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے دعوے مساوی الدرجہ دیکھ کر ان کو اسماء کی گود میں دیا، وہ امامہ کی خالہ تھیں، اور فرمایا کہ خالہ ماں کے برابر[۲] ہوتی ہے۔

٭

۱؎ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رشتہ میں ان کے بھائی تھے لیکن انھوں نے تعظیماً کہا اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت حمزہؓ دونوں رضاعی بھائی تھے۔ ۲؎ اس واقعہ کا بڑا حصہ صحیح بخاری سے ماخوذ ہے بعض زائد تفصیلیں زرقانی سے لی گئی ہیں جو کتب حدیث کے حوالہ سے زرقانی نے نقل کی ہیں۔

سنہ ۸ھ

غزوۂ مُوتہ

جمادی الاولیٰ ۸ھ

مُوتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے جو بلقاء سے اس طرف ہے، عرب میں جو مشرقی تلواریں مشہور ہیں وہ یہیں بنتی تھیں۔ کثیر مشہور شاعر کہتا ہے۔

صَوَارِمُ یجلوھا بِمُؤتَۃَ صَیْقَلُ   وہ تلواریں جن کو موتہ میں صیقل گر جلا دیتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ بُصریٰ یا قیصر روم کے نام ایک خط لکھا تھا۔ عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں جو عرب رؤسا حکمران تھے ان میں ایک شرحبیل بن عمرو بھی تھا جو اسی علاقہ بلقاء کا رئیس اور قیصر کا ماتحت تھا۔ یہ عربی خاندان ایک مدت سے عیسائی تھا اور شام کے سرحدی مقامات میں حکمران تھا۔ یہ خط حارث بن عمر لے کر گئے تھے شرحبیل نے ان کو قتل کر دیا۔ اس کے قصاص کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی۔ زیدؓ بن حارثہ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے، سپہ سالاری ملی اور ارشاد ہوا کہ اگر ان کو دولت شہادت نصیب ہو تو جعفر طیارؓ اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ فوج کے سردار ہوں۔ حضرت زیدؓ غلام تھے گو آزاد ہو چکے تھے، حضرت جعفر طیارؓ حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب خاص تھے، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ معزز انصاری اور مشہور شاعر تھے۔ اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضرت جعفرؓ و حضرت عبداللہ بن رواحہ کے ہوتے حضرت زیدؓ کو افسر کرنا کس بنا پر ہے؟ چنانچہ لوگوں میں چرچے ہوتے لیکن اسلام جس مساوات عام کے قائم کرنے کے لئے آیا تھا اس کے لئے اسی قسم کا ایثار درکار تھا۔ حضرت اسامہؓ کی مہم میں جس میں تمام مہاجرین کو شرکت کا حکم ہوا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی زیدؓ کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو فوج کا افسر مقرر کیا تھا۔ اس وقت بھی لوگوں میں چرچے ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو خطبہ دیا اور فرمایا کہ تم لوگوں نے اس کے باپ کی افسری پر بھی اعتراض کیا تھا حالانکہ یقیناً وہ افسری کے قابل تھے چنانچہ صحیح بخاری بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامۃ بن زید فی مرضہ الذی توفی فیہ (باب المغازی) میں بہ تفصیل یہ واقعہ منقول ہے۔ گو یہ مہم قصاص لینے کی غرض سے تھی لیکن چونکہ تمام مہمات کا اصلی محور تبلیغ اسلام تھا، ارشاد ہوا کہ پہلے ان کو دعوت اسلام دی جائے۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو جنگ کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی حکم

---

[1] معجم البلدان لفظ موتہ (ج ۸ صفحہ ۱۹۰)، [2] صحیح بخاری غزوۂ موتہ [3] فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۲۹۳۔ س
[4] طبقات ابن سعد ج ۲۔ مغازی صفحہ ۹۳ ج س

ہوا کہ اظہار ہمدردی کے لئے اس مقام پر جانا جہاں حارثؓ بن عمیر نے ادائے فرض میں جان دی ہے، ثنیۃ الوداع تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فوج کی مشایعت کے لئے تشریف لے گئے، صحابہؓ نے پکار کر دعا کی کہ خدا سلامت اور کامیاب لائے۔

فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو جاسوسوں نے شرحبیل کو خبر دی جس نے مقابلہ کے لئے کم و بیش ایک لاکھ فوج تیار کی۔ ادھر خود قیصر روم (ہرقل)، قبائل عرب کی بے شمار فوج لے کر مآب میں خیمہ زن ہوا جو بلقاء کے اضلاع میں ہے۔ حضرت زیدؓ نے یہ حالات سن کر چاہا کہ ان واقعات سے دربار رسالت کو اطلاع دی جائے اور حکم کا انتظار کیا جائے لیکن حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے کہا، ہمارا اصل مقصد فتح نہیں بلکہ دولت شہادت[1] ہے جو ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے۔

غرض یہ مختصر گروہ آگے بڑھا اور ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوا۔ حضرت زیدؓ برچھیاں کھا کر شہید ہوئے ان کے بعد حضرت جعفرؓ نے علم ہاتھ میں لیا۔ گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار ماری کہ اس کی کونچیں کٹ گئیں۔ پھر اس بے جگری سے لڑے کہ تلواروں سے چور ہو کر گر پڑے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمر کا بیان ہے کہ میں نے ان کی لاش دیکھی تھی۔ تلواروں اور برچھیوں کے ۹۰ زخم تھے لیکن سب کے سب سامنے کی جانب تھے پشت نے یہ داغ نہیں اٹھایا تھا۔ حضرت جعفرؓ کے بعد عبداللہؓ بن رواحہ نے علم ہاتھ میں لیا اور وہ بھی داد شجاعت دے کر شہید ہوئے۔

اب حضرت خالدؓ سردار بنے اور نہایت بہادری سے لڑے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں[2]۔ لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا کیا مقابلہ تھا۔ بڑی کامیابی یہی تھی کہ اپنی فوج کو دشمن کی زد سے بچا لائے۔ جب یہ شکست[3] خوردہ فوج مدینہ کے قریب پہنچی اور اہل شہر ان کی مشایعت کو

---

[1] ابن ہشام غزوہ موتہ س [2] صحیح بخاری [3] صحیح بخاری غزوۂ موتہ س [3] مصنف نے یہاں ابن اسحاق کی روایت پر اعتماد کر کے اس فوج کو شکست خوردہ لکھا ہے اور ان کی واپسی پر ان سب کو بلا امتیاز فراری ہونے کا مستحق ظاہر کیا ہے لیکن جیسا کہ صحیح بخاری غزوۂ موتہ میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے از روئے وحی فرمایا کہ پھر اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد سیف اللہ نے مسلمانوں کے علم کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا (فتح اللہ علیھم) ارباب سیر اور اہل روایت اور شراح حدیث اس غلبہ یا فتح کی تشریح میں مختلف ہیں۔ ایک فریق کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پوری فتح حاصل ہوئی۔ دوسرے کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ اور فتح یہ ہے کہ مسلمان اس قلت تعداد اور کفار اپنی کثرت کے باوجود تھک کر غیر منفصل جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کے مقابلہ سے ہٹ آئے۔ تیسرا فریق یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کو فتح کفار کے ایک خاص دستہ کے مقابلہ میں حاصل ہوئی اور اس سے مال غنیمت بھی حاصل کیا۔ چوتھا بیان یہ ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ یہ ہے کہ حضرت خالدؓ کی قیادت میں اتنے بڑے لشکر کے حملوں کو روک دیا اور بسلامت پیچھے ہٹ آئے۔ اس مقام پر فتح الباری، روض الانف سہیلی اور البدایہ ابن کثیر ملاحظہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح مسلمانوں کی جس فوج کو اپنے اوپر فراری

نکلے تو لوگ غم خواری کے بجائے ان کے چہروں پر خاک پھینکتے تھے کہ او فرار یو! تم خدا کی راہ سے بھاگ آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا۔ حضرت جعفرؓ سے آپ کو خاص محبت تھی ان کی شہادت کا نہایت قلق تھا۔ آپ مسجد میں جا کر غمزدہ بیٹھے۔ اسی حالت میں ایک شخص نے آکر کہا کہ جعفر کی مستورات رو رہی ہیں اور ماتم کر رہی ہیں۔ آپ نے منع کرا بھیجا۔ وہ گئے اور واپس آکر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آتیں۔ آپ نے دوبارہ بھیجا وہ پھر گئے اور واپس آکر عرض کی کہ ہم لوگوں کی نہیں چلتی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان کے منہ میں خاک بھر دو۔ یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے صحیح بخاری میں منقول ہے صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس شخص سے کہا کہ خدا کی قسم! تم یہ نہ کرو گے (منہ میں خاک ڈالنا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف سے نجات نہ ملے گی۔

✱

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہونے کا گمان تھا یا مسلمانوں نے ان کو فراری کہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی کہ نہیں تم فراری نہیں بلکہ پھر دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو، اس کی مخاطب پوری اسلامی فوج نہیں بلکہ ان کی فوج کا ایک خاص دستہ تھا جو جلدی کر کے پہلے مدینہ چلا آیا تھا تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری و روض الانف سہیلی والبدایہ ابن کثیر باب غزوۂ موتہ۔

فتح مکہ

رمضان ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا

جانشین ابراہیم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کا سب سے مقدم فرض، توحیدِ خالص کا احیاء اور حرم کعبہ کا آلائش سے پاک کرنا تھا لیکن قریش کے پے در پے حملوں اور عرب کی مخالفتِ عام نے پورے اکیس برس تک اس فرض کو روک رکھا، صلح حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ چند روز کے لئے امن و امان قائم ہو گیا اور دلدادگانِ حرم ایک دفعہ یادگارِ ابراہیمی کو غلط انداز نظر سے دیکھ آئے لیکن معاہدہ حدیبیہ بھی قریش سے نہ نبھ سکا، حلم و عفو و تحمل کی حد ہو چکی۔ اب وقت آگیا کہ آفتابِ حق حجابہائے حائل کو چاک کر کے باہر نکل آئے۔

صلح حدیبیہ کی بنا پر قبائلِ عرب میں خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف بنو بکر نے قریش سے مخالفت کا معاہدہ کر لیا تھا۔ ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں چلی آتی تھیں اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں اور اب تک رکی رہیں، کیونکہ قریش اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلہ میں صرف ہو رہا تھا۔ صلح حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کیا تو بنو بکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آگیا۔ دفعتاً وہ خزاعہ پر حملہ آور ہوئے اور روسائے قریش نے علانیہ ان کو مدد دی۔ عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتوں کو صورتیں بدل کر بنو بکر کے ساتھ تلواریں چلائیں خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی۔ بنو بکر رک گئے کہ حرم کا احترام ضرور ہے لیکن ان کے رئیس اعظم نوفل نے کہا یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آسکتا۔ غرض عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ دفعتاً یہ صدا بلند ہوئی۔

لاھُمَّ انی ناشدٌ محمدا	اے خدا! میں محمد کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور
حلفَ ابینا وابیہ الاتلدا	ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے۔ اے پیغمبر خدا ہماری اعانت کر
فانصر رسول اللہ نصرًا اعتدا	اور خدا کے بندوں کو بلا سب اعانت کے لئے حاضر ہوں گے۔
وادعُ عبادَ اللہ یاتوا مددا	

معلوم ہوا کہ خزاعہ کے چالیس ناقہ سوار جن کا پیش رو عمرو بن سالم ہے، فریاد لے کر آئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات سنے تو آپ کو سخت رنج ہوا۔ تاہم آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے۔

لہ طبری صفحہ ۱۶۲۰ (ج ۳) (ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۹۹ میں کچھ اور نام بھی ہیں) ص ۲ لہ طبقات ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۹۶ ص۔

(۱) مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔

(۲) قریش، بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

(۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قرطہ بن عمر نے قریش کی زبان سے کہا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے۔ لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی۔ انھوں نے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی تجدید کرا لائیں۔ ابوسفیان نے مدینہ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست کی۔ بارگاہِ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا۔ ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بیچ میں ڈالنا چاہا لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ ہر طرف سے مجبور ہو کر جناب فاطمہ زہراؓ کے پاس آیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ پانچ برس کے بچے تھے۔ ابوسفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا "اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا"۔ جناب سیدہؓ نے فرمایا "بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل؟" بالآخر ابوسفیان نے حضرت علیؓ کے ایماء سے مسجد نبوی میں اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔[1]

ابوسفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں، نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی تیاریاں کیں۔ اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں۔ احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ ایک معزز صحابی تھے۔ انھوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی۔ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت ابو مرثدؓ غنوی کو بھیجا کہ قاصد سے خط چھین لائیں۔ خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو تمام لوگوں کو حاطب کے افشائے راز پر حیرت ہوئی۔ حضرت عمرؓ بے تاب ہو گئے اور عرض کی کہ حکم ہو تو ان کی گردن اڑا دوں؟ لیکن جبینِ رحمت پر شکن نہ تھی۔ ارشاد ہوا "عمرؓ! تم کو کیا معلوم ہے کہ خدا نے اہل بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہو کہ تم سے مواخذہ نہیں ہے۔"

حضرت حاطبؓ کے عزیز و اقارب اب تک مکہ میں تھے اور ان کا کوئی حامی نہ تھا اس لئے انھوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں ان کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہی عذر پیش کیا اور آپ نے قبول فرمایا۔

غرض ۱۰ رمضان ۸ھ کو کوکبۂ نبویؐ نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا۔ دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں۔ قبائل عرب راہ میں آکر ملتے جاتے تھے۔ مرّ الظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دور دور

[1] زرقانی (ج ۲ ص ۳۳۶) نے یہ واقعہ مغازی ابن عائذ سے نقل کیا ہے تعجب ہے کہ اور مورخین اور ارباب سیر ایسے ضروری واقعہ کو قلم انداز کر گئے۔ (۲؎ زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۳۳۷) "ش" (۳؎ زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۳۳۹) "ش"

تک پھیل گئیں۔ یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام صحرا وادی ایمن بن گیا۔ فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ تحقیق کے لئے انھوں نے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) ابوسفیان اور بدیل بن ورقا کو بھیجا۔ خیمۂ نبوی کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا اس نے ابوسفیان کو دیکھ لیا۔ حضرت عمرؓ جذبۂ انتقام کو ضبط نہ کر سکے۔ تیز قدمی سے آگے بڑھے اور بارگاہِ رسالت میں آکر عرض کی کہ کفر کے استیصال کا وقت آ گیا۔ لیکن حضرت عباسؓ نے جان بخشی کی درخواست کی۔ حضرت عمرؓ نے دوبارہ عرض کیا۔ حضرت عباسؓ نے کہا "عمرؓ! اگر یہ شخص تمہارے قبیلہ کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر سخت دلی نہ کرتے"۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ "آپ یہ نہ فرمائیں، آپ جس دن ایمان لائے تھے مجھ کو جو مسرت ہوئی تھی خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی۔"[1]

ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی دعوے دار تھی۔ اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائل عرب کا اشتعال، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خفیہ قتل کرانے کی سازش ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی، لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفو نبویؐ) تھی، اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ خوف کا مقام نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے ساتھ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن طبری وغیرہ میں اس اجمال کی تفصیل میں حسبِ ذیل مکالمہ لکھا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) — کیوں ابوسفیان! کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟

ابوسفیان — کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) — کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں؟

ابوسفیان — اس میں تو ذرا شبہ ہے۔

بہرحال ابوسفیان نے اسلام کا اظہار کیا اور اس وقت گو اُن کا ایمان متزلزل تھا، لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ پکے مسلمان بن گئے۔ چنانچہ غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی۔

لشکرِ اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواجِ الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھیں۔ کچھ دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا۔ قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں۔ سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا، پھر جہینہ، سعد بن ہُذیم، سلیم، ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے۔ ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو کر

[1] اصل واقعہ صحیح بخاری میں کافی تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن مزید تفصیل اور جزئیات حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں موسیٰ بن عقبہ اور ابن عائذ وغیرہ سے نقل کئے ہیں میں نے ان کو بھی لے لیا ہے۔ بعض واقعات طبری سے ماخوذ ہیں۔ تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۶۳۲ "ش"

جلتے تھے، سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس سروسامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہوگئیں، ابوسفیان نے متحیر ہوکر پوچھا یہ کون لشکر ہے، حضرت عباسؓ نے نام بتایا۔ دفعۃً سردارِ فوج حضرت سعدؓ بن عبادہ ہاتھ میں علم لئے ہوئے برابر سے گزرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے۔

الیوم یوم الملحمۃ الیوم تستحل الکعبۃ۔ — آج گھمسان کا دن ہے آج کعبہ حلال کردیا جائے گا۔

سب سے اخیر کوکبۂ نبوی نمایاں ہوا جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا، حضرت زبیرؓ بن العوام علم بردار تھے، ابوسفیان کی نظر جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ حضور نے سنا، سعد بن عبادہ کیا کہتے گئے ہیں، ارشاد ہوا کہ سعد بن عبادہ نے غلط کہا آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا علم سعد بن عبادہ سے لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا جائے۔ مکہ پہنچ کر آپ نے حکم دیا کہ علم نبوی مقام حجون پر نصب کیا جائے۔ حضرت خالدؓ کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں۔[1]

اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے ہاں پناہ لے گا یا دروازہ بند کرلے گا یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا، اس کو امن دیا جائے گا۔ تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا اور خالدؓ کی فوج پر تیر برسائے، چنانچہ تین صاحب (یعنی حضرت کرز بن جابر فہری اور حضرت حبیش بن اشعر اور حضرت سلمہ بن المیلاء) نے شہادت پائی۔[2] حضرت خالدؓ نے مجبور ہوکر حملہ کیا۔ یہ لوگ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلواروں کا چمکنا دیکھا تو حضرت خالدؓ سے باز پرس کی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ابتداء مخالفین نے کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قضائے الٰہی یہی تھی۔

لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضورؐ قیام کہاں فرمائیں گے؟ کیا اپنے قدیم مکان میں، شریعت میں مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا۔ ابوطالب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم) نے جب انتقال کیا تھا تو ان کے صاحبزادے عقیل اس وقت کافر تھے، اس لئے وہی وارث ہوئے، انہوں نے یہ مکانات ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عقیل نے گھر کہاں چھوڑا کہ اس میں اتروں، اس لئے مقام خیف میں ٹھہروں گا، (جہاں قریش نے ہمارے خلاف کفر کی تائید پر باہم عہد و پیمان کیا تھا)[3]

خدا کی شان، حرم محترم جو خلیل بت شکن کی یادگار تھا، اس کی آغوش میں ۳۶۰ بت جاگزین تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے۔

---

[1] یہ خاص صحیح بخاری کی روایت ہے۔ مصنف نے یہاں حضرت عروہؓ کی روایت لی ہے جو گو صحیح بخاری میں ہے مگر مرسل ہے، صحیح و مرفوع روایات جو صحیح بخاری میں ہیں ان کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ حضرت خالدؓ مکہ کے زیریں حصہ سے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بالائی حصہ سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے فتح الباری ج ۸ ص ۸۔

[2] ان کی شہادت کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے۔

[3] صحیح بخاری فتح مکہ میں حضرت اسامہؓ بن زید سے جو روایت ہے اس میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے یہ ارشاد فتح مکہ کے موقع پر کیا لیکن اس میں خیف کے قیام کا ذکر نہیں لیکن جو روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ یہ حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا اور اس میں خیف کی تصریح ہے ابن حجر نے یہ تطبیق کی ہے کہ ممکن ہے کہ دونوں موقعوں پر لوگوں کے سوال پر یہ ارشاد فرمایا ہو، فتح الباری ج ۸ ص ۱۳ و ج ۳ ص ۳۶۔ س ن

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ، اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔[1]

حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی۔

عین کعبہ کے اندر بہت سے بت تھے جن کو قریش خدا مانتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیئے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے اندر جاکر جس قدر تصویریں تھیں وہ بھی مٹادیں حرم ان آلائشوں سے پاک ہوچکا تو آپ نے عثمان بن طلحہ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے، کنجی طلب کی اور دروازہ کھلوا آپ حضرت بلالؓ اور طلحہؓ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے کعبہ کے اندر تکبیریں کہیں لیکن نماز نہیں ادا کی۔

خطبۂ فتح

شاہنشاہی اسلام کا یہ پہلا دربار عام تھا، خطبۂ سلطنت یعنی بارگاہ احدیت کی تقریر خلافت الٰہی کے منصب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کی جس کا خطاب صرف اہل مکہ سے نہیں بلکہ تمام عالم سے تھا

لا اله الا الله وحده لا شريك له صدق وعده ونصر عبده وهزم الاحزاب وحده الا كل مأثرة او دم او مال يدعى فهو تحت قدمى هاتين الا سدانة البيت وسقاية الحاج۔۔۔۔ يا معشر قريش ان الله قد اذهب عنكم نخوة الجاهلية وتعظمها بالآباء الناس من آدم وآدم من تراب۔

ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس نے اپنا وعدہ سچا کیا اس نے اپنے بندہ کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا ہاں تمام مفاخر تمام انتقامات خونہائے قدیم تمام خونبہا سب میرے قدموں کے نیچے ہیں، صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آبرسانی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔

پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (ابن ہشام مختصرا) اِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ (الحجرات۔ ۲۰ بخاری)

لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لے جاؤ، لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو، خدا دانا اور واقف کار ہے۔ خدا نے شراب کی خرید و فروخت حرام کردی۔

تمام عقائد اور اعمال کا اصل الاصول اور دعوت اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے، اس لئے سب سے پہلے اسی سے ابتدا کی گئی۔

خطبہ کے اصولی مطالب

عرب میں دستور تھا، کوئی شخص کسی کو قتل کردیتا تھا تو اس کے خون کا انتقام لینا خاندانی فرض قرار پاجاتا تھا۔ یعنی اگر اس وقت قاتل نہ ہاتھ آسکا تو خاندانی دفتر

---

[1] اس موقع پر اس پوری آیت کے پڑھنے کا ذکر ابن سعد فتح مکہ میں ہے۔ صحیح بخاری فتح مکہ میں الفاظ آئے ہیں جاء الحق وزھق الباطل وما یبدی الباطل وما یعید۔ یعنی حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور اب باطل پھر نہ آئے گا۔ س ن صحیح بخاری فتح مکہ۔

میں مقتول کا نام لکھا جاتا اور سینکڑوں برس گزرنے کے بعد بھی انتقام کا فرض ادا کیا جاتا تھا۔ قاتل اگر مر چکا ہے تو اس کے خاندان یا قبیلے کے آدمی کو قتل کرتے تھے۔ اسی طرح خون بہا کا مطالبہ بھی اَبًا عَنْ جَدٍّ چلا آتا تھا۔ یہ خون کا انتقام عرب میں سب سے بڑے فخر کی بات تھی۔ اس طرح اور بہت سی لغو باتیں مفاخر قومی میں داخل ہو گئی تھیں، اسلام ان سب کے مٹانے کے لئے آیا تھا اور اس بنا پر آپ نے (اس طریق) انتقام اور خون بہا اور نیز اور تمام غلط مفاخر کی نسبت فرمایا کہ میں نے ان کو پاؤں سے کچل دیا۔

عرب اور تمام دنیا میں نسل اور قوم و خاندان کے امتیاز کی بنا پر ہر قوم میں فرقِ مراتب قائم کئے گئے تھے جس طرح ہندوؤں نے چار ذاتیں قائم کیں اور شودر کو وہ درجہ دیا جو جانوروں کا درجہ ہے اور اس کے ساتھ یہ بندش کر دی کہ وہ کبھی اپنے رتبہ سے ایک ذرہ آگے نہ بڑھنے پائے۔ اسلام کا سب سے بڑا احسان جو اس نے تمام دنیا پر کیا، مساواتِ عام قائم کرنا تھا، یعنی عرب و عجم، شریف و رذیل، شاہ و گدا، سب برابر ہیں، ہر شخص ترقی کر کے ہر انتہائی درجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیت پڑھی اور پھر توضیح فرمائی کہ تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

خطبہ کے بعد آپؐ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے۔ ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیش رو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکرِ قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا، تم کو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں۔

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے پکار اٹھے کہ:-

اَخٌ کَرِیْمٌ وَابْنُ اَخٍ کَرِیْمٍ۔ — تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے

ارشاد ہوا۔

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔ — تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

کفارِ مکہ نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے لیکن آپؐ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنی مملوکات سے دستبردار ہو جائیں۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے بامِ کعبہ پر چڑھ کر اذان دی، وہی سرکش جو ابھی رام ہو چکے تھے ان کی آتشِ غیرت پھر مشتعل تھی۔ عتاب بن اسید نے کہا، خدا نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے

سننے سے پہلے اس کو دنیا سے اٹھا لیا۔ ایک اور سردار نے کہا، "اب جینا بے کار ہے"۔

مقامِ صفا میں آپؐ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں، عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ تھا کہ اُن سے ارکانِ اسلام اور محاسنِ اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا۔ پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دستِ مبارک ڈبو کر نکال لیتے تھے۔ آپؐ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

ان مستورات میں ہند بھی آئی، یہ وہی ہند ہے جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہؓ کی ماں تھی حضرت حمزہؓ کو اسی نے قتل کرایا تھا اور ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی۔ وہ نقاب پہن کر آئی۔ شریف عورتیں عموماً نقاب پہنتی تھیں لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اس کو پہچاننے نہ پائے۔ بیعت کے وقت اس نے (نہایت دلیری بلکہ گستاخی سے باتیں کیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔
ہند	یہ اقرار آپؐ نے مردوں سے تو نہیں لیا لیکن بہرحال ہم کو منظور ہے۔
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	چوری نہ کرنا۔
ہند	میں اپنے شوہر (ابوسفیان) کے مال میں سے دو چار آنے کبھی لے لیا کرتی ہوں، معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	اولاد کو قتل نہ کرنا
ہند	رَبَّیْنَاهُمْ صِغَارًا وَقَتَلْتَهُمْ كِبَارًا فَاَنْتَ وَهُمْ اَعْلَمُ ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا بڑے ہوئے تو جنگِ بدر میں آپؐ نے ان کو مار ڈالا، اب آپؐ اور وہ باہم سمجھ لیں۔

رؤسائے عرب میں دس شخص تھے جو قریش کے سرتاج تھے، ان میں صفوان بن امیہ جدہ بھاگ گئے۔ عمیر بن وہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ رئیس عرب مکہ سے جلا وطن ہوا جاتا ہے۔ آپؐ نے علامتِ امان کے طور پر اپنا عمامہ عنایت کیا۔ عمیر جدہ پہنچ کر ان کو واپس لائے۔ حنین کے معرکہ تک یہ اسلام نہیں لائے (بعد کو مسلمان ہو گئے)

عبداللہ بن زبعری عرب کے مشہور شاعر جو (پہلے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجویں کہا کرتے تھے اور قرآن مجید

---

۱ ابن ہشام (حضرت عتابؓ بعد کو مسلمان ہوتے) ج ۲ ۔ ۲ اصابہ تذکرہ عتاب بن اسید (ج ۲ ص ۴۵۱) ج ۲ ۔ ۳ طبری جلد ۳ ص ۱۶۴۲
۴ طبری ج ۳ ص ۴ منتشر ؟ ۔ ۵ جنگ بدر میں ہند کے لڑکے کافروں کے ساتھ شریک ہو کر لڑے اور لڑ کر مارے گئے تھے
۶ طبری ج ۳ ص ۱۶۴۱ ج ۔ ۷ اصابہ ذکر صفوان بن امیہ۔

پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، نجران بھاگ گئے۔ لیکن پھر آکر اسلام لائے۔

ابوجہل کے بیٹے عکرمہ یمن چلے گئے، لیکن ان کی حرم (ام حکیم) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امان لی اور جاکر یمن سے لائیں۔ یہ واقعہ ابوجہل سے کہنے کے قابل نہیں کہ اس کا جگر بند کفر کی گود سے نکل کر اسلام کے آغوش میں آگیا اور اب ہم اس کو حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں۔

اشتہاریان قتل

ارباب سیر کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گو اہل مکہ کو امن عطا کیا تھا تاہم دس شخصوں کی نسبت حکم دیا کہ جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں۔ ان میں سے بعض مثلاً عبد اللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ خونی مجرم تھے اور قصاص میں قتل کئے گئے۔ لیکن متعدد ایسے تھے کہ ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں ستایا کرتے تھے یا آپ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے، ان میں سے ایک عورت اس جرم میں قتل کی گئی کہ وہ آپ کے ہجو یہ اشعار گایا کرتی تھی۔

لیکن محدثانہ تنقید کی رو سے یہ بیان صحیح نہیں، اس جرم کا مجرم تو سارا مکہ تھا، کفار قریش میں سے دو چار کے سوا کون تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت سے سخت ایذائیں نہیں دیں۔ بایں ہمہ ان ہی لوگوں کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ انتم الطلقاء جن لوگوں کا قتل بیان کیا جاتا ہے وہ تو نسبۃً کم درجہ کے مجرم تھے۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ کی یہ روایت صحاح ستہ میں موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ خیبر میں جس یہودی عورت نے آپ کو زہر دیا اس کی نسبت لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ اس کے قتل کا حکم ہوگا۔ ارشاد ہوا کہ نہیں خیبر کے کفرستان میں ایک یہودیہ زہر دے کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے جانبر ہو سکتی ہے

(۱ ابن ہشام۔ ۲ طبری، ج ۲ صفحہ ۱۶۴۲ ۳ حافظ مغلطائی نے پندرہ نام مختلف حوالوں سے جمع کئے ہیں جو خود محدثین کے نزدیک غیر محتاط ہیں، عام ارباب سیرت نے دس شخصوں کے نام لئے ہیں، ابن اسحاق نے آٹھ نام گنائے ہیں، ابوداؤد اور دارقطنی کی روایت سے صرف چھ ہیں، بخاری میں صرف ابن خطل کا واقعہ مذکور ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ تحقیق کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔

عام روایت کی رُو سے جن دس شخصوں کی سزائے موت کا اعلان کیا گیا تھا ان کا حال یہ ہے کہ وہ شدید مجرم تھے۔ تاہم سات شخص خلوص سے ایمان لائے اور ان کو معافی دے دی گئی، صرف چار شخص قتل ہوئے تین مرد اور ایک عورت، عبد اللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، حویرث بن نقیر اور ابن خطل کی لونڈی قریبہ۔ ابن خطل اور ابن صبابہ دونوں خونی مجرم تھے، ابن خطل نے جو اسلام لاچکا تھا اپنے ایک مسلمان خادم کو قتل کرکے مرتد ہو گیا تھا، مقیس بن صبابہ کا واقعہ یہ ہے کہ اس کا ایک بھائی ایک انصاری کے ہاتھ سے غلطی سے مارا گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت ادا کرادی تھی، تاہم مقیس منافقانہ اسلام لایا اور غدر سے اس انصاری کو قتل کر دیا اور حویرث نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں کے ساتھ جب وہ ہجرت کر رہی تھیں شرارت کی تھی اور ان دونوں کو اونٹوں سے گرا دینا چاہا تھا، حضرت علیؓ بن ابی طالب نے اس کو قتل کر دیا۔ قریبہ، جو ابن خطل کی لونڈی تھی مکہ کی ایک مغنیہ تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں گیت گایا کرتی تھی

عہ دیکھو زرقانی اور ابن ہشام ذکر فتح مکہ۔

تو حرم میں اس سے کم درجہ کے مجرم عفو نبوی سے کیونکر محروم رہ سکتے ہیں۔

اگر درایت پر قناعت نہ کی جائے تو روایت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بالکل ناقابل اعتبار رہ جاتا ہے صحیح بخاری میں صرف ابن خطل کا قتل مذکور ہے۔ اور یہ عموماً مسلم ہے کہ وہ قصاص میں قتل کیا گیا مقیس کا قتل بھی شرعی قصاص تھا۔ باقی جن لوگوں کی نسبت حکم قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ کسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا کرتے تھے وہ روایتیں صرف ابن اسحاق تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں یعنی اصول حدیث کی رو سے وہ روایت منقطع ہے جو قابل اعتبار نہیں، ابن اسحاق کا فی نفسہ جو درجہ ہے وہ ہم کتاب کے دیباچہ میں لکھ آئے ہیں۔

سب سے زیادہ معتبر روایت جو اس بارہ پیش کی جاسکتی ہے وہ ابوداؤد کی روایت ہے جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ چار شخصوں کو کہیں امن نہیں دیا جاسکتا، لیکن ابوداؤد نے اس حدیث کو نقل کرکے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند جیسی چاہیئے مجھ کو نہیں ملی۔ پھر اس کے بعد ابن خطل کی روایت نقل کی ہے

۱ بخاری فتح مکہ۔ ۲ ابوداؤد باب قتل الاسیر۔ ۳ ابوداؤد نے باب قتل الاسیر میں اس معنی کی تین روایتیں درج کی ہیں، پہلی وہ روایت ہے جس کا ذکر مصنف نے اخیر میں کیا ہے، یہ روایت احمد بن المفضل اسباط بن نصر اسدی کبیر، مصعب بن سعد اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے، اس میں چار مرد اور دو عورتوں کے قتل کا حکم مذکور ہے، جن میں سے ایک ابن ابی سرح ہے جن کو حضرت عثمانؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے بغیر آپ کی خدمت میں لاکر پیش کیا اور اس کو کچھ دیر کے تامل کے بعد پناہ دی اور وہ مسلمان ہوا۔ اس روایت میں احمد بن مفضل اور اسباط بن نصر اور سدی کبیر تینوں پر علمائے رجال نے جرحیں کی ہیں اور خصوصاً اسباط ابن نصر پر اور زیادہ جرحیں ہیں، یہ روایت اسی سلسلہ سے نسائی نے باب قتل المرتدین میں اور حاکم نے مستدرک کی کتاب المغازی میں اس کو نقل کیا ہے۔ اس سلسلہ کے یہ تینوں راوی شیعہ ہیں اور حاکم نے مستدرک میں اس پہلو سے اپنا اظہار خیال کر دیا ہے، ابوداؤد کی دوسری روایت عمرو بن عثمان بن عبد الرحمن بن سعید مخزومی سے ہے کہ انہوں نے اپنے دادا سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار مردوں اور دو عورتوں کے بارہ میں فرمایا کہ ان کو پناہ نہیں دی جاسکتی۔ ان دو عورتوں میں سے جو دونوں مغنیہ لونڈیاں تھیں ایک مسلمان ہو گئی اور ایک قتل کی گئی۔ اس روایت کے متعلق ابوداؤد نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے شیخ ابو العلاء سے اس کی سند اچھی طرح سمجھی نہیں، یہی روایت اسی سلسلہ سے دارقطنی اواخر کتاب البیع میں ہے۔ اس میں سند کے آخر میں یوں ہے۔ عمرو بن عثمان نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے یہ روایت سنی، اس سے ظاہر ہے کہ سند کے اسی حصہ میں ابوداؤد کو شک ہے۔ ابوداؤد کی تیسری روایت میں صرف ابن خطل کے قتل کا ذکر ہے جو صحیح بخاری کی روایت سے بھی ثابت ہے۔ بیہقی نے حکم بن عبد الملک، قتادہ اور حضرت انسؓ بن مالک سے ایک روایت کی ہے جس میں تین مرد اور ایک عورت یعنی چار شخصوں کے قتل کا حکم ہے، تین مرد یہ ہیں، ابن خطل، مقیس بن صبابہ اور عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح اور عورت کا نام ام سارہ تھا۔ عبد اللہ بن سعد کے قتل کی ایک انصاری نے نذر مانی تھی مگر حضرت عثمانؓ کی سفارش سے ان کی جان بخشی ہوئی اور ام سارہ وہی عورت ہے جو فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کے مکہ پر حملہ کرنے کا خط خفیہ لے چلی تھی، اس روایت میں حکم بن عبد الملک مطلقاً ناقابل اعتبار ہے اور اس کی اس روایت کو عقیلی نے لکھا ہے کہ کوئی اس کے رفقاء میں سے کسی نے نہیں کی ہے۔ تہذیب ابن حجر ص۔

(اور شروع میں جو روایت ہے) اس کا ایک راوی احمد بن المفضل ہے جس کو ازدی نے منکر الحدیث لکھا ہے اور ایک راوی اسباط بن نصر ہے جس کی نسبت نسائی کا قول ہے کہ "قوی نہیں ہے"۔ اگرچہ صرف اس قدر جرح کسی روایت کے نامعتبر ہونے کے لئے کافی نہیں، لیکن واقعہ جس قدر اہم ہے اس کے لحاظ سے راوی کی اس قدر جرح بھی روایت کے مشکوک ہونے کے لئے کافی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض سردارانِ قریش جو مخالفینِ اسلام کے پیشرو تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر سن کر مکہ سے بھاگ گئے، لیکن یہ صرف ابن اسحاق کا قیاس ہے کہ وہ اس وجہ سے بھاگے تھے کہ ان کے قتل کا حکم دیا گیا تھا۔ ان اشتہاری مفرورین میں ابن اسحاق نے عکرمہ کو بھی شمار کیا ہے جو ابوجہل کے فرزند تھے۔ لیکن موطائے امام مالک میں جس کی نسبت امام شافعی کا قول ہے کہ آسمان کے نیچے (قرآن کے علاوہ) کوئی کتاب اس سے زیادہ صحیح نہیں یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"حارث بن ہشام کی صاحبزادی، ام حکیم، عکرمہ بن ابوجہل کی زوجہ تھیں، وہ فتح مکہ کے دن اسلام لائیں، لیکن ان کے شوہر عکرمہ بن ابوجہل اسلام سے بھاگ کر یمن چلے گئے، ام حکیم یمن گئیں اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئے اور مکہ میں آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی، پھر ان سے بیعت لی۔ (کتاب النکاح)

یہ بات بھی اس موقع پر خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جن لوگوں کو امن دیا جاتا تھا وہ اسلام پر مجبور نہیں کئے جاتے تھے۔ تمام مورخین اور اربابِ سیر نے تصریح کی ہے کہ حنین کی لڑائی میں جو فتح مکہ کے بعد پیش آئی لشکرِ اسلام میں مکہ کے بہت سے کفار بھی شامل تھے جو اس وقت تک کافر تھے اور شکست بھی زیادہ تر اسی وجہ سے ہوئی کہ پہلے حملہ میں انہی کافروں کے قدم اکھڑے اور اس ابتری کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم بھی نہ ٹھہر سکے۔

خزائنِ حرم

حرم میں نذور اور ہدایا کا خزانہ ایک مدت سے جمع ہوتا چلا آتا تھا وہ محفوظ رکھا گیا لیکن مجسمہ جات اور تصویریں برباد کر دی گئیں۔ ان میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مجسمے بھی تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی تھی[1] جس سے لوگوں نے قیاس کیا کہ کسی زمانہ میں عیسائیت کا اثر زیادہ غالب ہو گیا تھا۔ رنگین تصویریں جو دیواروں پر تھیں مٹانے پر بھی ان کے دھندلے نشان رہ گئے تھے اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر تک باقی رہے[2]۔

مکہ معظمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام پندرہ دن تک رہا، جب یہاں سے روانہ ہوئے تو حضرت معاذؓ بن جبل کو اس خدمت پر مقرر کرتے گئے کہ لوگوں کو اسلام کے مسائل اور احکام سکھائیں۔

فتح مکہ اور بت شکنی

فتح مکہ کا اصلی مقصد اشاعتِ توحید اور اعلاءِ کلمۃ اللہ تھا، کعبہ میں سینکڑوں بت تھے، جن میں ہبل بھی تھا جو بت پرستوں کا خدائے اعظم تھا۔ یہ انسان کی صورت کا تھا اور

[1] فتح الباری ذکر فتح مکہ۔ [2] فتح الباری ذکر فتح مکہ (اخبار مکہ ازرقی میں بہ تفصیل یہ واقعات مذکور ہیں)۔

یاقوتِ احمر سے بنا تھا سب سے پہلے جس نے اس کو کعبہ میں لاکر رکھا تھا خزیمہ بن مدرکہ تھا جو ... نضر کا پوتا اور عدنان کا پڑپوتا تھا۔ ہبل کے سامنے سات تیر رہتے تھے جن پر "لا" و "نعم" لکھا ہوا تھا، عرب جب کوئی ... کرنا چاہتے تھے تو ان تیروں پر قرعہ ڈالتے اور "ہاں" یا "ناں" جو کچھ نکلتا اس پر عمل کرتے تھے۔ جنگ احد میں ابوسفیان ... نے اسی ہبل کی جے پکاری تھی، وہ عین کعبہ کے اندر تھا، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے تو ... اور بتوں کے ساتھ وہ بھی برباد کر دیا گیا۔

مکہ کے اطراف میں اور بہت سے بڑے بڑے بت تھے جن کے لئے حج کی رسمیں ادا کی ... جاتی تھیں، ان میں سب سے بڑے لات، مناۃ اور عزیٰ تھے۔ عزیٰ قریش کا اور لات اہل طائف کا معبود تھا۔ ... مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر نخلہ ایک مقام ہے۔ عزیٰ یہیں منصوب تھا۔ بنو شیبان اس کے متولی تھے۔ اہل ... عرب کا اعتقاد تھا کہ خدا جاڑوں میں "لات" کے ہاں اور گرمیوں میں "عزیٰ" کے ہاں بسر کرتا ہے۔ عزیٰ کے سامنے عرب ... تمام مناسک اور رسوم بجالاتے تھے جو کعبہ میں بجالاتے تھے، اس کا طواف کرتے اور اس پر قربانیاں چڑھاتے[1]۔

مناۃ کا تخت گاہ مشلل تھا جو قدید کے پاس مدینہ منورہ سے سات میل ادھر ہے وہ ایک بن گھڑا پتھر تھا ازد، غسان، اوس اور خزرج اس کا حج کرتے تھے، عمرو بن لحی نے جو اصنام قائم کئے تھے یہ ان سب میں بالاتر تھا اوس اور خزرج جب کعبہ کا حج کرتے تو احرام اتارنے کی رسم (بال منڈانا) اسی کے پاس آکر ادا کرتے تھے[2]۔ قبیلہ ہذیل کا بت سواع تھا جو ینبع کے اطراف رہاط میں تھا، یہ ایک پتھر تھا، اس کے متولی بنو لحیان تھے۔

بت پرستی کے یہ وہ طلسم تھے جن میں سارا عرب گرفتار تھا۔ اب ان کی بربادی کا وقت آچکا تھا اور دفعۃً ہر جگہ خاک اڑنے لگی۔

*

[1] معجم البلدان ذکر ہبل بحوالہ ہشام بن محمد کلبی [2] یہ تمام تفصیل زرقانی جلد دوم صفحہ ۳۴۹ میں ہے [3] معجم البلدان ذکر مناۃ۔

ہوازن وثقیف

غزوۂ حنین واوطاس وطائف

شوال ۸ھ

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ

حُنین حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ ذوالمجاز عرب کا مشہور بازار اور عرفہ سے تین میل ہے، یہ اس کے دامن میں ہے، اس مقام کو اوطاس بھی کہتے ہیں[۱]۔ ہوازن ایک بڑے قبیلہ کا نام ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔

اسلام کی فتوحات کا دائرہ گو وسیع ہوتا جاتا تھا لیکن اہلِ عرب یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا قبلۂ اعظم یعنی مکہ اب تک محفوظ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر قریش پر غالب آگئے اور مکہ فتح ہوگیا تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں۔ مکہ جب فتح ہوا تو تمام قبائل نے خود پیش قدمی کی اور اسلام قبول کرنا شروع کیا[۲]، لیکن ہوازن اور ثقیف پر اس کا الٹا اثر پڑا۔ یہ قبیلے نہایت جنگ جُو اور فنونِ جنگ سے واقف تھے۔ اسلام کو جس قدر غلبہ ہوتا جاتا تھا، یہ زیادہ مضطر ہوتے تھے[۳] کہ ان کی ریاست اور امتیاز کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ اس بناء پر فتح مکہ کے بعد (ہوازن اور ثقیف) کے رؤسا نے یہ سمجھ لیا کہ اب اُن کی باری ہے، اس لئے انھوں نے ایک دوسرے سے مل کر مشورہ کیا اور آپس میں قرارداد ہوگئی کہ (مسلمانوں کے خلاف جو اس وقت مکہ میں جمع ہیں) ایک عام حملہ کر دیا جائے۔

(اس قرارداد کے مطابق یہ قبائل) بڑے زور شور کے ساتھ خود حملہ کے لئے بڑھے، جوش کا یہ عالم تھا کہ ہر قبیلہ اپنا تمام اہل وعیال لے کر آیا تھا کہ بچے اور عورتیں ساتھ ہوں گی تو ان کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانیں دے دیں گے۔

---

(۱) یہاں مصنف کی عبارت میں کچھ اغلاق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حنین زرقانی کی تصریح کے مطابق مکہ اور طائف کے درمیان عرب کے مشہور بازار ذوالمجاز کے پاس ہے جو عرفہ سے تین میل ہے۔ ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ یہ مکہ سے تین دن کے سفر کی مسافت پر واقع ہے (س) (۱) قاضی عیاض کی یہی رائے ہے لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن اسحاق کی تصریح کے مطابق یہ حنین کے علاوہ دیارِ ہوازن میں دوسری وادی کا نام ہے۔ فتح الباری وزرقانی ذکر غزوہ ہوازن واوطاس (س)۔ [۲] صحیح بخاری ذکر فتح مکہ (بعد باب مقام النبی بمکہ)۔ [۳] مارگولیوس صاحب لکھتے ہیں۔ حکومت اسلامی کی وسعت اور استحکام سے بدوی قبائل جن کو ریگستان کی آزادی بہت عزیز تھی نہایت خائف تھے۔

اس معرکہ میں اگرچہ ثقیف اور ہوازن کی تمام شاخیں شریک تھیں تاہم کعب اور کلاب الگ رہے، (فوج کی سرداری کے لئے انتخاب (تو) مالک بن عوف[۱] کا کیا گیا جو قبیلہ ہوازن کا رئیسِ اعظم تھا) لیکن مشیر کی حیثیت سے دُرید بن الصِّمَّہ (کو بھی ساتھ لے لیا گیا) جو عرب کا مشہور شاعر اور قبیلۂ جُشَم کا سردار تھا، اس کی شاعری اور بہادری کے معرکے اب تک عرب کی تاریخ میں یادگار ہیں لیکن اس کی عمر سو برس سے زیادہ ہو چکی تھی اور صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، تاہم چونکہ عرب اس کو مانتا تھا اور اس کی رائے وتدبیر پر تمام ملک کا اعتماد تھا۔ خود مالک بن عوف نے اس سے شرکت کی درخواست کی۔ پلنگ پر اٹھا کر اس کو میدانِ جنگ میں لاتے۔ اس نے پوچھا کہ یہ کون سا مقام ہے؟ لوگوں نے کہا اوطاس۔ بولا کہ ہاں یہ مقام جنگ کے لئے موزوں ہے، اس کی زمین نہ بہت سخت ہے نہ اس قدر نرم کہ پاؤں دھنس جائیں۔ پھر پوچھا کہ یہ بچوں کے رونے کی آوازیں کیسی آرہی ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ بچے اور عورتیں ساتھ آئی ہیں کہ کوئی شخص پاؤں پیچھے نہ ہٹائے۔ بولا کہ جب پاؤں اکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ میدانِ جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔ بدقسمتی سے اگر شکست ہوئی تو عورتوں کی وجہ سے اور بھی ذلت ہوگی۔ پھر پوچھا کہ کعب اور کلاب بھی شریک ہیں یا نہیں؟ اور جب یہ معلوم ہوا کہ ان معزز قبیلوں کا ایک شخص بھی میدانِ جنگ میں نہیں تو کہا اگر آج کا دن عزت وشرف کا دن ہوتا تو کعب وکلاب غیر حاضر نہ ہوتے۔

اس کی رائے تھی کہ میدان سے ہٹ کر کسی محفوظ مقام میں فوجیں جمع کی جائیں اور وہیں اعلانِ جنگ کیا جائے لیکن مالک ابن عوف نے جو تیس سالہ نوجوان تھا جوشِ شباب میں اس رائے کے قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ خرف ہو چکے، آپ کی عقل بے کار ہو چکی[۲]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (مکہ میں) ان واقعات کی خبر پہنچی تو آپ نے تصدیق کے لئے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد کو بھیجا، وہ جاسوس بن کر حنین میں آئے اور کئی دن تک فوج میں رہ کر تمام حالات تحقیق کئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبوراً مقابلہ کی تیاریاں کیں، رسد اور سامانِ جنگ کے لئے قرض کی ضرورت پیش آئی۔ عبداللہ بن ربیعہ جو ابوجہل کے ماں جائے بھائی تھے، نہایت دولت مند تھے، ان سے تیس ہزار درہم قرض لئے[۳]۔ صفوان بن امیہ جو مکہ کا رئیسِ اعظم اور مہمان نوازی میں مشہور تھا، لیکن اب تک اسلام نہیں لایا تھا، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلحۂ جنگ مستعار مانگے، اس نے سو زرہیں اور ان کے لوازمات پیش کئے[۴]۔

شوال ۸ھ مطابق جنوری وفروری ۶۳۰ء میں اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی، اس سروسامان سے حنین پر بڑھیں کہ بعض صحابہ کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا کہ "آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے"؟ لیکن بارگاہ

---

(۱) مالک بن عوف غزوۂ طائف کے بعد مسلمان ہوگئے تھے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جنگ قادسیہ میں شریک اور دمشق کے حاکم ہوئے زرقانی ج ۳ ص ۲ (س) [۲] یہ تمام تفصیل طبری میں ہے (ج ۳ ص ۱۶۵۵ تا ۱۶۵۷) (س)۔ [۳] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۶۔ [۴] اصابہ میں امام بخاری سے بھی یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس میں دس ہزار کی تعداد ہے۔ موطا میں ہے کہ جب آپ نے اس سے ہتھیار مانگے تو اس نے کہا جبراً یا طوعاً (یعنی جبراً مانگتے ہو تو میں نہیں دیتا)، آپ نے فرمایا جبراً نہیں طوعاً۔ ابوداؤد باب الضمان میں بھی اسی قسم کی روایت ہے۔

ایزدی میں یہ نازش اسندنہ تھی۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ۔ (توبہ-۴)

اور حنین کا دن یاد کرو جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے لیکن وہ کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود وسعت کے تنگی کرنے لگی پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے، پھر اللہ نے اپنے رسولؐ پر اور مسلمانوں پر تسلی نازل کی اور ایسی فوجیں بھیجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور کافروں کو عذاب دیا اور کافروں کی سزا یہی ہے۔

فتح کے بجائے وہلۂ اول میں مطلع صاف تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو رفقائے خاص میں سے بھی کوئی پہلو میں نہ تھا، حضرت ابوقتادہؓ جو شریک جنگ تھے، ان کا بیان ہے کہ جب لوگ

لہ لیکن اور روایتوں میں چند اصحاب کا ثابت قدم رہنا مذکور ہے۔ ان دونوں روایتوں کی تطبیق یہ ہے کہ یہ دو مختلف وقفوں کے حالات ہیں، راوی نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے، تفصیل آگے آئے گی (مصنف نے آئندہ تفصیل کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا ہے اس لئے تفصیل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند باتیں قابلِ تشریح ہیں۔

(۱) پہلی یہ کہ مصنف نے اول وہلہ میں مسلمانوں کی شکست تسلیم کی ہے، یہ ابن اسحاق وغیرہ اہل سیر کی رائے ہے لیکن حدیث صحیح کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کامیابی ہوئی، لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے، دشمن کے تیر اندازوں نے موقع پا کر تیر اندازی شروع کر دی جس سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی، انتشار اور پراگندگی پیدا ہوگئی۔ بخاری میں حضرت براءؓ کے الفاظ یہ ہیں۔

وانا لما حملنا عليهم انكشفوا فاكببنا على الغنائم فاستقبلنا بالسهام (بخاری غزوۂ حنین)

اور ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے تو ہم لوگ مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے تو انھوں نے ہم کو تیروں پر دھر لیا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ شکست کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس جنگ میں کچھ لوگ محض اس غرض ہی سے شریک ہوتے تھے کہ مسلمانوں کو عین جنگ میں دھوکہ دیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ام سلیمؓ نے جو اس جنگ میں شریک تھیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہؐ! ان طلقاء کو قتل کر دیجئے انہی کی وجہ سے شکست ہوتی ہے الفاظ یہ ہیں۔

اقتل من بعدنا من الطلقاء انهزموا بك۔ (غزوة النساء مع الرجال)

ہمارے سوا ان طلقاء کو قتل کر دیجئے ان ہی نے آپ کو شکست دلوائی۔

امام نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

لم يحصل الفرار من جميعهم وانما فتحه عليهم من في قلبه مرض من مسلمة اهل مكة المؤلفة ومشركيها الذين لم يكونوا اسلموا وانما كانت هزيمتهم فجأة لانصبابهم عليهم دفعة واحدة

سب لوگ نہیں بھاگے تھے بلکہ مکہ کے مؤلفۃ القلوب میں جو منافق تھے اور مکہ کے مشرکین (جو اس جنگ میں شریک ہوگئے تھے اور جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) انھوں نے بھاگنا شروع کیا تھا اور یہ ناگہانی ہزیمت اس وجہ سے ہوئی کہ دشمنوں نے

بھاگ نکلے تو میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ ایک مسلمان کے سینہ پر سوار ہے۔ میں نے عقب سے اس کے شانہ پر تلوار ماری جو زرہ کو کاٹ کر اندر اتر گئی۔ اس نے مڑ کر مجھ کو اس زور سے دبوچا کہ میری جان پر بن گئی، لیکن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ورشقهم بالسهام ولاختلاط اهل مكة معهم ممن لم يستقر الايمان في قلبه وممن يتربص بالمسلمين الدوائر وفيهم نساء وصبيان خرجوا للغنيمة (غزوہ خیبر)

ایک ساتھ تیروں کی بارش شروع کر دی تھی اور فوج میں ایسے اہل مکہ بھی تھے جن کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں پر مصائب کے منتظر تھے، اس میں عورتیں اور بچے بھی تھے جو غنیمت کے لئے آئے تھے۔

مورخ طبری نے اس موقع پر مکہ کے ان طلقاء کی زبان سے جو فقرے نقل کئے ہیں وہ بھی اسی راز کی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ اہل مکہ اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ دل سے نہ تھے (ج ۳ ص ۱۶۶۰ لائیڈن) متقدم مفسروں میں سے ابن جریر طبری نے لکھا ہے ان الطلقاء انجفلوا يومئذ بالناس وجلوا عن النبي صلى الله عليه وسلم، (ابن جریر طبری ج ۱۰ ص ۷۷) عہد متوسط کے مفسروں میں سے ابوحیان اندلسی کے الفاظ یہ ہیں۔

يقال ان الطلقاء من اهل مكة فروا وقصدوا القاء الهزيمة في المسلمين (بحر المحیط ج ۵ ص ۲۴)

کہا جاتا ہے کہ مکہ کے طلقاء بھاگ گئے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے۔

متاخر مفسروں میں سے صاحب روح المعانی نے تفسیر سورۂ توبہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔

وكان اول من انهزم الطلقاء مكرا منهم وكان ذلك سببا لوقوع الخلل وهزيمة غيرهم (ج ۱۰ ص ۶۶)

سب سے پہلے طلقاء مکر و فریب سے شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے اس سے مسلمانوں میں بے ترتیبی اور پسپائی کی صورت پیدا ہوئی۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ پسپائی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت ثابت قدم رہی۔ اس سلسلہ میں بنائے اشتباہ بخاری کی حضرت انسؓ والی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

فادبروا عنه حتى بقي وحده۔

لوگ پیچھے ہٹ گئے یہاں تک کہ آپ تنہا رہ گئے۔

مصنف نے ان الفاظ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے وہاں کوئی نہ تھا، اسی لئے اسی روایت میں حضرت انسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو آواز دی تو انصار نے یہ الفاظ کہے لبیک یا رسول الله ابشر نحن معك (ہم حاضر ہیں یا رسول اللہؐ! آپ خوش ہیں کہ ہم آپ کے پاس ہیں) اسی باب میں حضرت انسؓ کی ایک روایت اس سے پہلے ہے جس میں انصار کے الفاظ یہ ہیں۔

لبيك يا رسول الله وسعديك نحن بين يديك (بخاری غزوۂ طائف)

ہم حاضر ہیں یا رسول اللہؐ! ہم آپ کے سامنے ہیں۔

حافظ ابن حجر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہائی اور رفقائے خاص کے پاس رہنے کی تطبیق ان الفاظ میں کی ہے۔

ويجمع بين قوله حتى بقي وحده وبين الاخبار الدالة على انه بقي معه جماعة بان المراد بقي وحده متقدما على العدو والذين ثبتوا

اور اس قول میں کہ حضورؐ تنہا رہ گئے اور ان واقعات میں جو اس پر دال ہیں کہ حضورؐ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت بھی تطبیق یہ ہے کہ حضورؐ دشمن کے سامنے سب سے آگے مقام پر تھے جو آپ کے

پھر وہ ٹھنڈا ہو کر گر پڑا، اسی اثنا میں، میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا۔ پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ بولے کہ قضائے الٰہی یہی تھی۔[1]

شکست کے مختلف اسباب تھے، مقدمۃ الجیش میں جو حضرت خالدؓ کی افسری میں تھا زیادہ تر فتح مکہ کے جریدالاسلام نوجوان تھے، وہ جوانی کے غرور میں اسلحۂ جنگ پہن کر بھی نہیں آئے تھے[2]۔ فوج میں دو ہزار طلقاء یعنی وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) معه کا نوا در اء ہ (ج ۸ ص ۲۴ مصر) ساتھ ثابت قدم تھے وہ آپ کے پیچھے تھے۔

دوسرے یہ کہ بخاری ہی میں حضرت براءؓ کی جو روایت ہے اس میں حضرت براءؓ تصریح کرتے ہیں کہ ابوسفیان بن حارث اس وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے اور آپ کی سواری کی لگام تھامے تھے (غزوۂ حنین بخاری)

مسلم میں حضرت عباسؓ کے پرزور الفاظ یہ ہیں کہ میں نے اور ابوسفیان بن حارث نے حضورؐ سے علیحدگی اختیار نہیں کی

فلزمت انا وابوسفیان بن الحارث بن عبد المطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم نفارقہ (مسلم غزوہ حنین)

صحیحین کی ان روایات کے سوا روایاتِ ذیل بھی پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔

(۱) ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں جو حکم بن عتیبہ سے مروی ہے، چار آدمیوں کا حضورؐ کی خدمت میں باقی رہنا بتایا گیا ہے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)

(۲) ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سو آدمی بھی نہیں باقی رہ گئے تھے

(ترمذی ابواب الجہاد باب ما جاء فی الثبات عند القتال)

(۳) مسند احمد (ج اول ص ۴۵۳) وحاکم میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے مروی ہے کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اسّی آدمی باقی رہ گئے تھے (فتح الباری ج ۸ ص ۱)

(۴) بیہقی نے حارثہ بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے (زرقانی ج ۳ ص ۲۴) ابونعیم نے دلائل میں سو کی تفصیل بتائی ہے کہ تیس سے کچھ زائد مہاجرین تھے، البقیہ انصار تھے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)

(۵) ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت مہاجرین، انصار اور اہل بیت میں سے حسب ذیل اصحاب موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ بن عبد المطلب، حضرت ابوسفیانؓ بن حارث، حضرت جعفر بن ابی سفیان بن حارث، حضرت فضلؓ بن عباس، حضرت ربیعہؓ، حضرت اسامہ بن زید، حضرت ایمنؓ بن ام ایمن۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت انس کے الفاظ (بقی وحدہ) اپنے ظاہری معنی پر باقی نہیں رہ سکتے۔ حافظ ابن حجر نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ آگے تھے اور بقیہ لوگ پیچھے تھے، لیکن اس کی صاف توجیہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے ثابت قدم رہنے والوں کی کمی کا ظاہر کرنا مقصود ہے ورنہ حقیقت یہ نہ تھی۔ دوسری روایت میں ثابت قدم رہنے والوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں (ملاحظہ ہو زرقانی ج ۳ ص ۲۴) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حضرت سرور کونینؐ کے آس پاس تھے اور تھوڑی تھوڑی تعداد میں حضورؐ کے پاس پہنچنے لگے یہاں تک کہ خاصی جماعت حضورؐ کے گرد جمع ہو گئی، اسی وجہ سے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد بتلائی ہے۔ "ن"

[1] صحیح بخاری غزوۂ حنین (ج ۲ ص ۶۱۸) "ن" [2] بخاری باب الجہاد وباب من صف اصحابہ عند الہزیمۃ ونزل عن دابتہ۔ "ن"

لوگ تھے جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے[1]۔ ہوازن قدر اندازی میں تمام عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے میدانِ جنگ میں ان کا ایک تیر بھی خالی نہیں جاتا تھا۔ کفار نے معرکہ گاہ میں پہلے پہنچ کر مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور تیر اندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں، کھوؤں اور دروں میں جا بجا جما دیئے تھے۔ فوج اسلام نے صبح کے وقت جب خوب اجالا بھی نہیں ہوا تھا حملہ کیا، میدانِ جنگ اس قدر نشیب میں تھا کہ پاؤں جم نہیں سکتے تھے۔ حملہ آوروں کا بڑھنا تھا کہ سامنے سے ہزاروں فوجیں ٹوٹ پڑیں۔ ادھر کمین گاہوں سے قدر اندازوں کے دستے نکل آتے اور تیروں کا مینہ برسا دیا۔ مقدمۃ الجیش ابتری کے ساتھ بے قابو ہو کر پیچھے ہٹا اور پھر تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ صحیح بخاری میں ہے (فادبر واعنه حتی بقی وحده) یعنی سب لوگ ٹل گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے رہ گئے۔

تیروں کا مینہ برس رہا تھا۔ بارہ ہزار فوجیں ہوا ہو گئی تھیں، لیکن ایک پیکرِ مقدس پابرجا تھا جو تنہا ایک فوج ایک ملک، ایک اقلیم، یک عالم بلکہ مجموعۂ کائنات تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا یا معشر الانصار! آواز کے ساتھ صدا آئی۔ "ہم حاضر ہیں"۔ پھر آپؐ نے بائیں جانب مڑ کر پکارا۔ اب بھی وہی آواز آئی۔ آپؐ سواری سے اتر پڑے اور جلالِ نبوت کے لہجہ میں فرمایا "میں خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں[2]"۔

بخاری کی دوسری روایت میں ہے۔

انا النبی لا کذب۔	میں پیغمبر ہوں، یہ جھوٹ نہیں ہے۔
انا ابن عبد المطلب	میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔

حضرت عباسؓ نہایت بلند آواز تھے۔ آپؐ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو۔ انھوں نے نعرہ مارا۔

یا معشر الانصار۔	او گروہِ انصار!
یا اصحاب الشجرۃ۔	او اصحاب الشجرۃ (بیعت رضوان والے)

اس پُر اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعۃً پلٹ پڑی۔ جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی وجہ سے مڑ نہ سکے انھوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے، دفعۃً لڑائی کا رنگ بدل گیا، کفار بھاگ نکلے اور جو رہ گئے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ بنو مالک (ثقیف کی ایک شاخ تھی) جم کر لڑے لیکن ان کے ستر آدمی مارے گئے۔ اور جب ان کا علم بردار عثمان بن عبداللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔ شکست خوردہ فوج ٹوٹ پھوٹ کر (کچھ اوطاس میں جمع ہوئی اور کچھ) طائف میں جا کر پناہ گزین ہوئی جس کے ساتھ سپہ سالارِ لشکر

[1] مصنف کا یہ فقرہ واضح نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ گو وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے جیسا کہ عمدۃ القاری جلد ہشتم ص ۳۰۵ مصر اور شرح مسلم نووی غزوۃ النساء مع الرجال میں ہے لیکن ہنوز وہ تازہ مسلمان تھے راسخ الاسلام نہیں ہوئے تھے، اس لئے مہاجرین وانصار جیسا استقلال وثبات ان میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ "ن" [2] بخاری باب الجہاد (باب مذکور) "ن" [3] صحیح بخاری جلد دوم ص ۶۲۱ (غزوۂ طائف)

(مالک بن عوف) بھی تھا۔

اوطاس

درید بن الصمۃ کئی ہزار کی جمعیت لے کر اوطاس میں آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عامرؓ اشعری کے ماتحت، تھوڑی سی فوج اس کے استیصال کے لئے بھیج دی (حضرت ابو عامرؓ درید کے بیٹے کے ہاتھ سے مارے گئے اور علم اسلام اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے آگے بڑھ کر حملہ کیا، دشمن کو قتل کر کے علم اس کے ہاتھ سے چھین لیا) درید ایک شتر پر ہودج میں سوار تھا۔ ربیعؓ بن رفیع نے اُس پر تلوار کا وار کیا لیکن اچٹ کر رہ گئی۔ اس نے کہا "تیری ماں نے تجھ کو اچھے ہتھیار نہیں دیئے"۔ پھر کہا کہ "میرے محمل میں تلوار ہے نکال لو اور جب اپنی ماں کے پاس واپس جانا تو کہنا کہ میں نے درید کو قتل کر دیا"۔ ربیعہ نے جا کر ماں کو اس کے قتل کی خبر دی تو اس نے کہا۔ خدا کی قسم! درید نے تیری تین ماؤں کو آزاد کرایا تھا۔[1]

اسیرانِ جنگ کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی، اُن میں حضرت شیماؓ بھی تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن تھیں، لوگوں نے جب ان کو گرفتار کیا تو انھوں نے کہا "میں تمہارے پیغمبر کی بہن ہوں"۔ لوگ تصدیق کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، انھوں نے پیٹھ کھول کر دکھائی کہ ایک دفعہ بچپن میں آپؐ نے دانت سے کاٹا تھا یہ اس کا نشان ہے۔ فرطِ محبت سے آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُن کے بیٹھنے کے لئے خود ردائے مبارک بچھائی۔ محبت کی باتیں کیں، چند شتر اور بکریاں عنایت فرمائیں اور ارشاد کیا کہ جی چاہے تو میرے گھر چل کر رہو اور گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے۔ انھوں نے خاندان کی محبت سے وطن جانا چاہا۔ چنانچہ عزت واحترام کے ساتھ پہنچا دی گئیں۔[2]

محاصرۂ طائف

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جا کر پناہ گزین ہوئی اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ طائف نہایت مضبوط مقام تھا۔ طائف اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے گرد شہر پناہ کے طور پر چار دیواری تھی۔ یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا نہایت شجاع، تمام عرب میں ممتاز اور قریش کا گویا ہمسر تھا عروہ بن مسعود جو یہاں کا رئیس تھا، ابو سفیان (حضرت امیر معاویہؓ کے باپ) کی لڑکی اس کو بیاہی تھی۔ کفارِ مکہ کہتے تھے کہ قرآن اگر اترتا تو مکہ یا طائف کے رؤسا پر اترتا۔ یہاں کے لوگ فنِ جنگ سے بھی واقف تھے۔ طبری اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود اور غیلان بن سلمہ نے جُرَش (یمن کا ایک ضلع) میں جا کر قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ، ضبور اور منجنیق کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا۔[3]

یہاں ایک محفوظ قلعہ تھا، اہل شہر اور حنین کی شکست خوردہ فوج نے اس کی مرمت کی، سال بھر کا رسد کا سامان جمع کیا، چاروں طرف منجنیقیں اور جا بجا قدر انداز متعین کئے۔[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں اور خود طائف کا عزم کیا۔ حضرت خالدؓ مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کر دیئے گئے تھے۔[5] غرض محاصرہ

[1] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۹۹) [2] طبری (ج ۳) صفحہ ۱۶۶۶ مطبوعہ یورپ [3] طبقات ابن سعد و اصابہ و طبری (ج ۳ ص ۱۶۶۹)
[4] طبری (ج ۳) ص ۱۶۶۹ مطبوعہ یورپ) [5] تاریخ خمیس جلد دوم صفحہ ۱۲۲ و ابن سعد۔

ہوا اور اسلام میں یہ موقع پہلا تھا کہ قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ اور منجنیق استعمال کئے گئے۔ دبابہ پر اہل قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں اور اس شدت کی تیر باری کی کہ حملہ آوروں کو ہٹنا پڑا، بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ بیس دن تک محاصرہ رہا لیکن شہر فتح نہ ہو سکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوفل ابن معاویہ کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے اگر کوشش جاری رہے تو پکڑ لی جائے گی لیکن چھوڑ دی جائے تب بھی کچھ اندیشہ نہیں، چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ صحابہ نے عرض کی کہ آپؐ ان کو بد دعا دیں۔ آپ نے یہ دعا دی۔[1]

اللھم اھد ثقیفا وائت بھم۔ | اے خدا ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔

تقسیم غنائم

محاصرہ چھوڑ کر آپ جعرانہ تشریف لائے۔ غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا، چھ ہزار اسیرانِ جنگ چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار (سے زیادہ) بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ اسیرانِ جنگ کے متعلق آپؐ نے انتظار کیا ان کے عزیز و اقارب آئیں تو اُن سے گفتگو کی جائے۔ لیکن کئی دن گزرنے پر کوئی نہ آیا مالِ غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے، چار حصے حسب قاعدہ اس فوج کو تقسیم کئے گئے، خمس بیت المال اور غربا و مساکین کے لئے رکھا گیا۔

مکہ کے اکثر رؤسا جنھوں نے حال میں اسلام قبول کیا تھا، ابھی تک مذبذب الاعتقاد تھے، انہی کو قرآن مجید میں مولفۃ القلوب کہا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں زکوٰۃ کے مصارف بیان کئے ہیں، ان لوگوں کا نام بھی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو نہایت فیاضانہ انعامات دیئے جن کی تفصیل یہ ہے۔

ابو سفیان مع اولاد۔	۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی۔
حکیم بن حزام۔	۲۰۰ اونٹ۔
نضیر بن حارث بن کلدہ ثقفی۔	۱۰۰ اونٹ۔
صفوان بن امیہ۔	۱۰۰ اونٹ۔
قیس بن عدی۔	۱۰۰ اونٹ۔
سہیل بن عمرو۔	۱۰۰ اونٹ۔
حویطب بن عبد العزیٰ۔	۱۰۰ اونٹ۔

(ان کے علاوہ تین غیر مکی نو مسلم رئیس بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرے)

اقرع بن حابس (تمیمی)	۱۰۰ اونٹ۔
عیینہ بن حصن (فزاری)	۱۰۰ اونٹ۔
مالک بن عوف (نضری)	۱۰۰ اونٹ۔

[1] ابن سعد، جز مغازی ص ۱۱۵ و ۱۱۶ [2] طبقات ابن سعد (جز مغازی ص ۱۱۰) ق۔

ان کے سوا بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے۔ عام تقسیم کی رو سے فوج کے حصہ میں جو آیا وہ فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں تھیں، لیکن چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا اس لئے ہر سوار کے حصہ میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں۔[1]

جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی عموماً اہل مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے، اس پر انصار کو رنج ہوا، بعضوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں۔[2] بعض بولے کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے۔[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چرچے سنے انصار کو طلب فرمایا، ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا جس میں لوگ جمع ہوئے، آپ نے انصار کی طرف خطاب کیا کہ تم نے ایسا کہا؟ لوگوں نے عرض کی کہ حضور! ہمارے سر برآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا۔ نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے۔[4] صحیح بخاری باب مناقب الانصار میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے، انھوں نے کہا، آپ نے جو سنا صحیح ہے۔

آپ نے ایک خطبہ دیا جس کی نظیر فن بلاغت میں نہیں مل سکتی، انصار کی طرف خطاب فرما کر کہا۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی، تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو دولت مند کیا۔"

آپ یہ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ خدا اور رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔[5]

آپ نے فرمایا "نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی، تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تو مفلس آیا تھا ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔"

یہ کہہ کر آپ نے فرمایا کہ تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو، لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر اپنے گھر آؤ۔"

انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ ہم کو صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم درکار ہیں۔ اکثروں کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہو گئیں، آپ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں، میں نے ان کو جو کچھ دیا حق کی بنا پر نہیں دیا بلکہ تالیف قلب کے لئے دیا۔[6]

حنین کے اسیران جنگ اب تک جعرانہ میں محفوظ تھے، ایک معزز سفارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

(۱) طبقات ابن سعد جزء مغازی صـ۱۱۰ و زرقانی علی المواہب ج ۳ صـ۳۴ (ص) (۲) صحیح بخاری غزوۂ طائف (۳) صحیح بخاری مطبوعہ مطبع نظامی صـ۶۲۱ (۴) صحیح بخاری صـ۶۲۰ باب غزوۂ طائف (ص) (۵) صحیح بخاری صـ۶۲۰ باب غزوۂ طائف و فتح الباری ج ۸ صـ۴۴ (ص) (۶) صحیح بخاری و فتح الباری، پوری تفصیل فتح الباری میں ہے۔

خدمت میں حاضر ہوئی کہ اسیران جنگ رہا کر دیئے جائیں، یہ وہ قبیلہ تھا کہ آپ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہؓ اسی قبیلہ کی تھیں۔ رئیس قبیلہ (زہیر بن صرد) نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہو کر کہا جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں انہی میں تیری پھوپھیاں اور تیری خالائیں ہیں، خدا کی قسم! اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ان سے بہت کچھ امیدیں ہوتیں اور تجھ سے تو اور بھی زیادہ توقعات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔ خاندان عبد المطلب کا جس قدر حصہ ہے وہ تمہارا ہے۔ لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد جب مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کرو۔ نماز ظہر کے بعد ان لوگوں نے یہ درخواست مجمع کے سامنے پیش کی، آپ نے فرمایا۔ مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے۔ لیکن میں تمام مسلمانوں سے ان کے لئے سفارش کرتا ہوں۔ مہاجرین اور انصار بول اٹھے۔ ہمارا حصہ بھی حاضر ہے، اس طرح چھ ہزار دفعۃً آزاد تھے۔[1]

واقعات متفرقہ حضرت ماریہؓ کے بطن سے اسی سال ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابراہیم رکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بچہ سے نہایت محبت تھی ڈیڑھ سال (۱۷ یا ۱۸ مہینے) زندہ رہا۔ جس دن ابراہیم نے وفات پائی، سورج گرہن ہوا۔ عرب کا عقیدہ تھا کہ سورج گرہن کسی عظیم الشان انسان کی موت کی علامت ہے۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ ابراہیم کی موت کا نتیجہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ "سورج اور چاند خدا کی قدرت ہیں، کسی کے مرنے اور جینے سے ان میں گرہن نہیں لگتا"۔ اس کے بعد آپ نے کسوف کی نماز با جماعت ادا فرمائی۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔

*

(۱) طبری جلد ۳ صـ۱۶۷۹ (ص) (۲) بخاری باب کسوف۔

سنہ ۹ھ

واقعۂ ایلاء و تخییر و غزوۂ تبوک

ایلاء اور تخییر سنہ ۹ھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زاہدانہ اور تمام زخارفِ دنیوی سے بیگانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دو دو مہینے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے، مدت العمر دو وقت برابر سیر ہو کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ ازواجِ مطہراتؓ اس جنسِ لطیف میں شامل تھیں جن کی مرغوب ترین چیز عموماً زیب و زینت اور ناز و نعمت ہے، اور گو شرفِ صحبت نے ان کو تمام ابنائے جنس سے ممتاز کر دیا تھا تاہم بشریت بالکل معدوم نہیں ہو سکتی تھی، خصوصاً وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحاتِ اسلام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور غنیمت کا سرمایہ اس قدر پہنچ گیا ہے کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی ان کی راحت و آرام کے لئے کافی ہو سکتا ہے، ان واقعات کا اقتضاء تھا کہ ان کے صبر و قناعت کا جام لبریز ہو جاتا تھا۔

ازواجِ مطہراتؓ بڑے بڑے گھرانوں کی خاتونیں تھیں، حضرت ام حبیبہؓ تھیں جو رئیسِ قریش کی صاحبزادی تھیں، حضرت جویریہؓ تھیں جو قبیلۂ بنی المصطلق کے رئیس کی بیٹی تھیں، حضرت صفیہؓ تھیں جن کا باپ خیبر کا رئیسِ اعظم تھا، حضرت عائشہؓ تھیں جو حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی تھیں، حضرت حفصہؓ تھیں جن کے والد فاروقِ اعظمؓ تھے۔ بشریت کے اقتضاء سے ان میں منافست بھی تھی اور حریف کے مقابلہ میں اپنے رتبہ اور شان کا خیال رہتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر ایک کو جو شدید محبت تھی وہ ع باسایہ ترا نمی پسندم کی حد تک تھی۔

ایک دفعہ کئی دن تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ کے پاس معمول سے زیادہ بیٹھے جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زینبؓ کے پاس کہیں سے شہد آ گیا تھا انھوں نے آپؐ کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ کو شہد بہت مرغوب تھا، آپؐ نے نوش فرمایا، اس میں وقت مقررہ سے دیر ہو گئی، حضرت عائشہؓ کو رشک ہوا، حضرت حفصہؓ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہمارے یا تمہارے گھر میں آئیں تو کہنا چاہیئے کہ آپؐ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے (مغافیر کے پھولوں سے شہد کی مکھیاں رس چوستی ہیں) آنحضرت صلی اللہ

۱؎ بعض محدثین کی رائے ہے کہ یہ ذوالحجہ سنہ ۵ھ کا واقعہ ہے، اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ بعض روایتوں میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ نزولِ حجاب سے پہلے کا واقعہ ہے لیکن آگے چل کر حضرت عمرؓ کی روایت میں مذکور ہے کہ جب اس حادثہ کی مبہم خبر سے مسلمانوں میں اضطراب دیکھا تو سمجھے کہ غسان کا بادشاہ حملہ آور ہوا جس کی اطلاع پہلے ہو چکی تھی۔ غسان کا حملہ سنہ ۹ھ میں ہونے والا تھا۔ حافظ ابن حجر اور محمد دمیاطی نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ یہ اوائل سنہ ۹ھ کا واقعہ ہے (دیکھو فتح الباری ج ۹ صفحہ ۲۵۰)۔ ش

علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ میں شہد نہ کھاؤں گا۔ اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ (تحریم-۱)

اے پیغمبر اپنی بیویوں کی خوشی کے لئے تم خدا کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کیوں کرتے ہو۔

علامہ عینی نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے۔

فان قلت کیف جاز لعائشة وحفصة الکذب والمواطاة التی فیها ایذاء رسول الله صلی الله علیه وسلم قلت کانت عائشة صغیرة مع انها وقعت منها من غیر قصد الایذاء بل علی ما هو من جبلة النساء فی الغیرة علی الضرائر (تفسیر سورۂ تحریم)

اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو جھوٹ بولنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازش کرنا کیونکر جائز تھا تو جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کم سن تھیں ان کے علاوہ ان کا مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ عورتیں اپنی سوکنوں کے مقابلہ میں رشک سے تدبیریں اختیار کرتی ہیں اس طرح کی ایک تدبیر تھی۔

لیکن علامہ موصوف کا جواب تسلیم کرنا مشکل ہے، اول تو یہ واقعہ ایلاء کے سلسلہ میں ہے جو سنہ ۹ھ میں واقع ہوا تھا، اس وقت حضرت عائشہؓ سترہ برس کی ہو چکی تھیں، دوسرے حضرت عائشہؓ کم سن تھیں لیکن ازواجِ مطہراتؓ جو اس میں شریک ہوتیں وہ تو پوری عمر کی تھیں، خود حضرت حفصہؓ کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے وقت ۲۵ برس کی تھی۔

ہمارے نزدیک مغافیر کی بو کا اظہار کرنا کوئی جھوٹ بات نہ تھی، تمام روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لطیف المزاج تھے اور رائحہ کی ذرا سی ناگواری کو برداشت نہیں فرما سکتے تھے، مغافیر کے پھولوں میں اگر کسی قسم کی کرختگی ہو تو تعجب کی بات نہیں، البتہ ازواجِ مطہراتؓ کا ایکا کرنا بظاہر محلِ اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن یہ کسی کا اعتقاد نہیں کہ ازواجِ مطہراتؓ معصوم تھیں یا اپنے انجاحِ مقصد کے لئے جائز وسائل نہیں اختیار کرتی تھیں

اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی راز کی بات حضرت حفصہؓ سے فرمائی اور تاکید کر دی کہ کسی سے نہ کہنا، لیکن انھوں نے حضرت عائشہؓ سے کہہ دیا، اس پر یہ آیت اتری۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ۔ (تحریم-۱)

اور جب کہ پیغمبرؐ نے اپنی بعض بیویوں سے راز کی بات کہی اور انھوں نے فاش کر دی اور خدا نے پیغمبر کو اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے اس کا کچھ حصہ ان سے کہا اور کچھ چھوڑ دیا پھر جب ان سے کہا کہ آپ کو کس نے خبر دی، پیغمبر نے کہا مجھ کو خدائے عالم خبیر نے خبر دی۔

شکر رنجیاں بڑھتی گئیں اور حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ نے باہم مظاہرہ کیا، یعنی دونوں نے اس پر اتفاق کیا کہ دونوں مل کر زور ڈالیں، اس پر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی شان میں یہ آیتیں اتریں۔

۲؎ صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم، اس واقعہ کو بخاری کتاب الطلاق میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ اس تدبیر میں اور ازواجِ مطہراتؓ بھی شریک کر لی گئیں اور جس نے اول اس کا اظہار کیا وہ حضرت سودہؓ تھیں (مسند احمد ج ۶ صفحہ ۲۲۹ و فتح الباری ج ۹ صفحہ ۳۳۲)۔ ش

إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيرٌ۔ (سورہ تحریم - ۱)

اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو تو تمہارے دل مائل ہو چکے ہیں اور اگر ان کے (یعنی رسول اللہؐ) کے مقابلہ میں ایکا کرو تو خدا اور جبریل اور نیک مسلمان اور سب کے بعد فرشتے رسول اللہ کے مددگار ہیں۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے جن معاملات کی وجہ سے ایکا کیا تھا وہ خاص تھے لیکن توسیعِ نفقہ کے تقاضے میں تمام ازواجِ مطہراتؓ شریک تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سکونِ خاطر میں یہ تنگ طلبی اس قدر خلل انداز ہوئی کہ آپؐ نے عہد فرمایا کہ ایک مہینہ تک ازواجِ مطہراتؓ سے نہ ملیں گے۔ اتفاق یہ کہ اسی زمانے میں آپؐ گھوڑے سے گر پڑے اور ساقِ مبارک پر زخم آیا۔ آپؐ نے بالاخانہ[1] پر تنہا نشینی اختیار کی۔ واقعات کے قرینہ سے لوگوں نے خیال کیا کہ آپؐ نے تمام ازواج کو طلاق دی۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آتے ان کو ہم حضرت عمرؓ کی زبان سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے دلچسپ اور پر اثر تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس بیان میں کچھ ابتدائی واقعات بھی آگئے ہیں جن سے اصل معاملہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں اور ایک انصاری (اوس بن خولی یا عتبان بن مالک) ہمسایہ تھے اور معمول تھا کہ باری باری سے ایک دن بیچ دے کر ہم دونوں خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

قریش کے لوگ عورتوں پر قابو رکھتے تھے اور ان پر غالب رہتے تھے لیکن جب مدینہ میں آئے تو یہاں انصار کی عورتیں مردوں پر غالب تھیں، ان کا انداز دیکھ کر ہماری عورتوں نے بھی ان کی تقلید شروع کی۔ ایک دن میں نے اپنی بیوی کو کسی بات پر ڈانٹا، انھوں نے الٹ کر جواب دیا۔ میں نے کہا، تم میری بات کا جواب دیتی ہو۔ بولیں تم کیا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ان کو برابر کا جواب دیتی ہیں یہاں تک کہ دن بھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روٹھی رہتی ہیں۔ میں نے دل میں کہا غضب ہو گیا۔ اٹھ کر حفصہؓ (حضرت عمرؓ کی صاحبزادی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ) کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا تو واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رات بھر روٹھی رہتی ہے۔ حفصہ نے اقرار کیا۔ میں نے کہا تجھ کو یہ خیال نہیں کہ رسولؐ کی ناراضی خدا کی ناراضی ہے۔ بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا خیال فرماتے ہیں ورنہ تجھ کو طلاق دے چکے ہوتے۔ پھر حضرت ام سلمہؓ کے پاس گیا اور ان سے بھی یہی شکایت کی۔ بولیں کہ عمر!

[1] بالاخانہ کے لئے احادیث میں مشربہ کا لفظ آیا ہے، مشربہ کے نام سے زیادہ تر مشربۂ ام ابراہیم (ماریہ) مشہور ہے۔ اسی لئے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ وہی بالاخانہ تھا لیکن یہ قطعاً غلط ہے۔ مشربۂ ام ابراہیم مدینہ سے باہر واقع تھا۔ حضرت عمرؓ کی جو روایت تمام صحاح میں موجود ہے اور جس کو مصنف نے آگے نقل کیا ہے اس سے بھی متبادر ہوتا ہے کہ یہ وہ مقام تھا، حضرت حفصہؓ کے گھر اور مسجد نبویؐ سے بالکل متصل تھا کہ حضرت عمرؓ دوڑ دوڑ کر کبھی ادھر کبھی ادھر جاتے تھے۔ ابوداؤد میں تصریح ہے کہ یہ مشربہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ کا بالاخانہ تھا جو مسجد نبویؐ ہی سے متصل دیگر ازواجِ مطہراتؓ کے حجروں کے برابر تھا، ابوداؤد باب الامام یصلی من قعود (ص۔) [2] یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب یعنی کتاب النکاح، طلاق، کتاب العلم میں باختلاف عبارت منقول ہے، صحیح مسلم باب النکاح میں بھی کئی طریق سے مذکور ہے۔ ان روایتوں میں باہم جزئیات میں اختلاف ہے، ہم نے تا امکان سب روایتوں کو جمع کیا ہے۔

تم ہر معاملہ میں دخل دینے لگے یہاں تک کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی ازواج کے معاملات میں بھی دخل دیتے ہو۔ میں چپ رہ گیا اور اٹھ کر چلا آیا۔

کچھ رات گئی، میرے ہمسایہ انصاری باہر سے آئے اور بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، میں گھبرا کر اٹھا اور دروازہ کھول کر پوچھا خیر ہے؟ انھوں نے کہا غضب ہو گیا۔ میں نے کہا کیا غسانی[1] مدینہ پر چڑھ آئے۔ بولے کہ نہیں اس سے بھی بڑھ کر یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کو طلاق دے دی، میں صبح کو مدینہ آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر بالاخانہ میں تنہا جا کر بیٹھ گئے۔ میں حفصہ کے پاس آیا تو دیکھا وہ بیٹھی رو رہی ہے۔ میں نے کہا تجھ سے پہلے ہی کہا تھا حفصہ کے پاس سے اٹھ کر مسجد نبویؐ میں گیا دیکھا تو صحابہ منبر کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، میں ان کے پاس بیٹھ گیا لیکن طبیعت کو سکون نہیں ہوتا تھا، اٹھ کر بالاخانہ کے پاس آیا اور رباح (خادم خاص) سے کہا اطلاع کرو، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہیں دیا۔ میں اٹھ کر پھر مسجد میں آیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بے تاب ہو کر بالاخانہ کے نیچے آیا اور دربان سے دوبارہ اذن طلبی کی درخواست کی، جب کچھ جواب نہیں ملا تو میں نے پکار کر کہا رباح! میرے لئے اذن مانگ۔ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہے کہ میں حفصہ کی سفارش کرنے آیا ہوں۔ خدا کی قسم! رسول اللہ فرمائیں تو حفصہ کی گردن اڑا دوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی، اندر گیا تو دیکھا کہ آپؐ کھری چارپائی[2] پر لیٹے ہیں اور جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں ادھر ادھر نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کھونٹی پر لٹک رہی تھی، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سبب پوچھا۔ میں نے عرض کی اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا؟ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپؐ پیغمبر ہو کر آپؐ کی یہ حالت ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا لیں اور ہم آخرت۔

میں نے عرض کی، کیا آپؐ نے ازواج کو طلاق دے دی؟ آپؐ نے فرمایا "نہیں"۔ میں اللہ اکبر پکار اٹھا، پھر عرض کی کہ مسجد میں تمام صحابہ مغموم بیٹھے ہیں اجازت ہو تو جا کر خبر کر دوں کہ واقعہ غلط ہے، چونکہ ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ آپؐ بالاخانہ سے اتر آئے اور عام باریابی کی اجازت ہو گئی۔ اس کے بعد آیتِ تخییر

[1] غسانی عرب کا ایک خاندان تھا جو شام میں رومیوں کے ماتحت کام کرتا تھا، وہ رومیوں کی تحریک سے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ [2] بعض روایتوں میں حصیر (چٹائی) کا لفظ آیا ہے اور بعض میں سریر (چارپائی) ابن حجر نے یہ تطبیق دی ہے کہ وہ تھی چارپائی لیکن چٹائی جس سے بُنی جاتی ہے اس سے بُنی ہوئی تھی (فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۲۵۰) [3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالاتفاق ۲۹ دن بالاخانہ پر تشریف فرما رہے، حضرت عمرؓ کا یہ مکالمہ پہلے روز کا واقعہ ہے یا آخر روز کا، اس روایت کے جتنے طرق ہیں ان کا ابتدائی ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ یہ پہلے ہی دن کا واقعہ ہے اور آخر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ انتیسویں روز کا واقعہ ہے۔ مصنف مرحوم نے آخری فقروں کا لحاظ کیا ہے اور بظاہر اس کو انتیسویں روز کا واقعہ سمجھا ہے لیکن اس بنا پر لازم آتا ہے کہ ۲۸ دن تک گویا حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کو واقعہ ایلاء کی اطلاع ہی نہ تھی حالانکہ اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر محدثین نے یہ تاویل کی ہے کہ اس مکالمہ کا اکثر حصہ پہلے روز کا واقعہ ہے لیکن صرف اترنے کا بیان آخر روز کا واقعہ ہے۔ راوی نے بیچ کا سلسلہ چھوڑ دیا بخاری کی اس روایت سے ...

نازل ہوئی۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا (احزاب-۴)

اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دے کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور دنیا کا زیب و آرائش مطلوب ہے تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر بہ طریق احسن رخصت کر دوں اور اگر خدا، خدا کا رسول اور آخرت مطلوب ہے تو خدا نے تم میں سے نیکوکاروں کے لئے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے۔

اس آیت کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ازواج مطہرات ؓ کو مطلع فرما دیں کہ دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں۔ دنیا اور آخرت۔ اگر تم چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم خدا اور رسول اور زندگانی ابدی کی طلب گار ہو تو خدا نے نیکوکاروں کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔ مہینہ ختم ہو چکا تھا، آپ بالاخانہ سے اُترے اور چونکہ ان تمام معاملات میں حضرت عائشہ ؓ پیش پیش تھیں، اُن کے پاس تشریف لے گئے اور مطلع فرمایا۔ انھوں نے کہا میں سب کچھ چھوڑ کر خدا اور رسول کو لیتی ہوں، تمام ازواج مطہرات ؓ نے بھی یہی جواب دیا۔

ایلا۔ تخییر، مظاہرۂ حفصہ و عائشہ، یہ واقعات عام طور پر اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ گویا مختلف زمانوں کے واقعات ہیں اور ان سے ایک ظاہر بین یہ دھوکہ کھا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات ؓ کے ساتھ ہمیشہ ناگواری کے ساتھ بسر کرتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں واقعے ہم زمان اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، صحیح بخاری کتاب النکاح (باب موعظۃ الرجل ابنتہ) میں حضرت ابن عباس ؓ کی زبانی جو نہایت تفصیلی روایت ہے اس میں صاف تصریح ہے کہ مظاہرۂ ازواج مطہرات ؓ سے انعزال افشائے راز، آیت تخییر کا نزول سبب ایک ہی سلسلہ کے واقعات ہیں۔

حافظ ابن حجر انعزال کے متعدد اسباب لکھ کر لکھتے ہیں۔

وھذا ھو اللائق بمکارم اخلاقہ صلی اللہ علیہ وسلم وسعۃ صدرہ وکثرۃ صفحہ وان ذلک لم یقع منہ حتی تکرر موجبہ منھن۔

(فتح الباری ج ۹ صفحہ ۲۵۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق کشادہ دلی اور کثرت عفو کے یہی مناسب ہے اور آپ نے اس وقت تک ایسا نہیں کیا ہو گا جب تک اُن سے اس قسم کی حرکتیں متعدد بار ظہور پذیر نہ ہوئیں۔

مظاہرہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی ضرر رساں سازش تھی جس کا اثر بہت پُرخطر تھا آیت مذکورہ یہ ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کتاب النکاح باب موعظۃ الرجل ابنتہ لحال زوجہا اور کتاب اللباس باب ما کان یتجوز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اللباس میں مذکور ہے، یہ صاف تصریح موجود ہے اس بنا پر وہ فقرہ کو یوں پڑھنا چاہیئے "جب ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گزر چکا۔" س

وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيرٌ (تحریم-۱)

اور اگر تم دونوں (حضرت عائشہ ؓ و حضرت حفصہ ؓ) رسول کے برخلاف ایکا کرو تو خدا اس کا مولا ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور ان سب کے ساتھ فرشتے بھی مددگار ہیں۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ اگر ان دونوں کا ایکا قائم رہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کو خدا اور جبریل اور نیک مسلمان موجود ہیں اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرشتے بھی اعانت کے لئے تیار ہیں۔

روایتوں سے مظاہرہ کا جو سبب معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعہ سے وہ نفقہ کی توسیع چاہتی تھیں، اور اگر ماریہ قبطیہ کی روایت تسلیم کر لی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کر دی جائیں، لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں اور حضرت عائشہ ؓ و حضرت حفصہ ؓ کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پُرخطر ہو سکتی ہے جس کی مدافعت کے لئے ملاء اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو اس بنا پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا، مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک گروہ کثیر موجود تھا جن کی تعداد ۔۔۔ تک بیان کی گئی ہے۔ یہ شریر النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوا دیں (ابن حجر نے اصابہ میں اُم جلدح کے حال میں لکھا ہے وکانت تحرش بین ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم (وہ ازواج مطہرات کو باہم بھڑکایا کرتی تھیں) افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آ چکی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پندرہ دن تک حضرت عائشہ ؓ سے کبیدہ خاطر رہے، حضرت حسان ؓ افک میں شریک ہو گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی حمنہ جو حضرت زینب ؓ کی بہن تھیں سازش میں آ گئی تھیں چنانچہ اس روایت کو علانیہ شہرت دیتی تھیں، حضرت ابوبکر ؓ نے اپنے ایک قریبی عزیز مسطح، کو جو شریک تہمت تھے، مالی اعانت سے محروم کر دیا تھا غرض اگر حضرت عائشہ ؓ کی برأت پر وحی نہ آ جاتی تو ایک فتنۂ عظیم برپا ہو چکا تھا معلوم ہوتا ہے کہ جب ازواج مطہرات ؓ کی کشش خاطر اور کبیدگی اور تنگ طلبی کا حال منافقوں کو معلوم ہوا تو ان بدنفسوں نے اشتعال دے کر بھڑکانا چاہا ہو گا، چونکہ مظاہرہ کے ارکان اعظم حضرت عائشہ ؓ و حضرت حفصہ ؓ تھیں، ان کو خیال ہوا ہو گا کہ اُن کے ذریعہ سے اُن کے والدین (حضرت ابوبکر ؓ و حضرت عمر ؓ) کو اس سازش میں شریک کر لینا ممکن ہے، لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت ابوبکر ؓ و حضرت عمر ؓ، حضرت عائشہ ؓ اور حضرت حفصہ ؓ کو رسول کی خاک پر قربان کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت عمر ؓ کو اذن نہ ملا تو انھوں نے پکار کر کہا کہ ارشاد ہو تو حفصہ کا سر لے کر آؤں۔ آیت میں روئے سخن منافقین کی طرف ہے۔ یعنی اگر عائشہ ؓ و حفصہ ؓ سازش بھی کریں گی اور منافقین اس سے کام لیں گے تو خود پیغمبر کی اعانت کے لئے موجود ہے اور خدا کے ساتھ جبریل ؑ و ملائکہ بلکہ تمام عالم ہے۔

روایاتِ کاذبہ

ان واقعات میں کذابین رواۃ نے اس قدر تلبیسات اور خداعیاں کی ہیں کہ بڑے بڑے مورخین و ارباب سیر نے یہ روایتیں اپنی تصانیف میں اسناداً درج کر دیں، اس لئے ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔

اس قدر عموماً مسلّم ہے اور خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات ؓ کی خاطر

سے کوئی چیز اپنے اوپر حرام کرلی تھیں، اختلاف اس میں ہے کہ وہ کیا چیز تھی؟ بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ ایک کنیز تھیں جن کو عزیز مصر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحفۃً بھیجا تھا۔ ماریہ قبطیہ کی روایت تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے جن میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز جو حضرت حفصہؓ نے فاش کردیا تھا انہی ماریہ قبطیہ کا راز تھا، اگرچہ یہ روایتیں بالکل موضوع اور ناقابل ذکر ہیں لیکن چونکہ یورپ کے اکثر مورخوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معیارِ اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں ان کا گل سرسبد یہی ہیں اس لئے ان سے تعرض کرنا ضروری ہے۔ ان روایتوں میں واقعہ کی تفصیل کے متعلق اگرچہ نہایت اختلاف ہے لیکن اس قدر سب کا قدر مشترک ہے کہ ماریہ قبطیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موطوءۃ کنیزوں میں تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کی ناراضی کی وجہ سے ان کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔

حافظ ابن حجر شرح صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم میں لکھتے ہیں۔

ووقع عند سعید بن منصور باسناد صحیح الی مسروق قال حلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحفصۃ لا یقرب امتہ۔ الخ (ص ۵۰۳ ج ۸)

اور سعید بن منصور نے سند صحیح کے ساتھ جو مسروق تک منتہی ہوتی ہے یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی کہ اپنی کنیز سے مقاربت نہ کریں گے۔

اس کے بعد حافظ موصوف نے مسند (ہثیم بن کلیب) اور طبرانی سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے۔

وللطبرانی من طریق الضحاک عن ابن عباس قال دخلت حفصۃ بیتہا فوجدہ یطأ ماریۃ فعاتبتہ۔ (فتح الباری مطبوعہ مصر ج ۸ ص ۵۰۳)

اور طبرانی نے ضحاک کے سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت حفصہؓ اپنے گھر میں گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ماریہ کے ساتھ ہم بستر دیکھا اس پر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاتب کیا۔

ابن سعد اور واقدی نے اس روایت کو زیادہ بدنما پیرایوں میں نقل کیا ہے۔ ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں محض افترا۔ اور بہتان ہیں۔

علامہ عینی شرح صحیح بخاری باب النکاح جلد ۵ صفحہ ۸۴ ۵ میں لکھتے ہیں۔

والصحیح فی سبب نزول الآیۃ انہ فی قصۃ العسل لا فی قصۃ ماریۃ المروی فی غیر الصحیحین و قال النووی ولم تات قصۃ ماریۃ من طریق صحیح

اور آیت کی شانِ نزول کے باب میں صحیح روایت یہ ہے کہ وہ شہد کے واقعہ میں ہے۔ ماریہؓ کے قصہ کے باب میں نہیں ہے جو صحیحین کے سوا اور کتابوں میں مذکور ہے نووی نے کہا ہے کہ ماریہ کا واقعہ کسی صحیح طریقہ سے مروی نہیں ہے۔

یہ حدیث تفسیر ابن جریر، طبرانی، مسند ہثیم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ان کتابوں میں عموماً جس قسم کی رطب یابس روایتیں مذکور ہیں ہیں اُس کے لحاظ سے جب تک ان کی صحت کے متعلق کوئی خاص تصریح نہ ہو لائق التفات نہیں۔ حافظ ابن حجر نے ان میں ایک طریقہ کی توثیق کی ہے یعنی وہ روایت جس کے راوی اخیر مسروق ہیں، لیکن

فتح الباری تفسیر سورۂ تحریم۔

اولاً تو اس روایت میں ماریہ قبطیہ کا نام مطلق نہیں، صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی کنیز کے پاس نہ جاؤں گا اور وہ مجھ پر حرام ہے، اس کے علاوہ مسروق تابعی ہیں، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا، اس لئے یہ روایت اصولِ حدیث کی رُو سے منقطع ہے، یعنی اس کا سلسلۂ سند صحابی تک نہیں پہنچتا۔ اس حدیث کے ایک اور طریقہ کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں صحیح کہا ہے لیکن اس طریقہ کے ایک اور راوی عبدالملک رقاشی ہیں جن کی نسبت دارقطنی نے لکھا ہے۔

کثیر الخطاء فی الاسانید والمتون یحدث عن حفظہ

سندوں میں اور اصل الفاظِ حدیث میں بہت خطا کرتے ہیں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ ماریہ کی روایت صحاح ستہ کی کتاب میں مذکور نہیں ہے، یہ بھی تسلیم ہے کہ سورۂ تحریم کا شانِ نزول جو صحیح بخاری اور مسلم میں مذکور ہے (یعنی شہد کا واقعہ) قطعی طریقہ سے ثابت ہے۔ امام نوویؒ نے جو ائمہ محدثین میں سے ہیں صاف تصریح کی ہے کہ ماریہ کے باب میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں، حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے جن طریقوں کو صحیح کہا ان میں سے ایک منقطع اور دوسرے کا راوی کثیر الخطاء ہے۔ ان واقعات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روایت استناد کے قابل ہے۔

یہ بحث اصولِ روایت کی بناء پر تھی، درایت کا لحاظ کیا جائے تو مطلق کد وکاوش کی حاجت نہیں، جو رکیک واقعہ ان روایتوں میں بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً طبری وغیرہ میں جو جزئیات مذکور ہیں وہ ایک معمولی آدمی کی طرف منسوب نہیں کئے جاسکتے، نہ کہ اس ذاتِ پاک کی طرف جو تقدس و نزاہت کا پیکر تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

*

یعنی ماریہ کے نام سے اور مشہور لغو واقعات کے شمول کے ساتھ نہیں ورنہ نسائی باب الغیرۃ میں اس قدر مذکور ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے اصرار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لونڈی کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا لیکن اس کا ایک راوی مجروح ہے۔ تمت۔

غزوۂ تبوک

رجب ۹ھ مطابق نومبر ۶۳۰ء

تبوک ایک مشہور مقام ہے جو مدینہ اور دمشق کے وسط میں نصف راہ پر مدینہ سے چودہ منزل ہے۔
جنگِ موتہ کے بعد سے رومی سلطنت نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ غسانی خاندان جو شام میں رومیوں کے زیرِ اثر حکومت کر رہا تھا مذہباً عیسائی تھا اس لئے قیصرِ روم نے اسی کو اس مہم پر متعین کیا، مدینہ میں یہ خبریں اکثر مشہور ہوتی رہتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلاء کے واقعہ میں حضرت عمرؓ سے جب عتبان بن مالک نے دفعۃً آکر یہ کہا کہ "غضب ہو گیا" تو انھوں نے کہا کیوں خیر ہے؟ کیا غسانی آ گئے[1]۔
شام کے نبطی سوداگر مدینہ میں روغنِ زیتون بیچنے آیا کرتے تھے، انھوں نے خبر دی کہ رومیوں نے شام میں لشکرِ گراں جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں جمع کر دی ہیں۔ اس فوج میں لخم، جذام اور غسان کے تمام عرب شامل ہیں اور مقدمۃ الجیش بلقاء تک آ گیا ہے۔ مواہب لدنیہ میں طبرانی سے روایت نقل کی ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انتقال کیا اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں۔ اس بناء پر ہرقل نے چالیس ہزار فوجیں روانہ کیں[2]۔

بہر حال یہ خبریں تمام عرب میں پھیل گئیں اور قرائن اس قدر قوی تھے کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کی تیاری کا حکم دیا۔ سوء اتفاق یہ کہ سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں۔ ان اسباب سے لوگوں کو گھر سے نکلنا نہایت شاق تھا[3]، منافقین جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، ان کا پردہ فاش ہو چلا، وہ خود بھی جی چراتے تھے اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ،

لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ۔ گرمی میں نہ نکلو۔

سویلم ایک یہودی تھا، اُس کے گھر پر منافقین جمع ہوتے اور لوگوں کو لڑائی پر جانے سے روکتے[4]۔ چونکہ ملک پر رومیوں کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام قبائلِ عرب سے فوجیں اور مالی اعانت طلب کی، صحابہ میں سے حضرت عثمانؓ نے دو سو اوقیہ چاندی اور دو سو اونٹ پیش کئے[5]۔ اکثر صحابہ نے بڑی بڑی رقمیں لا کر حاضر کیں، تاہم بہت سے مسلمان اس بنا پر جانے سے رہ گئے کہ سفر کا سامان نہیں رکھتے تھے، یہ لوگ

[1] بخاری ذکر واقعہ ایلاء [2] مواہب لدنیہ (مع زرقانی ج ۳ ص ۲) [3] مارگولیس صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ حنین میں انصار مالِ غنیمت سے محروم رہے تھے اس لئے وہ بے دل ہو گئے تھے کہ ہم کیا لڑیں جب فوائدِ جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے لیکن یہ مارگولیس صاحب کا حسنِ ظن ہے (قرآن نے خود بتا دیا ہے تو قیاس کی کیا حاجت ہے) "س" [4] ابن ہشام [5] ابن سعد جزء المغازی صفحہ ۱۱۰ "س" [6] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۶۳ "س"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور اس درد سے روتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن پر رحم آیا، تاہم اُن کے چلنے کا کچھ سامان نہ ہو سکا۔ انہی کی شان میں سورۂ توبہ کی یہ آیتیں اتری ہیں۔

وَلَا عَلَی الَّذِیْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَیْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْیُنُهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا یَجِدُوْا مَا یُنْفِقُوْنَ۔ (توبہ-۱۲)

اور نہ ان لوگوں پر کچھ اعتراض ہے کہ جب تمہارے پاس آئے کہ ہم کو سواری دیجئے اور تم نے کہا کہ میرے پاس سواری کہاں ہے جس پر تم کو سوار کر سکوں تو وہ واپس گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ افسوس ہمارے پاس خرچ نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا جب آپ مدینہ سے تشریف لے جاتے تو کسی کو شہر کا حاکم مقرر فرما جاتے چونکہ اس غزوہ میں بخلاف اور معرکوں کے ازواجِ مطہراتؓ ساتھ نہیں گئی تھیں، اہلِ حرم کی حفاظت کے لئے کسی عزیزِ خاص کا رہنا ضرور تھا اس لئے اب کے یہ منصب جناب امیرؓ کو ملا، لیکن انہوں نے شکایت کی کہ آپ مجھ کو بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جاتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰؑ کے ساتھ تھی[1]۔

غرض آپ تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے نکلے جس میں دس ہزار گھوڑے تھے[2]۔ راہ میں وہ عبرتناک مقامات تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، یعنی قوم ثمود کے مکانات جو پہاڑوں میں تراش کر بنائے گئے تھے، چونکہ اس مقام پر عذابِ الٰہی نازل ہو چکا تھا، آپ نے حکم دیا کہ کوئی شخص یہاں قیام نہ کرے، نہ پانی پئے اور نہ کسی کام میں لائے۔

تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی لیکن اصلیت سے بالکل خالی بھی نہ تھی، غسانی رئیس عرب میں ریشہ دوانیاں کر رہا تھا، صحیح بخاری (غزوہ تبوک) میں جہاں حضرت کعبؓ بن مالک کا واقعہ مذکور ہے لکھا ہے کہ شام سے ایک قاصد آیا اور حضرت کعبؓ بن مالک کو رئیسِ غسان کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ میں نے سنا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمہاری قدر نہ کی، اس لئے تم میرے پاس چلے آؤ، میں تمہاری شان کے موافق تم سے برتاؤ کروں گا۔ حضرت کعبؓ معتوبِ نبوی تھے لیکن انھوں نے اس خط کو تنور میں ڈال دیا۔

تبوک پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس دن تک قیام کیا۔ ایلہ کا سردار جس کا نام یوحنا تھا، حاضرِ خدمت ہو کر جزیہ دینا منظور کیا، ایک سفید خچر بھی نذر میں پیش کیا۔ جس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ردائے مبارک عنایت فرمائی[3]۔ جرباء اور اذرح کے عیسائی بھی حاضر ہوئے اور جزیہ پر رضامندی ظاہر کی۔ دومۃ الجندل جو دمشق سے پانچ منزل پر ہے وہاں ایک عربی سردار جس کا نام اکیدر تھا، قیصر کے زیرِ اثر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو چار سو (بیس) کی جمعیت کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ حضرت خالدؓ نے اس کو گرفتار کیا اور اس شرط پر رہائی دی کہ خود دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر شرائطِ صلح پیش کرے، چنانچہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مدینہ میں

[1] صحیح بخاری غزوہ تبوک [2] طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۱۱۹ "س" [3] یہ مقام خلیج عقبہ کے پاس ہے (مارگولیس) [4] زرقانی بحوالہ ابن ابی شیبہ (ج ۳ صفحہ ۸۶) "س"

آیا، آپؐ نے اس کو امان دی۔

تبوک سے جب آپؐ واپس پھرے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگ عالمِ شوق میں استقبال کو نکلے، یہاں تک کہ پردہ نشینانِ حرم بھی جوش میں گھروں سے نکل پڑیں اور لڑکیاں یہ اشعار گاتی نکلیں۔[1]

طلع البدرُ علینا	من ثنیات الوداع	وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند طلوع ہوا۔
وجب الشکر علینا	ما دعا للّٰہ داع	جب تک خدا کا پکارنے والا کوئی دنیا میں باقی ہے ہم پر خدا کا شکر فرض ہے۔

مسجدِ ضرار

منافقین ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں میں کسی طرح پھوٹ ڈال دو۔ ایک مدت سے وہ اس خیال میں تھے کہ مسجد قبا کے توڑ پر وہیں ایک اور مسجد اس حیلہ سے بنائیں کہ جو لوگ ضعف یا کسی اور وجہ سے مسجد نبویؐ میں نہ پہنچ سکیں، یہاں آکر نماز ادا کر لیا کریں، ابو عامر جو انصار میں سے عیسائی ہو گیا تھا اس نے منافقین سے کہا کہ تم سامان کرو، میں قیصر کے پاس جا کر وہاں سے فوجیں لاتا ہوں کہ اس ملک کو اسلام سے پاک کر دوں۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک تشریف لے جانے لگے تو منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ ہم نے بیماروں اور معذوروں کے لئے ایک مسجد تیار کی ہے آپؐ چل کر اس میں ایک دفعہ نماز پڑھا دیں تو مقبول ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا اس وقت میں مہم پر جا رہا ہوں، جب تبوک سے واپس پھرے تو مالک اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ جا کر مسجد میں آگ لگا دیں، اسی مسجد کی شان میں یہ آیتیں اتری ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۚ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۔ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۚ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۔

(توبہ - ۱۳)

اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد ضرار اور پھوٹ ڈالنے اور کفر کی غرض سے تیار کی اور اس غرض سے کہ جو لوگ پہلے سے خدا اور رسولؐ سے لڑتے ہیں ان کو ایک کمین گاہ ہاتھ آئے اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف بھلائی کے لحاظ سے ایسا کیا اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ کہتے ہیں، محمدؐ! تو کبھی اس مسجد میں جا کر نہ کھڑا ہو وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تو اس میں نماز پڑھے، وہاں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی محبوب ہے اور خدا صفائی پسند کرنے والوں کو چاہتا ہے۔

حجِ اسلام اور اعلانِ برأت

(مکہ ۸ھ میں فتح ہوا لیکن چونکہ ابھی تک ملک میں اچھی طرح امن و امان قائم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس سال مشرکین ہی کے اہتمام سے ارکانِ حج انجام پائے مسلمانوں نے حضرت عتابؓ بن اسید کے ساتھ جو مکہ کے امیر مقرر ہوتے تھے، فریضۂ حج ادا کیا، اب ۹ھ پہلا موقع ہے کہ کعبہ کفر و شرک کی ظلمت سے پاک ہو کر عبادتِ ابراہیمی کا مرکز قرار پاتا ہے۔ غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ذیقعدہ یا ذوالحجہ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ سے حج کے لئے

---

(۱) زرقانی ج ۳ ص ۹۲ (س) (۲) زرقانی بحوالہ ابن جریر (ج ۳ ص ۹۱) (س)۔

روانہ فرمایا، ان میں حضرت ابوبکرؓ قافلہ سالار، حضرت علیؓ نقیبِ اسلام اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت جابرؓ، حضرت ابوہریرہؓ وغیرہم معلم تھے۔ قربانی کے لئے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) بیس اونٹ ساتھ تھے۔

قرآن نے اس حج کو حجِ اکبر کہا ہے[2] کہ یہ پہلا موقع تھا کہ رسمِ حج اصلی ابراہیمی سنت میں جلوہ گر ہوتی۔ اس حج کا مقصد یہ تھا کہ خانۂ خلیل میں عہدِ جاہلیت کے اختتام اور حکومتِ اسلام کی ابتداء کا اعلان کیا جائے۔ مناسک و رسومِ حج کی عام طور سے تعلیم دی جائے۔ زمانۂ جاہلیت کے رسوم و عادات کا ابطال کیا جائے۔

حضرت ابوبکرؓ نے مناسکِ حج کی لوگوں کو تعلیم دی، یوم النحر میں خطبہ دیا جس میں حج کے مسائل بیان کئے، اس کے بعد حضرت علیؓ کھڑے ہوئے۔ سورۂ برأت کی ۴۰ آیتیں پڑھ کر سنائیں اور اعلان کر دیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں نہ داخل ہو سکے گا۔ نہ کوئی برہنہ اب حج کرنے پائے گا اور وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے تھے، ان کے نقضِ عہد کے سبب سے آج سے چار مہینے کے بعد ٹوٹ جائیں گے، حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ نے اس اعلان کی اس زور زور سے منادی کی کہ گلا پڑ پڑ گیا۔[3] سورۂ برأت کی ابتدائی آیتیں جن میں خدا نے اس اعلان کا حکم فرمایا وہ یہ ہیں۔[4]

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۔ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۚ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا

اے مسلمانو! جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا اور انھوں نے معاہدہ توڑ دیا، ان کی خدا کی، خدا کے رسولؐ کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اب (اے معاہدہ شکن مشرکو!) چار مہینے کی تم کو مہلت ہے اس میں تم ملک میں چلو پھرو اور جان لو کہ تم خدا کو عاجز نہ کر سکو گے حجِ اکبر کے دن لوگوں کو اعلانِ عام ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان مشرکین کا اب ذمہ دار نہیں اگر (تم اے مشرکین!) توبہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر اب بھی پھرے رہو تو یقین کر لو کہ تم خدا کو ہرا نہ سکو گے۔ اے پیغمبر! تو کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دے لیکن وہ مشرکین جن سے تم نے معا-

---

(۱) بخاری کتاب المناسک باب لایطوف عریان، و باب حج ابی بکرؓ بالناس و تفسیر سورۃ البراءۃ۔ (س) (۲) سورۃ توبہ میں ہے یوم الحج الاکبر مصنف نے اس حج کو حجِ اکبر کہنے کی جو توجیہ لکھی ہے اس کو بھی گو بعض علماء نے اختیار کیا ہے لیکن عام خیال یہ ہے کہ خاص اسی سال کے حج کو حجِ اکبر نہیں کہا گیا ہے بلکہ ہر حج عمرہ کے مقابلہ میں حجِ اکبر ہے اور عمرہ حجِ اصغر ہے، ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۳ ص [illegible] (س)۔ (۳) ابن حنبل ص ۲۹۹ ج ۲، عام تفصیل زرقانی ج ۳ ص ۱۰۱ وغیرہ میں موجود ہے۔ (س) (۴) ان آیات میں یہ بیان ہے کہ مسجدِ حرام کے پاس (صلح حدیبیہ میں) جو معاہدے ہوئے تھے وہ ٹوٹ گئے، لیکن وہ معاہدے تو فتح مکہ سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے اور اس کے بعد کفار سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا، مصنف نے اس بنا پر اپنے ایک مکتوب ۲۰-۲-۱۳ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیتیں ۸ھ میں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی ہوں گی اور شاید اسی لئے مصنف نے یہ واقعات قلم انداز کر دیئے ہیں لیکن خاکسار جامع کا خیال یہ ہے کہ ممکن ہے کہ معاہدہ کے متعلق یہ آیتیں گو ۸ھ میں نازل ہوئی ہوں لیکن ان کا عام اعلان مع دیگر ضروری احکام کے جیسا کہ صحاح ستہ کے مستند روایات میں مذکور ہے ۹ھ کے موسمِ حج میں ہوا ہو۔ (س)

عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ (ع-۱)

کیا اور انہوں نے اس کے ایفا میں تمہارے ساتھ کچھ کمی نہ کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں انہوں نے تمہارے دشمنوں کی مدد کی تو ان کا معاہدہ کو تم پورا کرو، خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔ (رکوع ۴)

اے مسلمانو! مشرکین تو ناپاک ہیں، اب وہ اس سال کے بعد کعبہ کے قریب نہ آئیں۔

(طبری نے بواسطہ سدی روایت کی ہے کہ اس اعلان کے بعد کفار عام طور سے مسلمان ہو گئے[1])

واقعاتِ متفرقہ نو سال کے بعد اب ملک میں امن و امان کا دور شروع ہوا۔ اب حصول دولت کے مواقع حاصل تھے۔ اس بنا پر زکوٰۃ کا حکم اس سال نازل ہوا اور تحصیلِ زکوٰۃ کے لئے عمال قبائل میں مقرر ہوئے۔

اسلام کے سایہ میں بعض غیر مسلم قومیں بھی داخل ہو چکی تھیں ان کے جزیہ کی یہ آیت اتری۔

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (توبہ ۴)

تا آنکہ چھوٹے بن کر وہ جزیہ ادا کریں۔

سود کی تحریم بھی اسی سال نازل ہوئی اور اس کے ایک سال بعد ۱۰ھ میں حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلانِ عام فرمایا

نجاشی جس کے ظلِ حمایت میں مسلمانوں نے چند سال حبشہ میں بسر کئے، اس نے امسال انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وفات کا خود اعلان فرمایا کہ مسلمانو! آج تمہارے برادرِ صالح اصحمہ نے وفات پائی اس کے لئے دعائے مغفرت مانگو۔ اس کے بعد نجاشی کے لئے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔

*

(لے ج ۴ صہ ۱۸۲۱) تحق (۲لے طبری جلد ۴ صہ ۱۷۲۳) تمن

غزوات پر دوبارہ منظر

کتاب کا یہ حصہ سادہ سوانحِ زندگی پر محدود ہے۔ بحث و تدقیقات اور رفعِ شکوک کے لئے دوسرے حصے ہیں اس بنا پر مناسب یہ تھا کہ غزوات کے متعلق جو مباحث ہیں انہی حصوں میں لکھے جاتے، لیکن کتبِ سیر میں کثرت اور اہمیت دونوں حیثیتوں سے جو واقعات زیادہ تر نمایاں ہیں صرف غزوات ہیں، اگر صرف تصانیفِ سیرت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر سوانح عمری غزوات ہی کا نام ہے۔ چنانچہ پہلے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ سیرت نہیں بلکہ مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ مثلاً مغازی ابن عقبہ، مغازی ابن اسحاق مغازی واقدی، یہ اندازِ تحریر آج تک چلا آیا، اس لئے اگر یہ طرز بالکل بدل دیا جائے تو جو شخص کوئی قدیم تصنیف پہلے پڑھ چکا ہوگا وہ اس جدید تصنیف کو پڑھ کر سمجھے گا کہ سیرت کے بجائے کوئی اور چیز پڑھ رہا ہے، ان اسباب سے ہم کو بھی غزوات کو تفصیل سے لکھنا پڑا، لیکن غزوات کو پڑھ کر جو سوالات دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں، ان کو دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھنا ناظرین کے اضطراب کا باعث ہوگا۔

غیر مذہب والوں نے غزوات کے مقاصد اور اسباب کے سمجھنے میں سخت غلطیاں کی ہیں، نہ صرف بدنیتوں نے بلکہ نیک دلوں نے بھی، لیکن یہ تعجب کی بات نہیں، اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں۔

عرب اور جنگ و غارت گری اس باب میں سب سے مقدم اور سب سے اہم اس حقیقت کا معلوم کرنا ہے کہ عرب کی قومیت کو جنگ و غارت گری سے کیا تعلق ہے؟ ہر قوم کے اخلاق و عادات، رسوم و معاملات، محاسن و اوصاف، معائب و مثالب، غرض اس کی کل قومی زندگی کا ایک خاص اساس الامر ہوتا ہے کہ سب چیزیں اسی سے بنتی اور اسی سے نشو و نما پاتی ہیں، عرب میں یہ چیز جنگ و غارت گری تھی اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ عرب ایک ویران ملک تھا کسی قسم کی پیداوار وہاں نہیں ہوتی تھی، لوگ ان پڑھ اور جاہل تھے خورش اور پوشش کا قدرتی سامان صرف بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے کہ ان کا دودھ اور گوشت کھاتے اور بالوں کو بُن کر کمل بناتے تھے، لیکن یہ جائیداد بھی ہر شخص کو نصیب نہ تھی یا تھی تو بقدرِ ضرورت نہ تھی اس لئے حملہ اور غارت گری شروع ہوئی اور معاش کا سب سے بڑا بلکہ تنہا ذریعہ غارت گری قرار پایا، ابو علی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے۔

(وذلک انهم کانوا یکرهون ان تتوالی علیهم ثلاثة اشهر لا تمکنهم الاغارة فیها لان معاشهم کان من الاغارة)

(یہ اس لئے کہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ ان پر تین ماہ متواتر اس طرح گزر جائیں کہ وہ غارت گری نہ کر سکیں کیونکہ ان کی معاش کا ذریعہ یہی تھا)

چونکہ لوٹ میں زیادہ تر بکریاں ہاتھ آتی تھیں اور بکری کو عربی میں "غنم" کہتے ہیں، اس لئے لوٹ کے

لے کتاب الامالی ج اول صلا مطبوعہ مصر

مال کو عربی میں "غنیمت" کہنے لگے۔ اس لفظ نے پھر یہ وسعت حاصل کی کہ قیصر و کسریٰ کا تاج و تخت لٹ کر آیا تو اسی نام سے پکارا گیا، رفتہ رفتہ یہی لفظ عربی قوم، عربی زبان، عربی تاریخ کا سب سے زیادہ محبوب، سب سے زیادہ نمایاں سب سے زیادہ وسیع الاثر لفظ بن گیا۔ آج بھی ایک سلطان ایک رئیس، ایک شیخ القبائل اپنے عزیز و اقارب کو سفر کے وقت رخصت کرتا ہے تو کہتا ہے سالما غانما یعنی سالم آنا اور لوٹ کر لانا۔ ہماری زبان میں سب سے عزیز چیز کو جو "غنیمت" کہتے ہیں، مثلاً آپ کا تشریف لانا نہایت غنیمت ہے۔ یہ وہی لفظ ہے اور عربی زبان سے آیا ہے، عزت معاش کی وجہ سے تمام عرب میں غارت گری اور جنگ عام ہو گئی تھی تمام قبائل ایک دوسرے پر ڈاکہ ڈالتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ صرف حج کے زمانہ میں مذہبی خیال سے چار مہینے مخصوص کر دیئے تھے جن کو اشہر حرم کہتے تھے، ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں، لیکن متصل تین تین مہینہ تک معاش کا معطل رہنا سخت گراں تھا اس لئے نسی ایک رسم ایجاد کر لی تھی، یعنی ان مہینوں کو حسب ضرورت دوسرے مہینوں سے بدل لیتے تھے۔

حافظ ابن حجر صحیح بخاری کی شرح (تفسیر سورۂ توبہ) میں لکھتے ہیں۔

کانوا یجعلون المحرم صفرا یجعلون صفرا المحرم لئلا یتوالی علیھم ثلاثۃ اشھر لا یتعاطون فیھا القتال

وہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم کر دیا کرتے تھے تاکہ پے در پے تین مہینہ تک لڑائی سے محروم نہ ہو جائیں (ج۸ صہ۲۴۳)

ثار کا عقیدہ

لڑائی کا اصلی ابتدائی سبب یہ تھا، لیکن جب یہ سلسلہ چھڑا تو اور اور اسباب بھی پیدا ہو گئے اور یہ اسباب اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے اصلی سبب سے کم نہ تھے۔ ان میں سب سے مقدم اور شدید الاثر ثار کا قانون تھا، یعنی جب کسی قبیلہ کا کوئی شخص کسی موقع پر قتل ہو جاتا تھا تو مقتول کے قبیلہ کو اس کا انتقام لینا فرض ہو جاتا تھا، گو سینکڑوں برس گزر جاتے تھے اور قاتل بلکہ اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا تاہم جب تک قاتل کے قبیلے کے ایک آدمی کو قتل کر نہیں لیتا تھا قومی فرض سے ادا نہیں ہو سکتا تھا اسی کو ثار کہتے ہیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی قتل پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک مسلسل لڑائیاں قائم ہو جاتی تھیں۔ اسی طریقہ کے ابطال کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اعلان کیا تھا اور اپنے قبیلے کے قاتلوں کا خون معاف کر دیا تھا، لیکن صحرا نشین عربوں میں آج تک یہ طریقہ قائم اور ان کے قومی خصائص کا جزو اعظم ہے۔

ثار کے متعلق عجیب عجیب قسم کے معتقدات پیدا ہو گئے تھے، مثلاً یہ کہ مقتول جب مر جاتا ہے تو اس کی روح پرند بن جاتی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہیں لیا جاتا مقام قتل پر شور کرتی رہتی ہے کہ "مجھ کو پلاؤ میں پیاسی ہوں"، اس پرند کو صدیٰ یا ہام کہتے تھے۔ ابو دواد ایادی کہتا ہے۔

سلط الموت والمنون علیھم فلھم فی صدی المقابر ھام

ان پر موت مسلط ہو گئی اور مقبروں کے صدیٰ میں ان کے لئے ہام ہے۔

ذوالاصبع العدوانی کا شعر ہے۔

(۱) یہ مصنف کی ذاتی تحقیق ہے جس کی تائید کتب لغت سے اب تک نہیں آئی تھی۔

یا عمرو ان لا تدع شتمی و منقصتی اضربک حیث تقول الھامۃ اسقونی

اے عمرو! اگر تو مجھ کو گالی دینا اور میری تحقیر کرنا نہ چھوڑے گا تو میں تجھ کو اس طرح ماروں گا کہ ہامہ کہے گی کہ مجھ کو سیراب کرو۔

ایک یہ خیال تھا کہ جس مقتول کا انتقام نہیں لیا جاتا اس کی قبر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے۔ عمرو بن معدی کرب کی بہن مقتول کی زبان سے کہتی ہے۔

واترک فی قبر بصعدۃ مظلم

خون بہا لوگے تو میں اندھیری قبر میں پڑا رہوں گا۔

اسی بنا پر خون بہا لینے کو عیب سمجھتے تھے، اسی شاعرہ کا مصرع ہے۔

ومشوا باذان النعام المصلم

اور خون بہا لینا ہے تو بچہ شتر مرغ کا کان پکڑ کر چلے جاؤ

غیرت اور حمیت کی بنا پر اس بات کو عیب سمجھتے تھے کہ مقتول پر نوحہ کیا جائے۔

ولا تراھم وان جلت مصیبتھم مع البکاۃ علی من مات یبکونا

گو کتنی ہی بڑی مصیبت ہو لیکن ان کو مرنے والے پر روتا ہوا نہ دیکھو گے۔

عمرو بن کلثوم۔

معاذ الالہ ان ینوح نساءنا علی ھالک او ان نضج من القتل

خدا نہ کرے کہ ہماری عورتیں مقتول پر نوحہ کریں یا ہم قتل سے گھبرا جائیں

مقتول پر نوحہ کرتے تھے تو اس وقت کرتے تھے جب خون کا انتقام لے لیتے تھے،

من کان مسرورا بمقتل مالک فلیات نسوتنا بوجہ نھار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا وہ دن کو ہماری عورتوں کے پاس آئے۔

یجد النساء حواسرا یندبنہ یلطمن اوجھن بالاسحار

وہ دیکھے گا کہ عورتیں ننگے سر نوحہ کر رہی ہیں اور صبح کو اپنے چہروں پر دوہتر مار رہی ہیں۔

ایک خیال یہ تھا کہ جو شخص زخم کھا کر مرتا ہے اس کی روح زخم کی راہ سے نکلتی ہے، ورنہ ناک کی راہ سے نکلتی ہے اور یہ نہایت عیب سمجھا جاتا تھا۔ اسی بنا پر بیماری سے مرنے کو "حتف الانف" کہتے تھے یعنی ناک کی موت۔ اور ایسے مرنے کو نہایت عار سمجھتے تھے۔

وما مات منا سید حتف انفہ ولا طل منا حیث کان قتیل

ہمارا کوئی سردار ناک کی راہ سے نہیں مرا اور نہ ہمارے کسی مقتول کا خون بلا بدلہ ہوا۔

رفتہ رفتہ عرب کے تمام قومی مفاخر اور اخلاق و عادات کا اصلی محور جنگ بن گیا تھا، یعنی ان کے اوصاف و اخلاق میں جس چیز کا اصلی سبب تلاش کیا جائے یہی چیز نکلتی تھی، یہی چیز تھی جس نے ایک مدت تک قبائل عرب کو اسلام لانے سے باز رکھا، حضرت عمروؓ بن مالک جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے کہا، "بنو عقیل پر ہمارا ثار باقی ہے وہ لے لیں تو اسلام لائیں" چنانچہ اسی وقت بنو عقیل پر جو اسلام لا چکے تھے حملہ آور ہوئے اور خود حضرت عمروؓ بن مالک نے اس میں شرکت کی، گو پھر ان

کو بہت ندامت ہوئی کہ اُن کے ہاتھ سے ایک مسلمان مارا گیا۔[1]

لوٹ کا مال

چونکہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں لڑائیوں کی اصل بنیاد ضرورتِ معاش سے شروع ہوئی تھی اس لئے عرب کے نزدیک مالِ غنیمت سے زیادہ کوئی شے محبوب نہ تھی اور ذرائع معاش میں سب سے زیادہ حلال وطیب اسی کو سمجھتے تھے۔ یہ خیال اس قدر دلوں میں راسخ اور رگ وپے میں سرایت کر گیا تھا کہ اسلام کے بعد بھی ایک مدت تک قائم رہا اور جس طرح شارع نے ممنوعاتِ شرعیہ کو بتدریج حرام اور ممنوع کیا تھا، غنیمت کے متعلق نہایت تدریج اور آہستگی سے کام لینا پڑا۔

شراب کو جب شارع نے حرام کرنا چاہا تو پہلے یہ آیت اتری۔

یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ (بقرہ-۲۷)

لوگ تجھ سے شراب اور قمار کی بابت پوچھتے ہیں کہہ دے کہ دونوں میں بڑا گناہ ہے۔

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔

اللّٰهم بین لنا فی الخمر بیاناً شافیاً۔

اے خدا شراب کے متعلق ہم کو صاف احکام بتا۔

پھر یہ آیت اُتری۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى (نساء-۷)

نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔

چنانچہ نماز کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک شخص منادی پکارتا کہ کوئی شخص نشہ میں نماز کو نہ آئے، پھر یہ آیت اتری۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ (مائدہ-۱۰)

مسلمانو! شراب، جوا، انصاب، فال کے تیر یہ سب ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچو کہ غالباً تم فلاح پاؤ گے۔ شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ شراب اور قمار کے ذریعے تم لوگوں میں عداوت اور بغض ڈالے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے، تو تم باز آؤ گے۔

باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی حرمت کے متعلق اس قدر تاکید وتصریح کی ضرورت خیال کی کہ جس قسم کے برتنوں میں شراب پیتے تھے تڑوا دیئے، لوگوں نے عرض کی کہ شراب کا سرکہ بنالیں اس سے بھی منع فرمایا۔ ان سب باتوں پر بھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض لوگوں نے شرابیں پیں اور جب ان سے باز پرس کی گئی تو انھوں نے نیک نیتی سے کہا کہ نیک اور اچھے آدمیوں کے لئے شراب کہاں حرام ہے، قرآن مجید میں خود شراب کی حرمت کے بعد یہ تصریح موجود ہے۔

---

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمرو بن مالک (ج ۳ صـ۳۱) [2] مسند امام احمد بن حنبل مطبوعہ مصر (۱۲۰) صـ۵۳ وابوداؤد کتاب الاشربۃ باب تحریم الخمر-[illegible]

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا (مائدہ-۱۲)

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے انھوں نے جو کچھ کھایا (یعنی شراب پی) ان پر کچھ الزام نہیں۔

اس موقع پر بہت سے صحابہ موجود تھے، حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے؛ انھوں نے کہا یہ اُن صحابہ کی نسبت ہے جو شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے مر گئے، حضرت عمرؓ نے تصدیق کی اور ان لوگوں کو سزا دی۔ چنانچہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری میں مذکور ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ جب کوئی چیز زمانہ دراز سے رسم وعادت میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کے آثار اور مخفی نتائج مدتوں تک قائم رہتے ہیں اور غنیمت کا بھی یہی حال ہے۔

سب سے پہلے جنگِ بدر میں قبل اس کے کہ مالِ غنیمت یکجا جمع کیا جاتا، لوگ غنیمت میں مصروف ہو گئے اس پر یہ آیت اتری۔

لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (انفال-۹)

اگر خدا کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو جو کچھ لیا اس پر تم کو عذاب ہوتا۔

چنانچہ صحیح ترمذی تفسیر انفال میں یہ واقعہ بہ تصریح مذکور ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا تھا کہ جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا اس کا مال واسباب قاتل کو ملے گا، اس بنا پر لوگوں نے مسلوبہ مال کا دعویٰ کیا، جو صحابہ لڑے نہ تھے بلکہ علَم اور رایت کے محافظ تھے ان کا دعویٰ تھا کہ اس میں ہمارا بھی حق ہے۔ اس پر یہ آیت اُتری۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ (انفال-۱)

لوگ تجھ سے مالِ غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں کہہ دے غنیمت خدا اور رسول کی ہے۔

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ مجاہدین مالِ غنیمت کا خود دعویٰ نہیں کر سکتے، اس کی تقسیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہے جس طرح آپ چاہیں تقسیم فرمائیں۔ اس سے اتنا ہوا کہ لڑائیوں میں ہر شخص خود لوٹ کر جو چیز چاہتا تھا لے لیتا تھا، بند ہو گیا، لیکن میدانِ جنگ کے علاوہ اور موقعوں پر لوٹنا مدتوں موقوف نہیں ہوا۔ سنن ابی داؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے، بھوک کی سخت تکلیف ہوئی، اتفاقاً سامنے بکریاں نظر پڑیں، ان کو لوٹ لائے اور ذبح کر کے ہانڈیاں چڑھا دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ تشریف لائے اور کمان جو ہاتھ میں تھی اس سے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا کہ لوٹ کی چیز مردہ سے بڑھ کر حلال نہیں۔[1]

خیبر کی لڑائی سنہ ۷ھ میں ہوئی، اس وقت تک یہ حال تھا کہ امن کے بعد لوگوں نے یہودیوں کے جانور اور پھل لوٹ لئے، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت غصہ آیا، آپ نے تمام صحابہ کو جمع کیا اور فرمایا۔

ان اللّٰه تعالیٰ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اهل الکتاب الا باذن ولا ضرب نسائهم ولا اکل

خدا نے تم لوگوں کے لئے یہ نہیں جائز کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ مگر بہ اجازت، اور نہ یہ کہ ان کی عورتوں

---

[1] سنن ابی داؤد باب النفل [2] کتاب الجہاد باب فی النہی من النہبی۔

ثمارهم اذا اعطوكم الذى عليهم (سنن ابى داؤد باب تعشير الذمة اذا اختلفوا فى التجارة) — کو مار ڈالو نہ یہ کہ ان کے پھل کھا جاؤ، جب کہ وہ تم کو ادا کریں جو ان پر فرض ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ غنیمت کے ساتھ لوگوں کا جو شغف ہے کم ہو جائے، لیکن مدت تک غنیمت کی محبت اور وارفتگی نہ گئی۔ غزوہ اُحد میں صرف اس وجہ سے شکست ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ تیراندازوں کو سخت تاکید فرما دی تھی کہ گو لڑائی کی کچھ حالت ہو تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، تاہم جب فتح ہوئی تو لوگ بے اختیار لوٹ میں مصروف ہو گئے۔ ان کا ہٹنا تھا کہ دشمن نے موقع پا کر پشت کی طرف سے حملہ کر دیا۔ حنین میں بھی شکست کی اصل وجہ یہی تھی کہ قبل از وقت لوگوں نے غنیمت لوٹنی شروع کر دی تھی۔

"غنیمت" اس قدر محبوب تھی کہ بعض صاحبوں کو کسی کافر کے مسلمان ہونے پر اس بنا پر رنج ہوا کہ اسلام لانے کی وجہ سے اس کا مال نہ مل سکا۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے ایک سریہ میں حملہ کرنا چاہا۔ قبیلہ والے روتے ہوئے آئے۔ انہوں نے کہا لا الٰہ الا اللہ کہو تو تمہاری جان اور مال بچ جائے گا۔ انہوں نے کہا لا الٰہ الا اللہ اور ان کو امن دے دیا گیا۔ جب یہ اپنے ساتھیوں میں آئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ،

احرمتنا الغنيمة۔ — تم نے ہم کو غنیمت سے محروم کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب یہ لوگ گئے تو آپ نے ان صحابی کی تحسین کی اور فرمایا کہ تم کو ایک ایک آدمی کے بدلے (جس کو تم نے چھوڑ دیا) اس، اس قدر ثواب ملے گا۔[1]

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ مدت تک لوگ یہ سمجھا کئے کہ غنیمت حاصل کرنا ثواب کا کام ہے۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ایک شخص جہاد پر جانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کچھ مال ہاتھ آئے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ یہ جواب انہوں نے اگر لوگوں سے بیان کیا تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور ان سے کہا کہ تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب نہیں سمجھا، پھر جا کر پوچھو۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا اور وہی جواب ملا۔ لوگوں نے پھر ان کو بھیجا، اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔[2]

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں۔

وحشیانہ افعال

عرب میں لڑائیوں کی شدت اور وسعت نے نہایت وحشیانہ رسمیں قائم کر دی تھیں جن میں سے چند کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) اسیران جنگ کو جب قتل کرتے تھے تو چھوٹے چھوٹے بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کرتے تھے بلکہ آگ میں جلا دیتے تھے۔[3]

(۲) غفلت یا نیند کی حالت میں دفعۃً دشمن پر جا پڑتے تھے اور قتل و غارت گری شروع کر دیتے تھے، یہ طریقہ

[1] ابو داؤد باب ما یقول اذا اصبح، کتاب الادب [2] سنن ابی داؤد کتاب الجہاد باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا [3] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران ص ۳۴۲۔

عام اور کثرت سے رائج تھا، بہت سے بہادر اس خاص طریقہ میں زیادہ ممتاز تھے اور ان کو فاتک یا فتاک کہتے تھے، تابط شرا، سلیک، ابن السلکہ اسی قسم کے لوگ تھے۔

(۳) زندوں کو آگ میں جلا دیتے تھے، عمرو بن ہند (جو عرب کا ایک بادشاہ تھا) کے بھائی کو جب بنو تمیم نے قتل کر دیا تو اس نے منت مانی کہ ایک کے بدلے سو آدمیوں کو قتل کروں گا، چنانچہ بنو تمیم پر حملہ کیا، وہ لوگ بھاگ گئے صرف ایک بڑھیا رہ گئی تھی جس کا نام حمراء تھا اس کو گرفتار کر کے زندہ آگ میں ڈال دیا۔ اتفاق یہ کہ ایک سوار جس کا نام عمار تھا آنکلا، عمرو نے پوچھا تو کیوں آیا؟ اس نے کہا میں کئی دن کا بھوکا تھا۔ دھواں اٹھتے دیکھا تو سمجھا کھانا ہوگا۔ عمرو نے حکم دیا کہ وہ بھی آگ میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ جریر نے اپنے شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

واخزاكم عمرو كما قد خزيتم   وادرك عمارا شقى البراجم

(۴) بچوں کو نشانہ بنا کر تیروں سے مارتے تھے۔ داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنو ذبیان کے پاس اپنے بچے ضمانت کے طور پر رکھے تھے۔ حذیفہ نے جو بنو ذبیان کا رئیس تھا ان بچوں کو لے جا کر ایک وادی میں کھڑا کیا اور ان کو نشانہ بنا کر تیر اندازی کرتا تھا۔ اتفاق سے کوئی لڑکا نہ مرا تو دوسرے دن پر اٹھا رکھا جاتا تھا چنانچہ دوسرے دن یہ تفریح انگیز جاندماری پھر شروع ہوتی تھی، اور لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے۔[1]

(۵) قتل کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتا، غطفان اور عامر کی لڑائی میں اسی خوف سے حکم بن الطفیل نے اپنے آپ کو خود گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا جیسا کہ عقد الفرید میں بہ تفصیل مذکور ہے۔

عرینہ کے لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بظاہر اسلام لا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام کو پکڑ لے گئے تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے، پھر ان کی آنکھوں اور زبان میں کانٹے چبھوئے یہاں تک کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے۔[2]

(۶) مرنے کے بعد بھی انتقام کا جوش طرح طرح کی نفرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا، مردوں کے ہاتھ پاؤں کان، ناک وغیرہ کاٹ لیتے تھے، ہندہ نے جنگ اُحد میں اسی رسم کے موافق حضرت حمزہؓ اور دیگر شہداء کے اعضا کاٹ کر ہار بنایا اور گلے میں پہنا تھا۔

(۷) منت مانتے تھے کہ دشمن پر قابو ہاتھ آئے گا تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔ سلافہ کے دو بیٹے جنگ اُحد میں عاصم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ اس بنا پر سلافہ نے منت مانی کہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پیئے گی۔[3] یہ بھی معمول تھا کہ مقتول کا کلیجہ نکال کر کھا جاتے تھے، ہندہ نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا لیا تھا اس کا حال اوپر گزر چکا ہے۔

[1] مجمع الامثال ص ۲۰۰ [2] یہ واقعہ تمام کتب حدیث میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم اول ص ۶۷ سے ماخوذ ہے، مسلم میں صرف آنکھوں کا اندھا کرنا مذکور ہے [3] طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۳۱ (سریہ مرثد بن ابی مرثد) تک۔

(۸) حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر ڈالتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ عامر بن طفیل عرب کا مشہور بہادر اور رئیس ہوازن کہتا ہے،

بقرنا الحبالی من شنوءة بعد ما خبطن بعنیف الرمح نهداه خثعما

غزوات نبویؐ کے اسباب اور انواع تفصیل مذکورۂ بالا کے بعد اب ہم اس واقعہ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ غزوات نبویؐ کن اسباب سے وجود میں آئے۔ اور شارع علیہ السلام نے طریقۂ قدیم میں کیا اصلاحیں فرمائیں۔ مورخین نے "غزوہ" کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ امن و امان قائم رکھنے کے لئے دو چار آدمی بھی کہیں بھیج دیئے گئے تو اس کو بھی انھوں نے غزوہ میں شمار کر لیا۔ غزوہ کے علاوہ ایک اور لفظ ہے یعنی "سریہ"۔ غزوہ اور سریہ میں لوگوں کے نزدیک یہ فرق ہے کہ غزوہ میں کم سے کم آدمیوں کی ایک خاص تعداد ضروری ہے، سریہ میں کوئی قید نہیں، ایک آدمی بھی کہیں لڑائی کی دیکھ بھال کو بھیج دیا گیا تو یہ بھی سریہ ہے، بعضوں کے نزدیک غزوہ کے لئے یہ شرط ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اس میں شرکت کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جن واقعات کو مورخین سریہ کہتے ہیں، وہ چند قسموں پر منقسم ہے۔

(۱) محکمۂ تفتیش یعنی دشمنوں کی نقل و حرکت کی خبر رسانی۔

(۲) دشمنوں کے حملہ کی خبر سن کر مدافعت کے لئے پیش قدمی کرنا۔

(۳) قریش کی تجارت کی روک ٹوک تاکہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو حج و عمرہ کی اجازت دیں۔

(۴) امن و امان قائم کرنے کے لئے تعزیری فوجیں بھیجنا۔

(۵) اشاعت اسلام کے لئے لوگ بھیجے گئے اور حفاظت کے خیال سے کچھ فوج ساتھ کر دی گئی، اس صورت میں تاکید کر دی جاتی تھی کہ تلوار سے کام نہ لیا جائے۔

غزوہ کی صرف دو صورتیں تھیں۔

(۱) دشمنوں نے دارالاسلام پر حملہ کیا، اور ان کا مقابلہ کیا گیا۔

(۲) یہ معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں اور پیش قدمی کی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو لڑائیاں واقع ہوئیں یا اس قسم کے جو واقعات پیش آئے انہی مختلف اغراض سے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے چلے آئے تو قریش نے فیصلہ کیا کہ اسلام کو مٹا دیا جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اسلامی تحریک قائم رہی تو ایک طرف اُن کے مذہب کو صدمہ پہنچے گا، دوسری طرف تمام عرب میں ان کا جو تفوق اور اثر اور مرجعیت عام ہے سب جاتا رہے گا۔ اس بنا پر ایک طرف تو قریش نے خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں اور دوسری طرف تمام قبائل عرب کو بھڑکایا کہ یہ نیا گروہ اگر کامیاب ہو گیا تو تمہاری آزادی بلکہ ہستی بھی فنا ہو جائے گی۔

۱؎ یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ یہ بحث تمام تر تاریخی حیثیت سے ہے جہاد کی اصل حقیقت پر بحث کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گی۔

بیعت عقبہ میں جب انصار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو ایک انصاری نے کہا۔ برادران من! جانتے ہو کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم سے اعلان جنگ ہے۔ اوپر ہم مسند دارمی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو تمام عرب مدینہ پر حملہ کے لئے تیار ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدینہ میں مہاجرین اور انصار رات کو سوتے تھے تو ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔ اوپر گزر چکا ہے (بحوالہ ابوداؤد)[1] کہ قریش نے عبداللہ ابن ابی کو پیغام بھیجا تھا کہ محمدؐ کو وہاں سے نکال دو ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمدؐ دونوں کا فیصلہ کر دیں گے۔

محکمۂ تفتیش ان واقعات کی بنا پر ضرور تھا کہ اسلام اور دارالاسلام کی حفاظت کے لئے ضروری تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس سلسلہ کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ خبر رسانی اور جاسوسی کا انتظام وسیع پیمانہ پر کیا جائے چنانچہ ابتداء ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انتظام پر توجہ کی۔ وقتاً فوقتاً کثرت سے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنا کر مختلف مقامات پر بھیجتے رہتے تھے۔ یہ ٹکڑیاں گو محض خبر رسانی کے لئے جاتی تھیں، لیکن حفاظت کی غرض سے مسلح اور جمعیت کی صورت میں جاتی تھیں۔

یہی واقعات ہیں جن کو مورخین "سرایا" سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس کا مقصد کسی قافلہ کا لوٹنا یا کسی جماعت پر بے خبری کی حالت میں جا پڑنا ہوتا تھا۔ ایک بڑا قرینہ اس بات کا کہ ان دستوں کے بھیجنے سے حملہ کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا یہ ہے کہ دستے اکثر دس دس، بارہ بارہ آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے اور ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے سے آدمی لڑنے کے لئے نہیں بھیجے جا سکتے تھے مثلاً ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ مکہ کی طرف بھیجا اور ایک سربمہر تحریر دی کہ دو دن کے بعد اس خط کو کھولنا دو دن کے بعد انہوں نے کھولا تو اس میں یہ الفاظ تھے،

فسر حتی تنزل نخلة بين مكة والطائف	برابر چلے جاؤ، یہاں تک کہ نخلہ میں جاکر ٹھہرو جو مکہ اور
فترصد بها قريشا و تعلم لنا من اخبارهم	طائف کے بیچ میں ہے اور قریش کی دیکھ بھال کرتے رہو اور
(طبری صفحہ ۱۲۷۴)	ان کی خبریں دریافت کرو۔

مدافعت اس انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کوئی مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا تو فوراً خبر ہو جاتی اور پیش دستی کر کے فوجیں بھیج دی جاتیں۔ اکثر سرایا اسی قسم کے تھے اور چونکہ ہم سرایا کا ذکر زیادہ تر قلم انداز کر آئے ہیں اس لئے مثال کے طور پر چند سرایا کا ذکر کرتے ہیں اور قدمائے اہل سیر کی تصریحات سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ مہمیں مدافعت کی غرض سے تھیں۔

سریۂ غطفان

وذلك انه بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم ان	اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی
جمعا من بنی ثعلبة و محارب بذی امر قد	کہ قبیلہ بنو ثعلبہ اور محارب کی ایک فوج ذو امر میں اس

۱؎ باب فی خبر النضیر ۲؎ سریہ ابن جحش

تجمعوا یریدون ان یصیبلوا من اطراف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم جمعہم رجل منہم یقال لہ دعثور بن الحارث الخ (طبقات ص۲۳)

غرض سے جمع ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حملہ کرے، اس فوج کو ایک شخص نے فراہم کیا جس کا نام دعثور ہے۔

سریہ ابوسلمہ ۲ھ

وذلك انہ بلغ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان طلیحہ وسلمۃ ابنی خویلد قد سارا فی قومہما ومن اطاعہما یدعونہم الی حرب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الخ (ابن سعد ص۳۵)

اس سریہ کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ طلیحہ اور سلمہ (پسران خویلد) دونوں اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔

سریہ عبداللہ بن انیس بہ غرض قتل سفیان بن خالد ۳ھ

وذلك انہ بلغ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان سفیان بن خالد الھذلی ثم اللحیانی وكان ینزل عرنۃ وما والاھا فی ناس من قومہ وغیرھم قد جمع الجموع لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔

ابن انیس اس لئے بھیجے گئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ سفیان بن خالد اپنے قبیلہ کو اور باہر کے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے جمع کر رہا ہے۔

غزوہ ذات الرقاع

فاخبر اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان انمار وثعلبۃ قد جمعوا لھم الجموع ..... فمضی۔

ایک جاسوس نے آکر صحابہ کو اطلاع کی کہ انمار اور ثعلبہ نے مسلمانوں سے لڑنے کیلئے فوجیں جمع کر رہے ہیں، آپ چل کھڑے ہوئے۔

غزوۂ دومۃ الجندل

قالوا بلغ رسول اللّٰہ علیہ وسلم ان بدومۃ الجندل جمعا کثیرا وانہم یریدون ان یدنوا من المدینۃ (ابن سعد ص۴۴)

رواۃ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں ایک گروہ کثیر جمع ہے اور مدینہ پر بڑھنا چاہتا ہے۔

غزوۂ مریسیع ۵ھ

ان بنی المصطلق من خزاعۃ وھم من حلفاء بنی مدلج وكان راسہم وسیدھم الحارث بن ابی ضرار فسار فی قومہ ومن قدر علیہ من العرب فدعاھم الی حرب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاجابوہ (ابن سعد ص۴۵)

قبیلہ بنو مصطلق خزاعہ کی شاخ ہے اور یہ لوگ بنو مدلج کے حلیف ہیں اور ان کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا وہ اپنی قوم کو اور نیز اور لوگوں کو جو اس کے قابو میں تھے لے کر چلا اور لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کی دعوت دی اور لوگوں نے منظور کی۔

سریہ علی بن ابی طالب بہ طرف فدک ۶ھ

بلغ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان لہم جمعا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بنو سعد فدک میں یہود

یریدون ان یمدوا یہود خیبر۔

خیبر کی کمک کے لئے فوج جمع کر رہے ہیں۔

سریہ بشیر بن سعد، شوال ۷ھ

بلغ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان جمعا من غطفان بالجناب قد واعدھم عیینۃ بن حصن لیکون معہم لیزحفوا الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ غطفان کا ایک گروہ مقام جناب میں جمع ہے اور ان سے عیینہ بن حصن نے وعدہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہوگا۔

سریہ عمرو بن العاص ذات سلاسل ۸ھ۔ یہ مقام مدینہ سے ۸ منزل ہے۔

بلغ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان جمعا من قضاعۃ قد تجمعوا یریدون ان یدنوا الی اطراف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ قضاعہ کا ایک گروہ جمع ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھے۔

قریش کی تجارت کی روک ٹوک بخاری کے حوالہ سے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ قریش اور مسلمانوں میں جنگ چھڑنے سے پہلے، ابوجہل نے حضرت معاذ انصاری سے کعبہ میں یہ کہا تھا کہ اگر تم لوگ محمدؐ کو نکال نہ دوگے تو تم کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے۔ انہوں نے جواب دیا تھا کہ تم نے اگر ہم کو کعبہ میں آنے سے روکا تو ہم تمہاری شام کی تجارت روک دیں گے (مکہ سے شام کو جو قافلہ جاتا تھا مدینہ اس کی راہ میں پڑتا تھا) کعبہ مسلمانوں کی خاص چیز تھی، کیونکہ کعبہ جس نے تعمیر کیا تھا مسلمان اسی کے دین ابراہیمی کے پیرو تھے، باوجود اس کے قریش نے مسلمانوں کو عموماً حج اور عمرہ سے روک دیا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا کاروان تجارت روک دیا جائے کہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو کعبہ کے اندر جانے کی اجازت دے دیں۔

بعض سرایا قبل حدیبیہ سرایا کے ذکر میں اکثر جگہ اہل سیر لکھتے ہیں کہ تعرض لعیر قریش۔ یعنی اس لئے فوجیں بھیجی گئیں یا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے کہ کاروان قریش کی روک ٹوک کی جائے۔ یہ تمام مہمات اسی غرض کے لئے تھیں لیکن چونکہ قریش تجارت کے لئے بھی ہتھیار بند ہو کر نکلتے تھے اور کم از کم سو دو سو کی جمعیت ساتھ لے کر جاتے تھے، اس لئے روک ٹوک میں کبھی کبھی مقابلہ پیش آجاتا تھا اور جب قریش شکست کھا کر بھاگ جاتے تھے تو مال تجارت غنیمت میں ہاتھ آتا تھا۔ اہل سیر غلطی سے ان واقعات کو اس پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا ہی اصلی مقصد تھا۔

یہی روک ٹوک تھی جس کی بناء پر قریش نے بالآخر حدیبیہ کی صلح کر لی، جس کی رو سے مسلمانوں کو چند خاص پابندیوں کے ساتھ حج کی اجازت مل گئی۔ قریش پر کاروان تجارت کی روک ٹوک کا اس قدر اثر پڑتا تھا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے مکہ میں جب اپنے اسلام کا اعلان کیا اور قریش نے اس جرم میں ان کو مارنا پیٹنا شروع کیا تو حضرت عباسؓ نے کہا کہ غفار کا قبیلہ تمہارے کاروان تجارت کے سرراہ واقع ہے، تمہاری اس حرکت سے برہم ہو کر وہ راستہ نہ روک دے۔ یہ تدبیر پوری کارگر ہوئی اور انہوں نے ڈر کر حضرت ابوذرؓ کو چھوڑ دیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد قریش کی خواہش کے مطابق جب یہ طے ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے نومسلموں کو واپس دے

دیں گے اور ان نومسلموں نے مکہ سے بھاگ کر شام کی راہ میں اپنا ایک مستقر قائم کر لیا اور قریش کی تجارت کی راہ کو غیر مامون کر دیا) تو قریش نے بالآخر اجازت دے دی کہ جو مسلمان چاہے مکہ سے مدینہ چلا جائے، ان کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی (پھر آئندہ سال انھوں نے مسلمانوں کو حج وعمرہ کی اجازت بھی دے دی، اس کے بعد پھر کبھی مسلمانوں نے قریش کے کاروانِ تجارت سے تعرض نہیں کیا، بلکہ خود اس کی حفاظت کے لئے فوج بھیجتے تھے۔)

امن وامان قائم کرنا اوپر گزر چکا ہے کہ عرب میں اِس سرے سے اُس سرے تک مطلق امن وامان نہ تھا، تمام قبائل باہم لڑتے رہتے تھے، یہاں تک کہ محترم مہینوں میں بھی بہانے نکال کر مہینوں کے نام بدل دیتے تھے اور لڑتے تھے۔ تجارت بالکل غیر محفوظ تھی، قافلوں کا لوٹ لینا عام بات تھی جیسا کہ بدقسمتی سے آج بھی بدو قافلوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اس لئے بھیجا تھا کہ نہ صرف وعظ وپند بلکہ دست وبازو سے بھی تمام عرب بلکہ تمام دنیا میں امن وامان قائم کریں۔ کیونکہ خون ریزی اور قتل سے زیادہ کوئی چیز خدا کو ناپسند نہیں۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (مائدہ۔ ۵)

اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے ایک جان کو بغیر معاوضہ (یا زمین میں فساد) کے قتل کر دیا اس نے تمام عالم کو قتل کر دیا۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (بقرہ۔ ۲۵)

اور جب وہ پھر کر جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

اِنَّمَا جَزٰۗؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُـقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ۔ (مائدہ۔ ۵)

جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کر دیئے جائیں یا پھانسی دیئے جائیں یا ان کا ایک ہاتھ اور دوسرے طرف کا پاؤں کاٹ ڈالا جائے یا جلا وطن کر دیئے جائیں۔

احادیث میں ہے کہ جب حضرت عدیؓ (حاتم طائی کے بیٹے) اسلام لاتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک شتر سوار صنعاء سے لے کر حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا یا بھیڑیئے کے سوا کہ اس کی بکریاں نہ اٹھا لے جائے، اور کسی کا ڈر نہ ہوگا۔[1] یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں، صحیح بخاری میں ہے[2] کہ خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک عورت حیرہ سے چلے گی اور آ کر کعبہ کی زیارت کرے گی اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی

---

[1] فتح الباری جلد ۸ ص ۱۲ [2] صحیح بخاری باب ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ من المشرکین بمکۃ۔ [3] باب علامات النبوۃ۔

آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کر کے حرم تک آتی ہے اور اس کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔[3]

بہت سے واقعات ہیں جن کو اہل سیر سرایا میں شمار کرتے ہیں، وہ محض تجارت کی آزادی اور عام امن وامان قائم کرنے کی غرض سے تھے، دو تین مثالیں ہم درج کرتے ہیں۔

سریہ زید بن حارثہ ۶ھ میں حضرت زیدؓ مال تجارت لے کر شام گئے، واپس آتے ہوئے جب وادی قریٰ کے قریب پہنچے تو بنو فزارہ کے لوگوں نے آ کر ان کو مارا پیٹا اور تمام مال واسباب چھین لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تدارک کے لئے تھوڑی سی فوج بھیجی، جس نے ان لوگوں کو سزا دی۔[1]

اسی سال میں اس سے پہلے حضرت دحیہ کلبیؓ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خط دے کر قیصر کے پاس بھیجا تھا، شام سے واپس آ رہے تھے۔ جب حسمیٰ پہنچے تو ہنید نے چند آدمیوں کے ساتھ ان پر ڈاکہ ڈالا اور جو کچھ ان کے پاس تھا سب چھین لیا، صرف بدن کے کپڑے (وہ بھی جو پرانے اور پھٹے تھے) چھوڑ دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تدارک کے لئے حضرت زیدؓ کو بھیجا۔[2]

۵ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں جو مدینہ منورہ سے شام کی جانب پندرہ منزل پر ہے ایک بڑا گروہ جمع ہو گیا ہے جو تاجروں کو ستاتا ہے اس کے تدارک کے لئے آپ خود تشریف لے گئے۔ مجمع منتشر ہو چکا تھا، لیکن آپ نے چند روز تک وہاں قیام کیا اور انتظام کے لئے تمام اطراف میں فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بھیج دیں۔[3]

(یہ حالت کچھ مسلمان تاجروں کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد کفارِ قریش کے کاروانِ تجارت کی بھی اسی طرح حفاظت کی جاتی تھی۔

سریہ خبط یا سیف البحر ۸ھ میں قریش کا کاروانِ تجارت شام سے واپس آ رہا تھا۔ قبیلۂ جہینہ کی طرف سے اطمینان نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کی سرداری میں تین سو مسلمانوں کی جمعیت جس میں حضرت عمرؓ بھی داخل تھے، مدینہ سے ۵ دن کی مسافت پر روانہ فرمایا۔ مسلمانوں نے اس فرض کو اس طرح انجام دیا کہ کھانے کو کچھ نہ رہا تو ایک ایک چھوہارے پر دن بھر گزار دیا۔[4]

صحیح مسلمؔ میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے لیکن اس سریہ کی غرض مختلف راویوں نے مختلف بیان کی ہے اصل راوی حضرت جابرؓ ہیں جو اس واقعہ میں شریک تھے، ایک روایت میں ہے کہ جہینہ سے لڑنے کو مہم بھیجی گئی تھی (کتبِ مغازی میں بھی یہی مذکور ہے۔ دوسری روایتوں کے الفاظ یہ ہیں۔

(۱) نتلقی عیر قریش۔ قافلۂ قریش سے ملنے کے لئے (۲) نرصد عیر قریش۔ قافلۂ قریش کی دیکھ بھال کے لئے۔

اس سے مقصود عام طور سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ قافلۂ قریش کے لوٹنے کے لئے، لیکن یہ صریح غلطی

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۶۵، جلد غزوات [2] ابن سعد ص ۶۳ [3] ایضاً ص ۴۴ جلد غزوات [4] ابن سعد جزء مغازی سریۂ خبط [5] صحیح مسلم باب اصابۃ عنبرۃ البحر، صحیح بخاری باب غزوۂ سیف البحر میں بھی یہ روایتیں ہیں۔

ہے کیونکہ یہ زمانہ تو صلح حدیبیہ کا تھا، اس بنا پر ان الفاظ کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ مہم قافلۂ قریش کی حفاظت اور جہینہ کو روکنے کے لئے بھیجی گئی تھی، حافظ ابن حجر کی بھی یہی تحقیق[1] ہے۔

غزوۂ غابہ عرب کی جسارت اور رہزنی کی عادت کا یہ حال تھا کہ اگرچہ ہر دفعہ ان کو سخت سے سخت سزائیں ملتی تھیں، تاہم وہ کسی طرح جرائم سے باز نہیں آتے تھے، یہاں تک کہ غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا ڈاکے ڈالتے تھے، ۶ھ میں قبیلۂ فزارہ کی آبادی میں قحط پڑا، عیینہ بن حصن جو یہاں کا رئیس تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط کرم سے اس کو اجازت دی کہ اسلامی حدود میں جو سیراب تھے مویشی چرائے، لیکن ۶ھ میں اسی عیینہ نے غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا حملہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس اونٹنیاں لوٹ لیں، حضرت ابوذرؓ کے بیٹے جو چراگاہ کے محافظ تھے ان کو قتل کر دیا چنانچہ ارباب سیر اس واقعہ کو غزوۂ غابہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

عرب کا تمام ملک جو اسلام کا دشمن ہو گیا اور اخیر فتح مکہ تک کفار سے جو لڑائیاں جاری رہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ عرب کی معاش کا بڑا ذریعہ رہزنی، قطاع الطریق اور قتل و تاراج تھا، اسلام ان چیزوں کو مٹاتا تھا اس لئے عرب اسلام سے بڑھ کر کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھ سکتے تھے۔

بے خبری میں حملہ کرنے کا سبب عرب کے قبائل دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو کسی خاص مقام پر مستقل سکونت رکھتے تھے، دوسرے وہ جو خیمہ نشین اور بادیہ گرد تھے، ان کا کوئی خاص مستقر نہ تھا، جہاں چشمہ یا سبزہ زار دیکھا خیمے ڈال دیئے۔ جب وہاں بھی پانی نہ رہا تو خبر رساں کسی اور مقام کی خبر لاتے اور وہاں چل دیتے۔ ان قبائل کو عربی میں اصحاب الوبر کہتے ہیں۔ زیادہ تر جو قبائل ڈاکے ڈالا کرتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے اسی قسم کے قبائل تھے۔ ان کا انتظام اور ان کی روک ٹوک سخت مشکل تھی۔ ان کی تعزیر کے لئے فوجیں جاتی تھیں تو یہ پہاڑوں پر بھاگ جاتے تھے اور قابو میں نہیں آتے تھے اس لئے مجبوراً جو فوجیں ان پر بھیجی جاتی تھیں، غفلت میں بھیجی جاتی تھیں کہ وہ بھاگ نہ جانے پائیں۔

اکثر سرایا کے بیان میں اہل سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فوجیں بھیجیں جو راتوں کو چلتی تھیں اور بے خبری کی حالت میں موقع پر پہنچ کر حملہ کرتی تھیں اور قبائل کو لوٹ لیتی تھیں، اس قسم کے واقعات تمام کتابوں میں کثرت سے منقول ہیں اور انہی واقعات سے یورپ کے لوگوں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ اسلام نے دشمن پر ڈاکہ ڈالنا اور لوٹ مار کرنا جائز رکھا ہے، اسی بنا پر مارگولیوس نے یہ استدلال کیا ہے کہ چونکہ بہت دنوں تک مسلمانوں کے پاس معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ قبائل پر بے خبری میں حملہ کر کے مال و اسباب لوٹ لایا کرتے تھے۔

لیکن جب زیادہ تفحص اور استقرا۔ اور کد و کاوش سے تمام واقعات بہم پہنچائے جائیں تو ثابت ہوگا کہ ایک حملہ انہی قوموں پر کیا جاتا تھا جن کی نسبت یہ احتمال ہوتا تھا کہ ان کو خبر ہوگی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا کسی اور مقام پر بھاگ جائیں گے، چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ان لوگوں کو خبر ہوئی اور وہ کسی طرف چل دیئے۔ اس قسم کے چند واقعات

[1] فتح الباری ج ۸ صفحہ ۶۲ و ۱۱۰۔

ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں آپ خود تشریف لے گئے اور بعض میں کچھ دستے بھیج دیئے۔

غزوہ بنو سلیم ۳ھ (ابن سعد صفحہ ۲۴)

واغذّ السیر فوجدھم قد تفرقوا فی میاھھم فرجع۔

اور بہت تیزی سے یلغار گئے لیکن وہ لوگ اپنے چشموں کی طرف چل دیتے تھے (اس لئے لوٹ آئے)

غزوہ ذات الرقاع ۴ھ

وھربت الاعراب الی رؤس الجبال۔

اور اعراب پہاڑ کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔

سریہ عکاشہ ۶ھ

وجّہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عکاشۃ بن محصن الی الغمر فی اربعین رجلا فخرج سریعا یغذّ السیر فھربوا۔ (ص ۶۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عکاشہ بن محصن کو ۴۰ آدمیوں کے ساتھ بھیجا وہ یلغار گئے۔ لیکن وہ لوگ بھاگ گئے۔

سریہ علیؓ بن ابی طالب الی بنی سعد ۶ھ

فبعث الیھم علیّ ابن ابی طالب فی مائۃ رجل فسار اللیل وکمن النھار حتی انتھی الی الھمج فاغاروا علیھم فاخذ واخمس مائۃ بعیر والفی شاۃ وھربت بنو سعد بالظعن۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو سو آدمیوں کے ساتھ بھیجا وہ راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ رہتے تھے یہاں تک کہ مقام ہمج پہنچ گئے، پھر ان لوگوں پر حملہ کیا اور پانچ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں لوٹیں اور بنو سعد مستورات کو لے کر بھاگ گئے۔

غزوہ بنو لحیان ۶ھ

فسمعت بھم بنو لحیان فھربوا فی رؤس الجبال۔

بنو لحیان نے ان کی آمد کی خبر سنی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔

سریہ عمرؓ بن خطاب بطرف تُربہ ۷ھ

فکان یسیر اللیل ویکمن النھار فاتی الخبر ھوازن فھربوا وجاء عمر بن الخطاب محالھم فلم یلق منھم احدا۔

راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ جاتے تھے، ہوازن کو خبر لگ گئی تو وہ فرار ہو گئے، حضرت عمرؓ ان کے پڑاؤ پر پہنچے تو کسی کو نہ پایا۔

سریہ کعب بن عمیر، ربیع الاول ۸ھ اس سریہ کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ شخصوں کو شام کی طرف بھیجا، ذات اطلاح پہنچ کر ان لوگوں کو ایک بڑی جماعت نظر آئی۔ ان لوگوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی، انہوں نے انکار کر دیا اور ان پر تیر اندازی شروع کی۔ مجبور ہو کر یہ لوگ بھی لڑے اور بالآخر سب شہید ہوئے، صرف ایک صاحب بچے، انہوں نے آکر خبر کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے انتقام لینا چاہا، لیکن وہ لوگ یہ مقام چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ ابن سعد میں یہ الفاظ ہیں۔

وھمّ بالبعث الیھم فبلغہ انھم قد ساروا

ان پر فوج بھیجنے کا ارادہ کیا، پھر معلوم ہوا کہ وہ اور

الی موضع آخر۔ کہیں چلے گئے۔

اشاعت اسلام ان اغراض کے علاوہ اور جو سرایا بھیجے گئے ان کی غرض اشاعت اسلام ہوتی تھی لیکن چونکہ ملک میں امن و امان نہ تھا اور نیز دشمنوں نے اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا رکھی تھی، لیکن دعوت اسلام کے لئے جو سرایا جاتے تھے ان کی زندگی ہمیشہ معرض خطر میں رہتی تھی۔

سریہ بیر معونہ صفر ۴ھ میں ستر داعیان اسلام کی جماعت قبیلہ کلاب رئیس قبیلہ کی دعوت پر اشاعت اسلام کی غرض سے بھیجی گئی، لیکن بیر معونہ کے قریب قبائل رعل و ذکوان کے ہاتھ سے کل کی کل شہید ہوئی صرف ایک صاحب بچ گئے تھے جنھوں نے مدینہ آکر خبر کی۔

سریہ مرثد اسی زمانہ میں یعنی صفر ۴ھ میں قبیلہ عضل و قارہ نے تعلیم و ارشاد کے لئے دعاۃ اسلام کے بھیجنے کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عاصمؓ، حضرت خبیبؓ، حضرت مرثدؓ بن ابی مرثد وغیرہ دس صاحبوں کو اس غرض کے لئے روانہ فرمایا، مقام رجیع میں پہنچ کر بنو لحیان نے ان پر حملہ کیا اور ایک کے سوا کل صاحب شہید کر دیئے گئے۔ ۶ھ میں بنو لحیان کی تعزیر کے لئے مہم گئی، لیکن کامیابی نہ ہوتی، وہ سُن گُن پاکر بھاگ گئے تھے

سریہ ابن ابی العوجاء ۷ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داعیوں کی ایک جماعت جس میں پچاس آدمی شامل تھے، قبیلہ بنی سلیم کے پاس بھیجی، اس گروہ کے سردار ابن ابی العوجاءؓ تھے، انھوں نے بنو سلیم کو دعوت دی لیکن ان لوگوں نے انکار کیا اور تیر اندازی شروع کی، یہ لوگ بھی لڑے لیکن پچاس آدمی قبیلہ کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ رئیس فوج یعنی ابن ابی العوجاء کے سوا سب شہید ہوئے۔

سریہ کعب ابن عمیر ربیع الاول ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعبؓ بن عمیر غفاری کو پندرہ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ دعوت اسلام کے لئے ذات اطلاح کی طرف روانہ کیا، یہ مقام شام کے حدود میں وادی القریٰ سے اس طرف ہے۔ ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ کی لیکن جواب وہی تیغ و سنان تھا، یہاں تک کہ یہ جماعت بھی کل کی کل شہید ہوئی، صرف ایک صاحب بچ گئے جنھوں نے مدینہ میں آکر خبر کی۔

اس بنا پر اکثر دعوت اسلام کے لئے جو سرایا بھیجے جاتے تھے ان کے ساتھ حفاظت کی غرض سے کچھ فوج بھی ساتھ کر دی جاتی تھی لیکن اس صورت میں بتصریح افسروں کو کہہ دیا جاتا تھا کہ صرف اشاعت اسلام مقصود ہے، لڑائی بھڑائی کی اجازت نہیں، مثلاً فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ بن ولید کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا اور ۳۰۰ آدمیوں کی جمعیت، ساتھ کر دی تو صاف فرما دیا کہ صرف دعوت اسلام مقصود ہے، لڑائی مقصود نہیں چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں۔

بعثه الی بنی جذیمة داعیا الی الاسلام ولم یبعثه مقاتلا (ص۱۰۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا، دعوت اسلام کے لئے نہ لڑنے کے لئے۔

علامہ طبری اس موقع پر لکھتے ہیں۔

قد کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بعث فیما حول مکة السرایا تدعوا الی اللہ عز وجل ولم یامرھو بقتال۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اطراف میں سرایا بھیجے دعوت اسلام کے لئے اور ان کو لڑائی کا حکم نہیں دیا۔

باوجود اس کے بھی حضرت خالدؓ نے تلوار سے کام لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو آپ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رو ہو کر کہا "اے خدا! خالدؓ نے جو کچھ کیا میں اس سے بری ہوں" تین دفعہ اسی طرح یہ الفاظ فرمائے، پھر حضرت علیؓ کو بھیجا، جنھوں نے ایک ایک بچہ کا، یہاں تک کہ کتوں کا خون بہا ادا کیا اور اس پر مزید رقم دی[۱]۔ یہ واقعہ باختلاف الفاظ حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔

اسی طرح ۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو جب ۳۰۰ سواروں کے ساتھ یمن بھیجا تو آپ نے فرمایا۔

فاذا نزلت بساحتھم فلا تقاتلھم حتی یقاتلوک (ابن سعد مغازی ص۱۲۲)

جب تم وہاں پہنچ جاؤ تو جب تک تم پر کوئی حملہ نہ کرے تم نہ لڑنا۔

اسی سلسلہ میں وہ سرایا بھی داخل ہیں جو فتح مکہ کے بعد بُت شکنی کے لئے اطراف ملک میں روانہ کئے گئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام عرب میں مختلف قبیلوں کے الگ الگ بُت خانے تھے، فتح مکہ کے بعد جب عام طور سے قبائل نے اسلام قبول کر لیا تو بتوں کی عظمت اور جباری کا جاہلانہ اور وہم پرستانہ تخیل بعض قبائل سے دفعۃً نہ مٹ سکا۔ اب گو وہ ان کو لائق پرستش نہیں سمجھتے تھے تاہم ان کے دلوں پر ان اصنام کی وراثۃً ایک مدت سے جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی اس سے یہ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان باطل پرستیوں کے مرکز کو خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیں جاہلوں کو یقین تھا کہ ان مقدس پتھروں کا ایک ریزہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین پھٹ جائے گی، مصائب اور بلاؤں کا ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔

اہل طائف نے بیعت کرتے ہوئے شرط پیش کی تھی کہ ان کا بُت خانہ ایک سال تک ڈھایا نہ جائے گا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور نہ فرمایا تو دوسری شرط پیش کی کہ ہم ان کو اپنے ہاتھ سے نہ توڑیں گے، بعض اور نو مسلم قبائل بھی اس ادائے فرض میں جھجکتے تھے۔ اس بنا پر ان مقامات میں چند راسخ العقیدہ اور صحیح العزم مسلمان بھیجے گئے کہ وہ ان کی طرف سے اس فرض کو انجام دیں، چنانچہ سریۂ خالدؓ ابن ولید بُت خانہ عزیٰ، سریہ عمروؓ بن العاص بُت خانہ سواع، سریۂ سعد بن زید اشہلی بت خانہ مناۃ، سریۂ ابو سفیان و مغیرہ بن شعبہ بُت خانہ لات، سریۂ جریر بُت خانہ ذی الخلصہ[۲]، سریۂ طفیل بن عمرو دوسی بُت خانہ ذی الکفین اور سریۂ علی بن ابی طالب بُت خانہ فلس کے توڑنے کو روانہ کئے گئے[۳]۔

جنگی اصلاحات جنگ افعال انسانی کا بدترین منظر ہے، عرب کی جنگ تو ظلم و توحش، قساوت، سفاکی، بے دردی اور درندہ پن کا تماشا گاہ تھی، لیکن اعجاز نبوت سے یہی چیز تمام نقائص سے پاک ہو کر ایک مقدس فرض انسانی بن گئی، کسی ملک میں جب ہزاروں برس سے ظلم و غارت گری متوارث چلی آتی ہے تو

[۱] تاریخ طبری صفحہ ۱۶۵۱ (ج ۳)۔ [۲] صحیح بخاری غزوہ ذی الخلصہ۔ [۳] اس باب میں تمام تر واقعات ابن سعد جزء مغازی سے ماخوذ ہیں۔

شروع شروع میں مہذب سے مہذب حکومت کو بھی چند روز قدیم اصول اور طرزِ عمل کو اختیار کرنا پڑتا ہے جس کو طبی اصطلاح میں علاج بالمثل کہہ سکتے ہیں، آغازِ اسلام میں حملہ آور جنگ کے وقت بعض واقعات اس قسم کے ملتے ہیں جو پہلے سے رائج تھے۔ مثلاً جاہلیت میں دستور تھا کہ دشمن پر بے خبری کی حالت میں جا پڑتے تھے اور قتل و قید کرتے تھے۔ اسلام نے اس طریقہ کو مٹایا۔ لیکن ابتداء ہی میں اگر اس پر عمل کیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ دشمن ہمیشہ دفعۃً حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو قتل کیا کرتے اور مسلمان اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکتے، یا کرتے تو پہلے ان کو خبر کرتے، جس کے بعد وہ کہیں ٹل جاتے۔ یا اپنی حفاظت کا سامان کر لیتے۔ لیکن جس قدر اسلام کو زور و قوت حاصل ہوتی گئی اسی قدر وہ قدیم طریقے مٹتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب کا خاتمہ ہو گیا۔ اسلام سے پہلے جنگ کا جو طریقہ تھا اور جس قسم کے وحشیانہ افعال عمل میں آتے تھے ان کو ہم تفصیل سے اوپر لکھ آئے ہیں، ان صفحات کو دوباہ سامنے رکھ لو اور اس کے مقابلہ میں دیکھو اسلام نے کیا کیا اصلاحیں کیں؛ اس بات کو قطعاً روک دیا کہ عورتیں، بوڑھے، بچے، صغیر السن، نوکر، خادم لڑائیوں میں قتل کیے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی مہم پر فوج بھیجی جاتی تو سردارِ فوج کو جو احکام دیئے جاتے ان میں ایک یہ لازمی حکم بھی ہوتا۔[1] ابوداؤد میں یہ حکم ان الفاظ میں مذکور ہے۔

ولا تقتلوا شیخاً فانیاً ولا طفلاً ولا صغیراً ولا امرأۃ۔ کسی کہن سال کو بچہ کو، کمسن کو، عورت کو قتل نہ کرو۔

غزوات میں بھی کسی عورت کی لاش آپؐ کی نظر سے گزرتی تو آپؐ نہایت سختی سے منع فرماتے۔ صحیح مسلم میں متعدد حدیثیں اس کے متعلق مذکور ہیں۔

اسلام سے پہلے معمول تھا کہ دشمن کو گرفتار کر لیتے تو کسی چیز سے باندھ کر اس کو تیروں کا نشانہ بناتے یا تلوار سے قتل کرتے، عربی میں اس طریقہ کو صبر کہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے اس کو روک دیا۔ ایک دفعہ حضرت خالدؓ کے صاحبزادے (عبدالرحمٰن) نے ایک لڑائی میں چند آدمیوں کو گرفتار کر کے اسی طرح قتل کرایا تھا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے سنا تو کہا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا وہ اس سے منع فرماتے تھے۔ خدا کی قسم! میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا۔ عبدالرحمٰن نے اسی وقت کفارۂ گناہ کے طور پر چار غلام آزاد کیے۔[2]

لڑائیوں میں عہد کی کچھ پابندی نہ تھی۔ جنگِ معونہ وغیرہ میں کفار نے مسلمانوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا یعنی قول و قسم لے کر مسلمانوں کو ساتھ لوا گئے اور گھیرے جا کر قتل کر ڈالا۔ قرآنِ مجید میں انہی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً اِنَّهُمْ لَآ اَیْمَانَ لَهُمْ (توبہ - ۲) کسی مسلمان کے متعلق وہ نہ قسم کا لحاظ رکھتے ہیں نہ ذمہ داری کا، ان کی قسم، قسم نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت تاکید کی کہ جو عہد کیا جائے ہر حال میں اس کی پابندی کی جائے۔ قرآن مجید

[1] صحیح مسلم باب الجہاد [2] کتاب الجہاد فی باب فی دعاء المشرکین، ابوداؤد میں یہ باب کتاب الجہاد میں مکرر ہے یہاں پہلا باب مراد ہے۔

[3] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۱ (باب قتل الاسیر بالنبل) ۔ ؔ۹۔

میں اس کے متعلق جابجا تاکیدی اور صاف احکام ہیں، عہدِ نبوت اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں پابندی عہد کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے تو بہت سے صحابہ مجبوریوں کی وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے، ان میں حضرت حذیفہؓ بن یمان اور ان کے والد بھی تھے۔ جنگ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہؓ بن یمان اور ان کے والد کہیں سے آ رہے تھے، کفار نے ان کو پکڑ لیا کہ تم مدینہ جا کر پھر ہمارے مقابلہ کو آؤ گے۔ انہوں نے کہا ہمارا مقصد صرف مدینہ جانا ہے۔ کفار نے ان سے عہد لے کر چھوڑ دیا۔ یہ لوگ مقامِ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور یہ دیکھ کر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے مصروفِ جنگ ہیں، خود بھی اس سعادت کی آرزو کی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو باز رکھا کہ تم معاہدہ کر چکے ہو۔

ابورافع کو قریش نے قاصد بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ بارگاہِ نبوت میں آ کر ان پر یہ اثر ہوا کہ مسلمان ہو گئے اور عرض کی اب میں کافروں میں واپس نہ جاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا تم قاصد ہو اور قاصد کو روک لینا عہد کے خلاف ہے۔ اس وقت واپس جاؤ پھر آ جانا۔[1]

صلح حدیبیہ میں جب حضرت ابوجندلؓ پابہ زنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے کہ قریش مجھ کو قید کر کے اس طرح ستاتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہاں! لیکن قریش سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ آئے گا تو ہم قریش کے پاس بھیج دیں گے۔ اس پر حضرت ابوجندلؓ نے رو کر تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ لوگ جوشِ رقت سے بیقرار ہو گئے اور قریب تھا کہ قابو سے باہر ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ بے تاب ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بار بار جاتے تھے، یہ سب کچھ تھا لیکن پابندیٔ عہد کی قیمت ان سب خطرات سے زیادہ تھی، حضرت ابوجندلؓ کو پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

اسلام سے پہلے قاصدوں کا قتل کر دینا ممنوع نہ تھا، صلح حدیبیہ سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے پاس جو قاصد بھیجا تھا، قریش نے اس کی سواری کے اونٹ کو مار ڈالا اور قاصد کو بھی قتل کر دینا چاہا! لیکن باہر والوں نے بچا لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قاصد کبھی قتل نہ کیے جائیں، مسیلمہ نے جب قاصد بھیجا اور اس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپؐ نے فرمایا کہ قاصد کا قتل کرنا دستور نہیں ورنہ تو قتل کر دیا جاتا؛ مؤرخین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس دن سے یہ ایک قاعدہ بن گیا کہ قاصد قتل نہیں کیے جاتے تھے۔

ایسرانِ جنگ کے ساتھ عرب نہایت بُرا سلوک کرتے تھے اور تمام قوموں میں بھی یہی طریقہ جاری تھا۔ جنگ صلیبی میں یورپین سلطنتیں جب مسلمانوں کو لڑائیوں میں گرفتار کرتی تھیں تو ان سے جانوروں کی طرح کام لیتی تھیں علامہ ابن جبیر جب حروبِ صلیبیہ کے زمانے میں سسلی سے گزرے ہیں تو یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئے چنانچہ لکھتے ہیں،

[1] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۳ (باب فی الامام یستجن بہ فی العہود) ۔ ؔ۲۔

ومن العجائب التی یعانیھا من حلّ بلادھو اسری المسلمین یرمضون فی القیود و یصرفون فی الخدمة الشاقة و اسیرات المسلمات کذلک فی اسوقھن خلاخل الحدید فتنفطر لھو الاوفئدة۔

اور منجملہ ان دردانگیز حالات کے جو ان شہروں میں نظر آتے ہیں اسیرانِ اسلام ہیں جو بیڑیاں پہنے نظر آتے ہیں اور جن سے سخت محنت شاقہ لی جاتی ہے اور اسی طرح مسلمان عورتیں پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے پہنے سخت محنت شاقہ سے کام کرتی ہیں جن کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیرانِ جنگ کی نسبت تاکید کی کہ اُن کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ اسیرانِ بدر کو جب آپ نے صحابہ کے حوالے کیا تو تاکید کی کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ صحابہ خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کرتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ غزوۂ حنین میں چھ ہزار اسیر تھے سب چھوڑ دیئے گئے اور آپ نے ان کے پہننے کے لئے چھ ہزار جوڑے (مصر کے کپڑے کے) عنایت فرماتے۔ چنانچہ ابن سعد نے اس واقعہ کی تصریح کی ہے۔

حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہو کر آئی تو آپ نے عزت و حرمت سے مسجد کے ایک گوشہ میں اس کو مقیم کیا اور فرمایا کہ کوئی تمہارے شہر کا آجائے تو میں اس کے ساتھ تم کو رخصت کر دوں۔ چنانچہ چند روز کے بعد سفر کا سامان کر کے ایک شخص کے ساتھ یمن بھجوا دیا۔

قرآن مجید میں جہاں خدا نے بندگانِ خاص کے اوصاف بتائے ہیں وہاں فرمایا ہے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا۔ (دہر-۱)

اور یہ لوگ خدا کی محبت میں مسکین کو، یتیم کو اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

معمول تھا کہ جب کسی قوم پر حملہ ہوتا تو اہلِ فوج چاروں طرف دُور دُور پھیل جاتے جس سے راستے بند ہو جاتے گھروں میں آنا جانا مشکل ہو جاتا۔ راہگیروں کا مال و متاع لٹ جاتا۔ یہ طریقہ ایک مدت سے چلا آتا تھا۔ ایک لڑائی میں قدیم دستور کے مطابق یہی حرکتیں لوگوں سے سرزد ہوئیں۔ آپ نے منادی کرا دی کہ جو شخص ایسا کرے گا اس کا جہاد، جہاد نہیں۔

ابوداؤد میں (حضرت معاذؓ بن انس) سے روایت ہے۔

غزوت مع نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوة کذا وکذا فضیّق الناس المنازل وقطعوا الطریق فبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم منادیاً ینادی فی الناس انّ من ضیّق منزلاً وقطع طریقاً فلا جہاد لہٗ۔

میں فلاں غزوہ میں آپ کے ساتھ تھا، لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جا کر ان کو تنگ کیا، لوٹا مارا، آپ نے ایک شخص کو بھیجا جس نے منادی کی کہ جو دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے اس کا جہاد قبول نہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ حکم دیا کہ لوگ ادھر اُدھر پھیل نہ جایا کریں تو لوگ اس

---

[1] رحلہ ابن جبیر طبع ۱۹۰۷ء ص ۳۰۷۔ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد جلد اول صفحہ ۳۵۴ (باب ما یؤمر من انضمام العسکر) ت۔

طرح سمٹ کر پڑاؤ ڈالتے تھے کہ ایک چادر تان دی جاتی تو سب اس کے نیچے آجاتے۔

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مالِ غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بہت بڑا سبب یہی ہوتا تھا۔ اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا۔ جاہلیت میں تو غنیمت محبوب ترین چیز تھی تعجب یہ ہے کہ اسلام میں بھی ایک مدت تک اس کو ثواب کی چیز سمجھتے تھے۔ ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

یرید الجہاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی عرضاً من عرض الدنیا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا اجر لہ فاعظم ذلک الناس وقالوا للرجل عد لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلعلک لم تفھمہ (ابوداؤد جلد اص ۳۴۲ (باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا) ت)

ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے آپ نے فرمایا اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا، یہ امر لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوا اور لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ پھر جا کر پوچھ غالباً تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب نہیں سمجھا۔

بار بار لوگ دوبارہ دریافت کرنے کے لئے بھیجتے تھے اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہو گا۔ بالآخر جب آپ نے تیسری دفعہ بھی یہی کہا کہ لا اجر لہ یعنی اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا تب لوگوں کو یقین لایا۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کو ایک قبیلہ کے مقابلہ کے لئے بھیجا، ان میں سے ایک صاحب صف سے آگے نکل گئے۔ قبیلہ والے روتے ہوئے آئے انھوں نے کہا لا الٰہ الا اللہ کہو تو بچ جاؤ گے۔ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور حملہ سے بچ گئے۔ اس پر ساتھیوں نے ان کو ملامت کی کہ تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا۔ ابوداؤد میں صحابی کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے۔

فلامنی اصحابی وقالوا احرمتنا الغنیمة۔ (ابوداؤد (باب ما یقول اذا اصبح کتاب الادب)

مجھ کو میرے ساتھیوں نے ملامت کی، تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا۔

جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر ان کی شکایت کی تو آپ نے ان کی تحسین کی اور فرمایا کہ تم کو ایک ایک آدمی (جو چھوڑ دیئے گئے) کے بدلے اتنا اتنا ثواب ملے گا (ابوداؤد)۔

قرآن مجید میں غنیمت کی نسبت "متاع دنیوی" کا لفظ آتا تھا اور اس کی طرف انہماک اور وارفتگی پر ملامت کی جاتی تھی۔ جنگِ اُحد میں جب اس بنا پر شکست ہوئی کہ کچھ لوگ کفار کا مقابلہ چھوڑ کر غنیمت میں مصروف ہو گئے تو یہ آیت اتری۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (آل عمران-۱۶)

تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلب گار تھے اور کچھ آخرت کے۔

جنگ بدر میں لوگوں نے جب اجازت سے پہلے غنیمت لوٹنی شروع کر دی (یا) بقول بعض مفسرین فدیہ کی خواہش سے لوگوں کو گرفتار کیا تو یہ آیت اتری۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد (باب ما یؤمر من انضمام العسکر) ت۔

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيدُ الْاٰخِرَةَ (انفال-۹) تم لوگ دنیا کی پونجی چاہتے ہو اور خدا آخرت چاہتا ہے۔

باوجود ان تمام تصریحات اور بار بار کی تاکید کے غزوۂ حنین میں جو ۸ھ میں واقع ہوا تھا اس وجہ سے شکست ہوئی کہ لوگ غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہوگئے، صحیح بخاری غزوہ حنین کے ذکر میں ہے۔

فاقبل المسلمون علی الغنائم واستقبلونا بالسهام۔ تو مسلمان غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور کافروں نے ہم کو تیروں پر رکھ لیا۔

اس بنا پر موقع بموقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلہ کو زیادہ تصریح سے بیان فرماتے تھے، ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کے لئے، کوئی اظہار شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے، کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا۔ جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔[1]

بالآخر آپ نے یہ فرما دیا کہ گو جہاد کسی نیت سے کیا جائے لیکن اگر مجاہد مال غنیمت قبول کرتا ہے تو دو تہائی ثواب کم ہو جاتا ہے، پورا ثواب اسی وقت ملتا ہے جب غنیمت کو مطلق ہاتھ نہ لگائے، صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

ما من غازية تغزو فی سبیل الله فیصیبون الغنیمة الا تعجلوا ثلثی اجرهم من الاخرة ویبقی لهم الثلث وان لم یصیبوا غنیمة تم لهم اجرهم۔[2]

جو غازی خدا کی راہ میں لڑتا ہے اور مال غنیمت لیتا ہے وہ آخرت کے ثواب کا دو ثلث یہیں لے لیتا ہے اور آخرت میں اس کا حصہ صرف ایک تہائی رہ جاتا ہے البتہ اگر غنیمت مطلق نہ لے تو اس کو آخرت میں پورا اجر ملے گا۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ غنیمت جو سب سے محبوب چیز تھی دلوں سے اتر گئی اور جہاد سے صرف اعلائے کلمۃ اللہ مقصود رہ گیا، واقعہ ذیل سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت واثلہ بن الاسقع ایک صحابی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک کی مہم پر روانہ ہوئے تو ان کے پاس سامان نہ تھا، مدینہ میں آواز دیتے پھرے کہ کوئی ہے جو ایسے شخص کو سواری دے کہ جو کچھ مال غنیمت ہاتھ آئے گا اس میں وہ برابر کا شریک ہوگا" ایک انصاری نے سواری اور خوراک سب اپنے ذمہ لی، اس مہم میں کئی اونٹ ہاتھ آئے، حضرت واثلہ واپس آکر انصاری کے پاس سب اونٹ لے گئے اور کہا، یہ وہ اونٹ ہیں جن کی نسبت میں نے شرط کی تھی کہ آپ بھی اس میں حصہ دار ہوں گے، انہوں نے کہا "ان کو تم ہی لو میرا شرکت سے کچھ اور ارادہ تھا" یعنی اونٹ میں نہیں بلکہ جہاد کے ثواب میں شرکت مقصود تھی۔[3]

دوران جنگ میں دشمن کے مال اور جائیداد کا لوٹنا بھی عام رواج تھا خصوصاً جب کہ رسد ختم ہو جاتی تھی اور کھانے پینے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا تو ہر حال میں یہ فعل جائز سمجھا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت کی

[1] بخاری کتاب الجهاد باب من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا و صحیح مسلم کتاب الامارة ص ۱۳۹ [2] صحیح مسلم کتاب الامارہ باب بیان ثواب من غزا فغنم و ابوداؤد باب فی السریة ص ۳ [3] ابوداؤد کتاب الجهاد جلد ثانی باب الرجل یکری دابته علی النصف او السهم ص ۳

اور سرے سے اس طریقہ کو روک دیا، ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے اور غایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی، اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، آپ موقع پر تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا اور ہانڈیاں ابال کھا رہی تھیں، آپ کے ہاتھ میں کمان تھی آپ نے اس سے ہانڈیاں الٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا "لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے"۔[1]

لڑائی عبادت بن گئی

اسلام نے جہاد کو جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے اس قدر پاک اور منزہ کر دیا کہ وہ افضل ترین عبادت بن گئی، جہاد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مظلوموں کو ظلم سے بچائے، جابر اور ظالم لوگ آدمیوں پر دست ستم دراز نہ کرنے پائیں۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (حج-۶)

جن لوگوں سے لوگ لڑائی کرتے ہیں ان کو اس بنا پر لڑنے کی اجازت دی گئی کہ ان پر ظلم کیا گیا اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے وہ لوگ جو اپنے گھروں سے صرف اس بنا پر نکال دیئے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب خدا ہے۔

ملک میں جو ہمیشہ فتنہ و فساد برپا رہتا تھا اور لوگ امن و امان سے بسر نہیں کر سکتے تھے، جہاد اس غرض سے تھا کہ فساد کو مٹا دے اور امن قائم کردے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (انفال-۵) اور ان سے لڑو تاکہ فتنہ نہ رہے۔

جو لوگ خدا پر اور جزا و سزا پر اعتقاد نہیں رکھتے اور اس وجہ سے ان کے نزدیک ہر قسم کے ظلم و ستم جائز تھے اور ان کو جائز و ناجائز کی کچھ تمیز نہ تھی جہاد سے ان کا زیر کرنا اور ان لوگوں کو ان کے ظلم سے بچانا مقصود قرار دیا گیا۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (توبہ-۴)

ان لوگوں سے لڑو جو نہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں نہ قیامت پر اور جن کاموں کو خدا اور رسول نے حرام قرار دیا ہے اس کو حرام نہیں سمجھتے

جہاد میں فتح پانے اور زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مقصد یہ نہیں قرار دیا گیا کہ فاتح مال و دولت اور حکومت کا لطف اٹھائیں بلکہ یہ غرض قرار دی گئی کہ لوگوں کو عبادت و ریاضت اور فقراء کی دستگیری کی تلقین کریں اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برے کاموں سے لوگوں کو روک دیں۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج-۶)

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دیں تو وہ نماز کے پابند ہوں گے، زکوۃ ادا کریں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

کسی ملک کی فتح سے جو مال و دولت ہاتھ آتا تھا وہ فاتح کا خاص حصہ ہوتا تھا جس کو وہ اپنے مصارف عیش میں

[1] ابوداؤد کتاب الجهاد جلد ثانی باب فی النهی عن النهبی اذا کان فی الطعام قلة ص ۱۳

استعمال کرتا تھا اور دربار کے امرا درجہ بدرجہ اس سے مستفید ہوتے تھے لیکن اس کا مصرف یہ قرار دیا۔

وَاعْلَمُوا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔ انفال - ۵	اور جان لو کہ تم کو جو کچھ مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ[1] خدا کا ہے اور رسول کا اور رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا۔

جہاد نہ صرف حقیقت کے لحاظ سے بلکہ صورۃً بھی عبادت بنا دیا گیا، مجاہدین کو تاکید تھی کہ عین جنگ کے وقت بھی خدا کا نام لیتے رہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (انفال - ۶)	مسلمانو! جب کسی گروہ سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ تم کامیاب ہوگے۔

نماز میں جس طرح اٹھتے بیٹھتے تکبیر و تسبیح یعنی اللہ اکبر اور سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہیں جہاد میں بھی یہی حکم تھا، حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم جب کسی بلندی پر چڑھتے تھے تو اللہ اکبر کہتے تھے اور جب نیچے اترتے تو سبحان اللہ کہتے تھے،[2] بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تھے تو تین دفعہ اللہ اکبر کہتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد پر جا رہے تھے، صحابہ زور زور سے تہلیل و تکبیر کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس قدر شور سے نہیں کہنا چاہیے کیونکہ خدا جس کو تم پکارتے ہو وہ بہرہ نہیں ہے۔ بعینہٖ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو نماز میں پکار کر قرآن پڑھنے سے منع فرمایا تھا۔

نکتہ:- ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جہاد میں دستور تھا کہ چڑھائیاں آتی تھیں تو تکبیر کہتے تھے اور اتار آتا تھا تو تسبیح پڑھتے تھے، نماز بھی اسی اصول پر قائم کی گئی یعنی سر اٹھاتے ہیں تو اللہ اکبر اور سجدہ میں جاتے ہیں تو سبحان اللہ کہتے ہیں،[3] اس روایت میں ادائے مطلب میں ذرا فرق آگیا ہے، جہاد کے اصول پر نماز نہیں قائم کی گئی بلکہ جہاد میں نماز کا طریقہ ملحوظ رکھا گیا ہے، کیونکہ بظاہر ہے کہ نماز ابتدائے اسلام سے وجود میں آئی اور جہاد کی تاریخ ہجرت کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ بہرحال اس روایت سے اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ نماز اور جہاد دونوں میں ایسی مشابہت تھی کہ ایک کو اصل اور دوسرے کو اس کی نقل سمجھتے تھے۔

غرض وہی جنگ جو ہر طرح کے ظلم و ستم اور جہالت و وحشت کا مجموعہ تھی، اسلام کی تعلیم ربانی نے اس کو اعلائے کلمۃ اللہ، قیام امن، رفع مفاسد، نصرت مظلوم اور تسبیح و تہلیل کی صورت میں بدل دیا۔

فاتح اور پیغمبر کا امتیاز

جہاد کے معرکوں میں آپ کے ہاتھ میں گو تیغ و سپر اور جسم مبارک پر خود و مغفر ہوتا تھا لیکن اس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا تھا، عین اس وقت جب کہ معرکہ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے

[1] اس پانچویں حصہ کے سوا باقی تمام مال غنیمت مجاہدین کا حق ہے [2] کتاب الجہاد باب التکبیر عند الحرب [3] ابوداؤد کتاب الجہاد در باب مایقول اذا سافر، جلد ا صـ ۲۵۴ مطبوعہ مجتبائی، اصل عبارت یہ ہے و کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم و جیوشہ اذا علوا الثنایا کبروا واذا ہبطوا سبحوا فوضعت الصلوۃ علی ذلک۔

ہیں جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں، دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھتی آرہی ہیں، عین اس حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے، جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سر مبارک سجدۂ نیاز میں ہے معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ عین شدتِ جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا، فاتح بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھا لیتا ہے اور دشمن کی طرف پھینکتا ہے۔ دفعۃً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے۔

حنین میں دشمن نے دفعۃً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ۱۲۰۰۰ ہزار آدمیوں میں سے ایک بھی پہلو میں نہیں، سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیر برساتے آرہے ہیں، لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پُر جلال آواز آرہی ہے۔

انا النبی لا کذب۔	میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں۔

عین اس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آرہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آجاتا ہے۔ دفعۃً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار امام نماز ہے، فوجیں صفوفِ نماز میں رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں، جوش و خروش، تہور و جانبازی، غیظ و غضب اب عجز و نیاز، تضرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے، صفیں دو دو رکعتیں ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں۔ ان کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہو جاتے ہیں، یہ دو رکعتیں ادا کر کے پھر اپنی پہلی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں اور مشغولین جنگ آکر بقیہ نمازیں پوری کر لیتے ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں، امام (رسولؐ) اول سے آخر تک عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے۔

تعلیم و ارشاد، ہدایت و تلقین، تہذیب و تزکیہ کا کام ہر وقت جاری ہے، عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشہ میں چور ہیں، مالِ غنیمت فروخت ہو رہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہو رہی ہیں، ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں اور جوشِ مسرت میں کہتے ہیں، یا رسول اللہ! آج میں نے مال غنیمت سے جس قدر نفع اٹھایا کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ پورے تین سو اوقیہ ہاتھ آئے (اوقیہ دس روپیہ کے برابر ہوتا ہے) آپ فرماتے ہیں کہ میں اس سے بھی زیادہ نفع بتاؤں؟ وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں کیا؟ ارشاد ہوتا ہے نماز فرض کے بعد دو رکعتیں۔

تَمَّ الْمُجَلَّدُ الْاَوَّلُ مِنَ السِّیْرَۃِ النَّبَوِیَّۃِ عَلٰی صَاحِبِهَا الصَّلٰوۃُ وَالتَّحِیَّۃُ

[1] (چند خاص) [2] ابوداؤد، باب التجارۃ فی الغزو۔